ایک تھی ملکہ
نیلم احمد بشیر

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
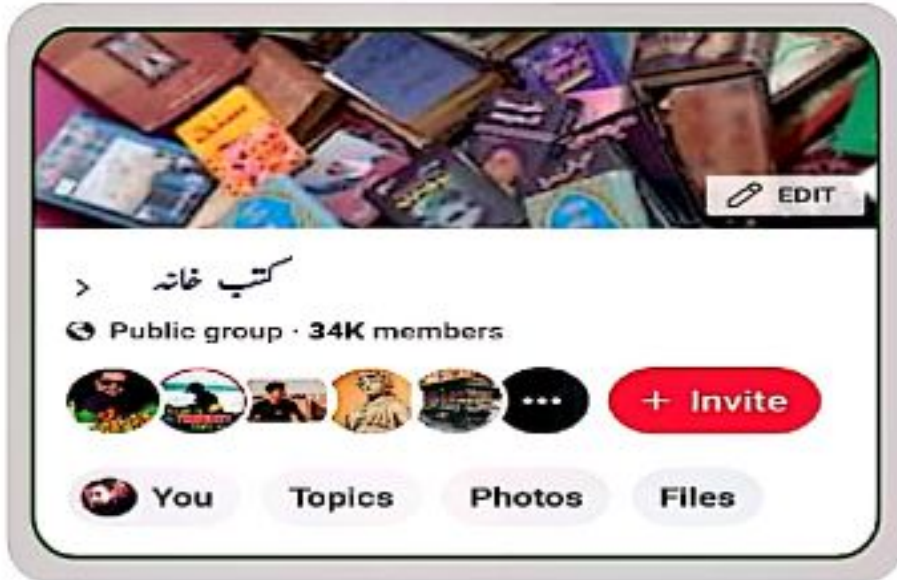
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

ایک تھی ملکہ

افسانے

نیلم احمد بشیر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Neelam Ahmad Basheer
Aik Thi Malika/ Neelam Ahmad
Basheer.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2008.
240pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2008
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی

ISBN-10: 969-35-2161-7
ISBN-13: 978-969-35-2161-0

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اپنی پیاری بہنوں

سنبل، بشریٰ، قلزم

سہیلیوں، بانیہ بیلیوں کے نام

فہرست

پردہ اٹھتا ہے

ان دنوں میں اپنی بیٹی عنبر کے پاس امریکہ کی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ ورجینیا وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کار کی نمبر پلیٹوں پر لکھا ہوتا تھا'' ورجینیا از فار لورز'' اب میں نے حالیہ سالوں میں نمبر پلیٹوں پہ ایسا کچھ لکھا نہیں دیکھا، شاید اس لیے کہ امریکہ کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ایسے رومانوی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پہ کرنا مناسب ہی نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو ''فن اینڈ گیمز'' کی جگہ دہشت گردی، جنگوں، ڈیزی کٹر حملوں اور مسلم Millitants جیسے عوامل سے جو نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔ ورجینیا چونکہ امریکہ کے کیپٹل شہر واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ہوئی ریاست ہے اس لیے اس پر جمال، پروقار صاف ستھرے شہر کا سنجیدہ کلچر اس پہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔ پرشکوہ عمارات، کشادہ سبز باغات، ٹریفک کے منظم بہاؤ والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے حاکم دنیا، کم تر ملکوں کے لیے بدصورت فیصلے صادر کرتے ہیں۔

میری بیٹی عنبر یہاں کے ٹاؤن کرسٹل سٹی کی ایک یونیورسٹی میں ایڈمنسٹریشن جاب کرتی ہے۔ اسے اکثر اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں اس کی تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ کر دیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست کھانا کھلایا۔ وہ ہمیشہ ہی مجھ پر دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے۔ شام کو جب کام سے واپس آتی ہے تو ہم دونوں ماں بیٹی چہل قدمی کے لیے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی

شانوں والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ و جلال کو دیکھ کر ہمیشہ سوچتی ہوں کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے، کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنا ایمان بنایا ہوتا تو آج یوں اپنا دیس چھوڑ کر پردیسوں میں بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوتے۔

پچھلے کچھ دنوں سے شہر ڈی سی میں انڈین فلم سٹارز کے ایک انٹرٹینمنٹ شو کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پہ اشتہار چل رہے تھے، انٹرنیٹ پہ ٹکٹ بک رہے تھے اور ہر طرف پروموشن پوسٹرز لگے دکھائی دے رہے تھے۔ 4 ستمبر کو "Temptation 2004" کے نام سے کیا جانے والا یہ شو کافی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ ''کیوں نہ ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں؟'' عنبر نے مجھ سے کہا اور سو سو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بہت خوش تھی۔ میں نے بہت سال پہلے امریکہ میں اسی قسم کا امیتابھ بچن شو دیکھ رکھا تھا کہ تب امیتابھ کا دور تھا وہ جوان تھا اور ہم نوجوان، لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم کا کوئی انڈین شو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لہٰذا میں نے بھی یہ سوچ کر خوشی خوشی حامی بھر لی کہ ''اچھا ہے چلتے چلتے ہیں مزا رہے گا۔'' ہم واشنگٹن ڈی سی کے بڑے سے سٹیڈیم نما ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔

اب کوئی مانے یا نہ مانے انڈین فلمیں ہم سب کی زندگی کا اہم حصہ بن چکی ہیں اور ہر گھر میں ذوق شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ انڈیا، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ، امریکہ۔ جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں انڈین فلمیں تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں اور یہی حقیقت ہے اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اپنی زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں انڈین فلموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ آج انڈین فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں چلتی ہیں۔ ہالی وڈ کے ہم پلہ بالی وڈ سینما نے بھی دنیا بھر میں اپنے مداحین پیدا کر لئے ہیں اور اسی لیے ان کے فلم سٹارز کے شو اتنی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس شو کے مین فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زنٹا، رانی مکر جی، پریانکا چوپڑہ کے نام تھے مگر سب سے زیادہ جس نام کے لیے لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے وہ تھا سپر سٹار اداکار شاہ رخ خان سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے جانے والے شاہ رخ آج اپنے مداحوں کے لیے نمبر ون کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی اداکاری، شخصیت

اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے کے لئے گھر سے نکل پڑے، عنبر کا خیال تھا کہ پارکنگ کے مسئلہ کی وجہ سے ہم لوگ لوکل ٹرین سے سفر کریں تو بہتر ہوگا۔ یہی سوچ کر ہم ٹرین سٹیشن کی طرف چل دیئے، نیویارک شہر کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور سٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ سٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ میں بنے جیومیٹریکل ڈیزائن کو سراہتے ہوئے ہم کچھ ہی دیر میں ٹرین میں جا سوار ہوئے جس نے ہمیں ایم سی آئی سنٹر کے بالکل قریب ہی اتار دیا۔

چند منٹوں کی واک کے بعد ہم لوگ بڑے سے اس سنٹر کے پاس پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کی کنسرٹس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑک پہ ہم جیسے لوگوں کا جنہیں امریکہ میں ''دیسی'' کہا جاتا ہے ایک ہجوم تھا جو شو کے لیے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے بوڑھے، بچے، فیشن ایبل لڑکے، لڑکیاں سبھی کے چہرے شو کے خیال سے دمک رہے تھے۔ کوئی کسی کو ہیلو ہائے کہہ کر گلے مل رہا تھا تو کوئی موبائل فون پہ کسی آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا کہ امریکہ میں کہیں بھی آنا جانا ہو ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگ شلوار قمیض، ساڑھیاں، چینٹ شرٹس، کڑھائی والے کرتے، پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آ رہے تھے اور خاموش امریکی سنڈے، جاندار، دیسی اتوار میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ہم تینوں ابھی عمارت کے اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ یک دم ہماری نظر دو خواتین پر پڑی جو ہال میں جانے کے لیے اسی طرف آ رہی تھیں، دونوں پاکستانی سی لگ رہی تھیں۔ ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا جو لڑکھڑا کر رک رک کر چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں فرح لپک کر ان کی طرف بڑھی، سلام کرنے کے بعد کہنے لگی'' باجی یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں'' مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا سہانہ بالٹی مور والی؟ اور یہاں؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آ گئی تھی؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟

''کیا! سہانہ یہاں آئی ہے؟'' مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ فرح کے شہر بالٹی مور کی رہنے والی تھی جس کے بارے میں فرح دکھ سے بتایا کرتی تھی کہ وہ کینسر کی آخری سٹیج پر پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضاء کاٹ ڈالے تھے مگر کینسر اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا اور سارے جسم میں پھیل چکا تھا اس کا علاج بالٹی

موڑ کے چوٹی کے ہسپتالوں میں ہورہا تھا مگر ڈاکٹرز بے بس ہو چکے تھے اور اب انہوں نے اسے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ ایک مرحلے پہ انہوں نے اس کے کیس کو کینسر سنڈی کے لیے ریسرچ کالج میں بھی بھیجنا چاہا مگر سہانہ اور اس کا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ سہانہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ چار چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ ناامید نہیں تھی۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا "شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں، شاید انہیں ایک بچوں کی ماں پہ رحم آ جائے۔" وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی لہٰذا ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں ہی کیا کرتی تھی۔ فرح بتاتی تھی کہ سہانہ کس قدر زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ لڑکی تھی اسے اچانک ہی اپنے مرض کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ اب زندگی کے دیئے کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ عمر کی نقدی ختم ہو رہی تھی مگر حسرتیں تھیں کہ ایسی کہ ان کا انبار لگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ مشکل سے سانس لیتی تھی مگر پھر بھی گھر میں بچوں کے لیے کھانا بناتی، لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی، جتنے دن اپنے بچوں کے کام آ جاؤں اچھا ہے۔

اپنی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے اس میں وطن واپس جا کر ماں باپ، بہن بھائیوں کو بھی آخری بار ملنے کی شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی لیکن وہ پاکستان نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اس کے گرین کارڈ کا مسئلہ ابھی التوا میں پڑا ہوا تھا، اگر وہ چلی جاتی تو واپس نہ آ سکتی تھی اور واپس وہ ضرور آنا چاہتی تھی اور اپنی زندگی کی باقی ماندہ پونجی اپنے بچوں اور شوہر پہ نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ گھر بار امریکہ میں تھا اور دوسری طرف اس کے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے، وہ ہر قیمت پہ اس سے ملنا چاہتے تھے مگر سر پٹخ رہے تھے کیونکہ امریکن قونصلیٹ سے انہیں ویزا جاری نہیں ہو رہا تھا کہ اب امریکیوں کو تھرڈ ورلڈ کے مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا، ان کی بھرپور کوشش یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے قدم امریکہ کی سرزمین سے دور ہی رہیں۔

امریکہ ایک آکٹوپس کی طرح اپنے خوبصورت سہل پرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جب جکڑ لیتا ہے تو اس کی مضبوط ٹانگوں میں پھنس کر انسان بے بس ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے اس وقت تک واپسی کی سب کشتیاں جل چکی ہوتی ہیں۔

سب دوست احباب سہانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے، اس کی خیریت دریافت

کرتے اور ڈرتے اس دن سے جب سہانہ کی جگہ اس کا میاں فون اٹھائے اور کہہ دے کہ اب سہانہ یہاں نہیں رہتی۔

موت ایک وحشی ڈائن کی طرح ہڈیوں کے بالن کے بجھتے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سہانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشا دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اٹھنے والا اور ایک گرنے والا تھا۔ "تم یہاں کیسے! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" فرح نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ "طبیعت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ انجوائے کرلوں!" اپنے گنجے سر پہ دوپٹے کو ٹکانے کی کوشش کرتے ہوئے سہانہ مسکرانے لگی۔

ہاں تو اور کیا میں نے بھی کہا" اگر تمہارا جی چاہ رہا ہے تو شو دیکھنے چلے جاتے ہیں ذرا طبیعت ہی بہل جائے گی۔ ہم تو اپنی سہانہ کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے ہیں بھئی" سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم سب دھیرے دھیرے ہال کے اندر جانے لگے۔

"کیا تم اتنی دیر آرام سے بیٹھ لوگی؟" فرح نے پھر اپنی دوست سہانہ سے پوچھا، "جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ پھر اٹھ کر چل دیں گے اور کیا چلے تو جانا ہی ہے۔" سہانہ کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیلنے لگی اور میرے کلیجے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ ہماری سیٹیں ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پہ نہ تھیں اس لیے ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھا۔ ہم انڈین فلموں کے مقبول ترین فنکاروں کو دیکھنے جا رہے تھے اور میں بھی خوش تھی کیونکہ عمر رسیدہ ہو جانے کے باوجود موقع کی مناسبت سے میں بھی بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے میں ہی عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں گے اور میں اکیلی کھڑی رہ جاؤں گی۔ بالآخر شو شروع ہو گیا۔ پردہ اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر آغاز پر خوشی کا اظہار کیا۔ سکرین پہ فنکاروں کی شو کے لیے تیاری کی ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ وارم اپ ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ انسانی جذبات کے حوالے سے تھیم کو تشکیل کیا گیا تھا لہٰذا جتنے فنکار سٹیج پر آتے گئے ان کے آنے

سے پہلے ان کے ساتھ ایک جذبہ کا نام سکرین پر ابھرتا اور پھر غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلے آنے والے فنکار ارجن رام پال تھے جن کے لیے جذبہ رشک Envy تجویز ہوا تھا اور انہیں دیکھا تو واقعی یقین آ گیا کہ ان کے لیے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہائے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے اس نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا اور حاضرین کی پرزور ستائش اس بات کی کھل کر گواہی دے رہی تھی۔ ارجن نے اپنے چند مقبول فلمی گانوں پر ایک ڈانس گروپ کے ساتھ مہارت سے ڈانس کیا اور مداحوں کی تالیوں کی گونج میں سٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پر لکھے ہوئے اگلے جذبے کا نام Passion تھا۔ جیسے ہی یہ ایکٹ شروع ہوا سارا منظر گلابی گلابی سا ہو گیا اور مدھر دھنیں فضا میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنٹا آ رہی ہے لہٰذا انہوں نے اس بھولی صورتیا کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت مختصر جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور گانوں پر ڈانس کیا اور لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔ اب کی بار جو پردہ گرا تو نئے عنوان کے ساتھ اٹھا Lust لکھا دیکھتے ہی لوگوں کی حس ظرافت پھڑکنے لگی اور سب ہنسنے لگے اس جذبے کی نمائندگی کے لیے خوبصورت نوجوان اداکارہ پریانیکا چوپڑہ اور سیف علی خان منظر پہ نمودار ہوئے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرنے لگے۔ پریانیکا نے بہت اچھا گایا اور ڈانس کیا، سیف نے شاہکش انداز میں گٹار بجائی اور حاضرین سے مخاطب بھی ہوئے۔ لڑکیاں بار بار We love you saif کہتیں تو وہ بھی فلائنگ کس پھینک کر جواب دیتے۔ I love you too اس سے ہال میں ایک لطف بڑھتی چلی جاتی۔ لوگ خوش ہو رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے رنگ و روشنی کا ایک حسین احساس تھا جس کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ رانی مکھرجی سٹیج پر آئیں تو ان کے مداحوں نے انہیں بھی خوب سراہا اور کئی لوگ ان کے ڈانس کے ساتھ کھڑے ہو کر ڈانس کرتے نظر آنے لگے۔

میں نے کنکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا جو عنقریب ایک جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہ میں تبدیل تو ہونے والی تھی مگر کائنات کے نظام میں اہمیت رکھتی تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کے دروازے کو نیم وا کیے بیٹھی تھی اور مشتاق اکھیوں سے باہر گلی میں کھیلے جانے والے تماشے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لیے

نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔

سیف علی خان کے بعد پستہ قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مکھر جی سٹیج پر آئیں اور کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمکارا دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا، لوگ اس کے رقص پہ جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ ان سب فنکاروں کی رخصتی کے بعد ہال پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا، سہانہ کی بھابی نے اپنی نند کی طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا "چلیں تم تھک گئی ہو گی؟"

"نہیں، جتنی دیر بیٹھ سکی بیٹھوں گی" سہانہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور سٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار گھوم لینے کے خیال سے خوش تھا اور اندھیرے ہال میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پردے پہ جیسے ہی لفظ محبت "Love" لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ اب ون اینڈ اونلی شاہ رخ خان آ رہے ہیں۔ وہ شاہ رخ خان جس کے لیے وہ کب سے منتظر تھے۔ سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو سٹیج پر اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ سکرین پر اتنا خوبصورت دکھنے والا یہ مقناطیسی کشش کا حامل سٹار کافی درمیانی شکل صورت اور قدبُت کا مالک تھا اس کی مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری اور ہردلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ آج شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنے فلم بین مداحوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں سب کچھ خوبصورت اور ممکن ہوتا ہے۔ الجھنیں سلجھ جاتی ہیں اور حقیقتوں کی تلخیاں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا تو اسی لمحے چھت سے ٹپکتے ہوئے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے سماں مزید رومانوی ہو گیا۔ لڑکے، لڑکیوں نے ایکسائٹمنٹ کے مارے چیخیں مارنا شروع کر دیں تو شاہ رخ نے مائیک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں شروع کر دیں اور باتوں باتوں میں جب کسی بات پہ بے ساختہ انداز میں ماشاءاللہ کہا تو بہت اچھا لگا۔ وہ حاضرین سے باری باری پوچھتے چلے گئے۔ ممبئی سے کوئی ہے، یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں؟" تو سب پاکستانیوں نے ...

شور سے تالیاں پیٹیں جن میں میں بھی شامل تھی۔ اس وقت شاہ رخ مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا کہ سنا ہے شاہ رخ پاکستانیوں سے بھی پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہئے کیونکہ پاکستانی بھی تو بڑے ذوق شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو سٹیج پر بلایا تو انہوں نے وفور جذبات میں شاہ رخ کو گود میں ہی اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ سارا ہال ہنس ہنس کر داد دینے لگا، لگتا تھا اس لمحے ساری دنیا خوش تھی اور دکھ نام کے کسی جذبے سے آشنا نہ تھی۔ سہانہ بھی ہنس رہی تھی اسے اس وقت کہاں یاد تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں تماشہ ختم ہو جائے گا، روشنیاں گل ہو جائیں گی اور سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ پیش منظر، پس منظر میں تبدیل ہو جائے گا اور نظام کائنات چلتا رہے گا۔ کیا شاہ رخ خان کو دیکھنا سہانہ کی کوئی آخری خواہش تھی؟ میرے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ اپنے ایکٹ کے دوران شاہ رخ خان نے مختلف لوگوں کو سٹیج پر بلایا اور اپنے ساتھ آئٹم میں شامل کر کے ان سے باتیں کیں ان کے ساتھ ڈانس کیا۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجواؤں جس پہ لکھا ہو کہ تمہاری ایک فین بستر مرگ سے اٹھ کر آج تمہیں دیکھنے تمہارے فن کی پذیرائی کرنے کو یہاں چلی آئی ہے۔ اس سے ذرا مل لو، اس کے ساتھ بات کر لو، اسے کوئی جھوٹی تسلی ہی دے دو، شاید اس طرح اس کی زندگی کے گنے چنے لمحوں میں ایک آدھ لمحے کا ہی اضافہ ہو جائے، وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہو سکتا ہے، مگر میں اپنی اس پاگل خواہش کو دل ہی دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ سٹیج پہ کھڑے زندگی سے بھرپور دلکش شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پیغام پہنچانا ناممکن تھا، لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سکیورٹی کے لیے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی بیریئرز اور ہال کا نظم ونسق سنبھالنے والے موٹے موٹے بڑے ڈیل ڈول والے بلیک سکیورٹی گارڈز، ان سب کے ہوتے ہوئے ایک ننھی سی پرچی پہ لکھا ہوا کوئی پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچایا جا سکتا تھا؟ کچھ ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو ایک لمبے سے پہیوں والے سٹینڈ پر کھڑا کر کے حاضرین کے بالکل قریب سے گزرنے کا موقع دیا جس پہ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سہانہ بھی کمزور ہاتھوں سے تالی بجا رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ہلاتا، فلائنگ کس پھینکتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا، اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ دو بجھتے ہوئے

دیوں میں کتنی خوبصورت جوت جل اٹھی ہے۔ اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اسے اپنے چاہنے والوں کو خوش کرنا ہے ان کا دل لبھانا ہے اس لیے دوبارہ سٹیج پر نمودار ہوا اور اب کی بار اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر ڈانس کیے اور ڈائیلاگ بولے۔ اس کے مزیدار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں ایکسائمنٹ کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخوں اور کہوں، شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو......وہ جا رہی ہے تمہیں وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی.....کل وہ پتہ نہیں ہونہ ہو، مگر ایک ہیجانی شور میں میری آواز کیسے سنائی دے سکتی تھی اس لیے میں خاموش رہی۔ سٹیج پہ زندگی تھرک رہی تھی حاضرین کی رگوں میں بہنے والے خون کی قوت بڑھا رہی تھی اور موت ایک سیٹ پہ بیٹھی محظوظ ہوتی کسی کی ختم ہوتی سانسوں کی ریزگاری گن رہی تھی "ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جا کے بتائے؟" میرے دل نے ایک اور چیخ ماری اور میں پھر خاموشی سے شو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہو گیا اور ہم سب ہال میں سے باہر نکلنے لگے۔ سہانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ کہیں رش میں اسے ٹھوکر نہ لگ جائے۔

"برا حال ہے چلا بھی نہیں جا رہا لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا، کتنا مزا آیا....." سہانہ کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"کئی بار پوچھا چلنا ہے؟ مگر توبہ کریں جی یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی" سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کے بازو کو تھپتھپایا، میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر نیچے جھک گئیں یوں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے اور باقی رہ جانے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پر صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟

سہانہ شاہ رخ سے نہ مل سکی اور زندگی سہانہ کو تو کیا ہوا؟ کسی تعلق کو قائم رکھنے یا ثابت کرنے کے لیے کیا کسی کا کسی سے ملنا ضروری ہوتا ہے؟ ایک ہی گلیکسی کے سیارے اپنے اپنے مدار میں تیرتے رہتے ہیں، ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہیں مگر ان کا ایک دوسرے سے تعلق تو پھر بھی ہوتا ہے۔ ہم سب کائنات کی گھمن گھیری کے ناچتے ہوئے بگولوں میں اڑتے ہوئے تنکے ہیں۔ آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کے بائیسکوپ میں جڑے شیشوں میں قید ہیں، یہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے جہاں پردہ گرتا ہے پھر اٹھتا ہے، کردار انٹری دیتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ شو کو تو چلتے رہنا ہوتا ہے۔ جنم اور مرن کھلے سمندر میں تیرنے والی دو کشتیوں کا نام ہے۔ ہم

خوشی مناتے ہیں جب جنم کشتی اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اس سے بے نیاز کہ راستے میں اسے کتنے طوفانوں، جھکڑوں بگولوں کا سامنا کرنا ہوگا، ہم سوگ مناتے ہیں جب یہ کشتی کنارے جا لگتی ہے حالانکہ ہمیں اس وقت خوش ہونا چاہئے کہ کٹھن سفر ختم ہوا مسافر نے منزل کو جا لیا اور اب اس کے نصیب میں آرام ہی آرام ہے۔

میں سہانہ کے لیے سوگوار نہیں ہوں، وہ پنہاں ہوگئی تو کل یقیناً کسی لالہ وگل میں نمایاں ہو جائے گی۔ باغ حیات میں چلتی باد صبا مہکتی سرسراتی ہوئی جب کسی غنچۂ نو کے رخسار پہ بوسہ دے گی تو شاید وہ بھی اسی طرح پیار سے مغلوب ہو کر خوشی سے تالیاں بجائے گا جیسے اس روز سہانہ واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی ہال میں بجا رہی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میری آنکھ کے کونے میں ایک اکیلا آنسو آتا ہے تو آ کر اٹک سا جاتا ہے۔ دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر کسی دن شاہ رخ خان کو لالہ کے اس پھول کے بارے میں پتہ چل گیا تو اسے کیسا لگے گا؟ کیا سوچے گا وہ اس بے انت کہانی کے بارے میں؟

کالی دھوپ

"ہیلو بے بی، کیا نام ہے آپ کا؟"

مونا نے نئی ملازمہ غلام فاطمہ کے ساتھ کھڑی، پلکیں جھپکاتی، ننھی سی لڑکی کو دیکھ کر پیار سے پاس بلایا اور ایک ٹافی آگے بڑھا دی۔ بچی آگے آنے کے بجائے ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے لونا....." مونا نے بے تکلفی سے اصرار کیا اور اس کی ماں سے پوچھا "کیا نام ہے اس کا؟"

"شریفاں، بس بی بی جی ذرا شرماتی ہے..... بڑے لوگوں سے" غلام فاطمہ نے بی بی کے ہاتھ سے ٹافی لے کر بچی کو تھما دی اور خود زور زور سے زمین پر ٹاکی لگا کر اسے چمکانے لگی۔

مونا کو اس روز کالج ذرا ٹھہر کے جانا تھا اس لیے دیر سے اٹھی تھی اور اب گھر میں ادھر ادھر چل پھر کر معمولات کا جائزہ لے رہی تھی۔ مما صبح سویرے ہی سکول کو روانہ ہو چکی تھیں۔ پرنسپل ہونے کی وجہ سے انہیں وقت کی پابندی کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے صبح کے وقت ان کا گھر میں نظر نہ آنا معمول کی بات تھی۔ مما گھر کے پرانے ملازم رمضان بابا کو کھانا، صفائی، سودا سلف کے بارے میں ضروری ہدایات دیتیں اور چلی جاتیں۔ بابا گھر کے انتظام کو اپنی مرضی اور قابلیت سے احسن طور پر چلانے کے اہل تھے۔

شریفاں بھلا کیا نام ہوا؟ نہ نہ اس پر بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا۔ کتنی پیاری بچی ہے

تمہاری، آج سے اس کا نام شیری ہے، بس۔ ''ٹھیک شیری؟''

مونا نے ملازمہ کی چھ سات سالہ خوبصورت گیلی گیلی بیٹی کا یکدم سٹیٹس بلند کر دیا۔ غلام فاطمہ ڈھینوں کی طرح مسکرا دی اور جلدی سے اپنی بٹیا کو قریب لا کر اپنی چادر سے اس کا منہ صاف کرنے لگی۔

''ادھر آؤ شیری!'' مونا نے شریفاں کو پاس بلایا تو غلام فاطمہ نے اسے چھوٹی مالکن کے قریب دھکیلنے کی کوشش کی۔ ''آؤ چلو ہم دونوں وڈیو گیم کھیلتے ہیں۔ مونا نے اسے ٹی وی کے آگے سیٹ کر کے ہاتھ میں گیم کے مینوئل کنٹرولز تھما دیئے اور اسے گائیڈ کرنے لگی۔ غلام فاطمہ حیرانی اور خوشی سے بیگم صاحب کی اس نرالی بیٹی کو دیکھنے لگی۔ بڑے لوگوں کی بیٹیاں ایسی نیک دل بھلا کہاں ہوتی ہیں؟ یہ چھوٹی باجی تو کوئی اللہ لوک ہی ہے جو میری شریفاں کو اتنی محبت دے رہی ہے۔ اس نے بے یقینی سے سوچا۔ اس گھر کے پرانے ملازم رمضان بابا نے اسے صفائی کی نوکری دلواتے ہوئے یہ تو نہیں بتایا کہ اس گھر میں ایک اتنی پاک روح بھی رہتی ہے جو اس کی بن باپ کی بچی کو نہ صرف یہ کہ چھوٹی سی سہیلی کی طرح سمجھے گی بلکہ نام بدل کر اس کا مقام بھی بلند کر دے گی۔

چند ہی ہفتوں بعد مونا کی مما مسز شیرازی نے محسوس کر لیا کہ ان کی بیٹی نے غلام فاطمہ کی بیٹی کو کافی سر چڑھا رکھا ہے۔ ہر وقت اسے شیری کہہ کر بلانا، ساتھ بیٹھ کر کلرنگ بک میں رنگ بھروانا، نت نئی امپورٹڈ چاکلیٹیں کھلانا، میکڈونلڈ پر لے جانا..... یہ سب فضول باتیں مونا کر رہی تھی اور مما کی کوفت بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے اس لڑکی کو کیا تھا، کیا مینوفیکچرنگ فالٹ گندھا تھا ان کی بیٹی میں؟ کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی؟ اس کا بچپن سے یہی وطیرہ تھا۔ نوکروں، مالیوں، چوکیداروں کے بچوں سے گھل مل جانا، ان کے گھروں میں گھس کر ان کے ساتھ کھا پی لینا اور آ کر کہنا کہ ''ان کے جیسا مزے کا کھانا ہمارے گھر کیوں نہیں پکتا؟'' ان کی ارہر اور مسور کی دالیں، ہرے ہرے دھنیئے کے بگھار، ابلے ہوئے ٹوٹا چاول کے ننھے پہاڑوں جیسے ڈلے اور ڈھیر سارے بچوں کا اردگرد چھایا ہوا غول، سب کچھ کتنا مزے کا تھا۔ اپنے گھر کی بارہ کرسیوں والی بڑی سی شاندار ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے ہوئے وہ اور مما، اور کبھی کبھار نظر آنے والے پاپا' سوپ چکن روسٹ اور ہوم بیک بریڈ، سفید بے داغ نیپکن اور چمکتے ہوئے چھری کانٹے، یہ سب کچھ مونا کو بہت بورنگ، بے مزا اور بے رنگ لگتا۔ وہ تینوں اپنی بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر خاموش بیٹھے کھانا کھاتے رہتے اور مونا

سے اس کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتے رہتے۔ کوئی مزے کا موضوع کبھی ڈسکس نہ ہوتا۔ پیٹ بھر کے کھا لینے کے باوجود مونا بھوکی، پیاسی اٹھ کھڑی ہوتی اور چپکے سے کمرے میں پہنچ کر کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر کا نظارہ کرنے لگتی جہاں نوکروں کے گھروں سے طرح طرح کی آوازیں اور خوشبوئیں آ رہی ہوتیں۔

''غلام فاطمہ تم اسے..... یعنی شریفاں کو کسی کے پاس گھر چھوڑ آیا کرو، تمہارے کام میں حرج ہوتا ہے اور دیکھو نا یہ بے چاری بھی بس یونہی تمہارے پلو سے لگتی تمہارے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔'' ایک دن مسز شیرازی نے مونا کو ارد گرد نہ پا کر غلام فاطمہ سے اپنی دل کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آج انہیں موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنی صفائی کرنے والی کو احساس دلا دیں کہ گھر کے ملازموں اور تنخواہ داروں سے تعلق کی ایک حد ہوتی ہے جسے انہیں پار نہیں کرنا چاہئے۔ ان کی بیٹی بے وقوف تھی جو کئی بار اپنی اس اعتماد کر لینے والی عادت سے نقصان بھی اٹھاتی تھی مگر وہ بہتر سمجھتی تھیں کہ کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

''اچھا بیگم صاحب۔ میں کوشش کروں گی اسے ساتھ نہ لاؤں۔''

غلام فاطمہ نے ادب سے جواب دیا اور رمضان بابا کے ساتھ گھر کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گئی۔ اسے کوئی شوق نہیں تھا شریفاں کو ساتھ ساتھ چپکا کر رکھنے کا مگر کیا کرتی؟ اسے ساتھ رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ گھر پہ سوائے اس کی بوڑھی ساس کے اور کوئی نہ تھا۔ شوہر شریفاں کے پیدا ہوتے ہی ہیروئن کی لت کی وجہ سے گھر بار چھوڑ کر کہیں غائب ہو چکا تھا اور اب شریفاں ہی اس کی کل کائنات تھی۔ ساس آنکھوں سے تقریباً اندھی اور کانوں سے بہری ہو چکی تھی مگر کم از کم گھر میں اس کا جیتا جاگتا وجود تھا تو سہی۔

اب غلام فاطمہ شریفاں کو کبھی کبھار گھر پر دادی کے پاس چھوڑ کر تو آنے لگی تھی مگر اس کا دھیان ہر دم پیچھے ہی لگا رہتا تھا۔

مونا نے دو تین بار شیری کے بارے میں پوچھا تو غلام فاطمہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے بتا دیا کہ بیگم صاحب کی مرضی ہے کہ وہ اسے ساتھ نہ لایا کرے۔ مونا کو اس بات کا شک تو پہلے سے تھا اب یقین ہو گیا کہ مما بہت پتھر دل ہیں۔ جذبات و احساسات سے کوری ایک کولڈ اور کیلکولیٹنگ عورت۔ پتہ نہیں کیوں شاید سکول پرنسپل ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت اتنی منجمد

ہو گئی تھی سارا سکول ان سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ ڈسپلن کی بڑی سختی سے قائل تھیں۔

اونچی لمبی، گوری چٹی، صحتمند جثے والی چالیس، پینتالیس سالہ مسز شیرازی کاٹن کی کلف لگی، استری شدہ ساڑی میں ملبوس سکول میں راؤنڈ لگاتی بہت پر وقار لگتی تھیں۔ لوگ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کی طرف بے ساختہ دیکھنے لگتے مگر پھر کچھ دیر بعد سنبھل جاتے کہ مسز شیرازی کی سرد لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ سننے کا کسی میں حوصلہ تھا نہ تاب۔ وہ اپنی انگلی کے ایک اشارے سے ہی اپنی بات سمجھانے کی عادی تھیں۔ فالتو باتیں کرنے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ اگر کسی کلاس روم کے آگے سے گزر جاتیں تو سٹوڈنٹس کو سانپ سونگھ جاتا۔ لان میں سے ہو کر آفس کو جاتیں تو پھول پتے سانس روک لیتے۔ سٹاف روم کی طرف آنکلتیں تو ٹیچرز کی گپیں اور قہقہے گلے میں گھٹ کر رہ جاتے۔ نوکر طبقہ سکول کی صفائی ستھرائی میں مستعدی سے جٹ جاتا اور سکول کی عمارت مضبوطی سے قدم جمائے ان کی طرف اطمینان سے کھڑی دیکھتی رہتی کہ ان جیسی فرض شناس، قابل، اپنے کام سے کمیٹڈ پرنسپل کے ہوتے ہوئے سکول کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو سکتی تھی۔

سکول میں سب کو ہی پتہ تھا کہ مسز شیرازی کی بیٹی مونا کی طبیعت ان سے بالکل الٹ تھی۔ شاید وہ اپنے ابو پہ گئی ہو، لیکن شیرازی صاحب کو کبھی کسی نے کوئی خاص قریب سے دیکھا نہیں تھا۔ خاموش طبع سے گریس فل لگنگ شیرازی صاحب کبھی کبھار مسز شیرازی کو لینے سکول آتے تو گیٹ کے باہر سے ہی چوکیدار کو کہلوا دیتے۔ خود گاڑی میں بیٹھے رہتے، یوں جیسے انہیں مسز شیرازی کے سکول، کام یا زندگی سے دور دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

مونا کو اپنے پیارے پاپا پہ کبھی کبھی بہت ترس آتا۔ وہ اپنے بڑے سے کلونیل سٹائل گھر میں کسی خاموش فلم کے کردار کی طرح ڈریسنگ گاؤن پہنے، پائپ ہونٹوں سے لگائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک یوں دبے قدموں گزرتے نظر آتے جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ وہ انہیں کبھی اپنی لائبریری میں گھسے ہارڈ باؤنڈ کلاسیکس کھنگالتے یا پرانے گانے سنتی دیکھتی تو اسے لگتا پاپا بہت اکیلے ہیں۔ ان کے کوئی خاص دوست بھی نہیں تھے، جو انہیں کمپنی دیتے یا ان کے ساتھ باہر چلے جاتے۔ پاپا کے سبھی دوست دوسرے ملکوں میں رہتے تھے جن کے فون اکثر آتے رہتے۔ مما کے پاس ان کے لیے شاید نہ وقت تھا اور نہ ہی کوئی خواہش یا جذبہ۔ وہ انہیں بس ضروری بات کے لیے ہی مخاطب کرتیں اور برفیلی نظروں سے دیکھتی رہتیں۔ مما کا ان کو "سر" کہہ کر بلانا بھی مونا

کو عجیب لگتا مگر سوچتی شاید مما ان کی اتنی عزت کرتی ہیں کہ انہیں نام تک سے نہیں بلا سکتیں۔

مما اور پاپا اپنی اپنی دنیاؤں میں دو اجنبی سیاروں کی طرح گول گول چکر کاٹتے اپنے اپنے مداروں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ مونا کو یاد آتا، اس کے بچپن میں ایک ایسا دور بھی تھا جب مما اور پاپا Lovebirds کی طرح آپس میں ہر وقت چپکے اکٹھے نظر آتے تھے۔ اس وقت اس بڑے سے گھر میں خوشیاں اور قہقہے گونجتے اور در و دیوار، زندگی سے دھڑکتے تھے۔ زندگی ایک مسلسل لمبی پکنک کی طرح محض موج میلہ ہوا کرتی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا وقت ظالم ہو گیا۔ مما اور پاپا ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ شاید کیریئر، شخصیات، مصروفیات سبھی کا اثر تھا یا شاید محبتیں یونہی مرجھایا کرتی ہیں۔ مونا کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک گھر میں رہتے کبھی ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے تو یوں، جیسے گہرے نیلے سمندر میں گہری رات کو دو بحری جہاز پاس سے گزرتے، ایک دوسرے کو راستہ دینے کے لیے اخلاقاً پیچھے کو ہٹ جائیں اور اپنے جھنڈے احتراماً نیچے گرا دیں۔ مونا کو لگتا، گھر شاید ایسے ہی ہوتے ہیں اور ماں باپ اسی طور سے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ بس گھر کے معمولات کو کسی طور چلنا ہوتا ہے سو وہ چلتے رہتے ہیں اور زندگی بسر ہوتی رہتی ہے۔

پاپا اپنے بزنس ٹورز پر اکثر ملک سے باہر جاتے رہتے تھے۔ کبھی مہینہ، پندرہ دن گزار کر آ جاتے اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ مونا انکے انتظار میں دن گنتی رہتی کیونکہ ان کے گھر میں ہونے سے اسے ایک تسلی سی رہتی۔ ان کے پائپ کی مخصوص خوشبو کمرے میں پھیلنے لگتی تو پتہ چل جاتا کہ پاپا آ رہے ہیں۔ مونا کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ پاپا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ باہر سے لوٹتے تو مما اور مونا کے لیے طرح طرح کی مہنگی مہنگی کریمیں، لوشن، پرفیوم، جیولری لاتے۔ کئی دن تک گھر میں جیسے نمائش سی لگی رہتی۔ ماڈل ٹاؤن کے اس بڑے سے پرانے، انگریزوں کے زمانے کے بنے ہوئے خوبصورت اونچی اونچی چھتوں والے گھر میں مونا کے دم سے ہی رونق تھی۔ وہ گھر ہوتی تو در و دیوار زندگی کی جھنکار سے گونج اٹھتے۔ وہ ادھر سے ادھر دوڑتی بھاگتی، کبھی پاپا سے لاڈ پیار اور مباحثہ کرتی، کبھی مما کو اپنی کالج کی دلچسپ باتیں اور چٹکلے سنا کر مسکرانے پر مجبور کر دیتی تو کبھی رمضان بابا کے ساتھ کچن میں گھس کر چھیڑ خانی کرتی نظر آتی۔

جب سے غلام فاطمہ کی پیاری سی بیٹی شریفاں عرف شیری نے اس گھر میں آنا جانا شروع کیا تھا ایک نئی دلچسپی مونا کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اب شیری اس کا کھلونا، اس کی ننھی سی بہن تھی

جس کی وجہ سے وہ بھی خوب چہکتی تھی۔ کبھی اس کا منہ دھلا کر صاف کپڑے پہنا کر اسے کنگھی کر رہی ہے تو کبھی انگلش قاعدے سے A B C پڑھا رہی ہے۔ کبھی اسے کھلونے خرید کر دے رہی ہے تو کبھی اپنے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر کھانا کھلا رہی ہے اور تمیز طریقہ سکھا رہی ہے۔ غلام فاطمہ حیرت سے یہ سب دیکھتی اور اپنی بٹیا کے مقدروں پر رشک کرتی جسے ایسی پیاری باجی ملی تھی جو اس کی بیٹی کو اپنی سطح پر لے آئی تھی اور انسانوں میں فرق نہیں کرتی تھی۔

''شیری Come to me'' مونا نے اتنی انگریزی شیری کو سکھا دی تھی کہ وہ باجی کی بات سمجھ کر اس کے پاس دوڑی چلی آتی۔ غلام فاطمہ کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ کاش میری شریفاں کے مقدر واقعی ایسے ہوتے کہ وہ انگریزی سکول میں پڑھ رہی ہوتی اور یونہی گٹ پٹ کرنے کے قابل ہوتی۔ ''تم اس بچی کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو۔ اس میں نفسیاتی تضادات پیدا کر رہی ہو بے بی۔ تمہارا کیا خیال ہے، اس گھر میں یوں رہنے کے بعد کیا یہ بڑی ہو کر اپنی غربت اور جہالت کی زندگی میں آسانی سے ایڈجسٹ ہو سکے گی؟'' ایک روز مسز شیرازی نے مونا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو بیٹا ان لوگوں کا کیا ہے آج یہاں کام کیا، کل کہیں اور پھر جب اس بے چاری بچی کو اگلے کسی گھر میں تم جیسی باولی باجی نہیں ملے گی تو اس کے دل پہ کیا گزرے گی؟ کیا تم اس کی ذہنی حالت کی ذمہ داری لے سکو گی؟ یہ سب سوچا ہے تم نے؟''

''مگر مما میں تو ایک ایسے بچے کو زندگی کی بہتر نعمتوں سے متعارف کروا رہی ہوں جسے ہماری سوسائٹی کی طبقاتی کشمکش کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی لیکن کم از کم میں نے ایک ایسے ہی بدقسمت بچے کی اندھیری زندگی کو اجلی کرنوں سے منور کرنے کی اور اس کے حالات کو بدلنے کی کوشش تو کی ہے۔'' مجھے یہ احساس جرم تو نہیں ہوگا کہ ایک بچی میرے سامنے آئی، تاریکی کے پردے میں کھڑی رہی اور میں نے سلسلوں کو ویسے کا ویسا رہنے دیا، اسے اجالے میں لانے کی کوشش ہی نہ کی'' مونا نے اپنی منطق دے کر ماں کو لاجواب کر دیا اور مسز شیرازی کو یقین ہو گیا کہ ان کی بیٹی اور وہ کبھی ہم خیال نہیں ہو سکتیں۔ زمین آسمان کا فرق تھا ان دونوں کی سوچ میں۔

مونا نے محسوس کیا تھا کہ مما کی نسبت پاپا کا رویہ شیری سے کافی پر اخلاق تھا۔ کبھی کبھار وہ شیری کو ہیلو ہائے بھی کر لیتے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے غلام فاطمہ کو شیری پر خرچنے کے لیے

اپنے پاس سے کچھ پیسے دیے تو مونا کو ان پر بہت پیار آیا۔ اسے فخر محسوس ہوا کہ اس کا باپ اتنا فرشتہ صفت ہے۔ اسے غریبوں اور محروموں کی مشکلات کا احساس رہتا ہے۔

غلام فاطمہ نے بڑی بیگم صاحب کی مرضی کے مطابق شریفاں کو کبھی کبھار گھر پہ دادی کے حوالے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں ویسے بھی چھوٹی بی بی صبح کو گھر ہوتی نہیں تھی۔ کسی کام سے جلدی کالج چلی جایا کرتی تھی، پھر یہ کہ غلام فاطمہ اتنی اچھی بڑی بیگم صاحب کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غریبوں کی بستی کے چھوٹے سے جھونپڑے نما گھر میں یوں تو کچھ بھی خاص قیمتی نہ تھا مگر غلام فاطمہ اپنی ننھی سی سونے کی ڈلی کو گھر چھوڑتے وقت اماں کو اچھی طرح اس کا اور گھر کا خیال رکھنے کی نصیحت کرنا کبھی نہ بھولتی تھی۔

دادی، بہو کے واپس آنے تک اپنے طور پر گھر اور بچی کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتی اور چاہتی کہ گھر کا کچھ کام کاج بھی کر لے مگر بڑھاپے نے اسے بے کار اور بیزار کر رکھا تھا۔ زیادہ اٹھ بیٹھ نہ سکتی تھی تھوڑی ہی دیر بعد تھک کے ہانپنے لگتی۔

ننھی شریفاں خود ہی گھر میں ادھر ادھر کھیلتی رہتی اور کھڑکی میں کھڑی ہو کر ماں کا انتظار کرتی۔ کبھی کبھار ہمسایوں میں سے کوئی گزرتا تو شریفاں کو دیکھ کر پل بھر کو کھڑکی میں رک جاتا اور اس سے گھڑی دو گھڑی کو باتیں بھی کرنے لگ جاتا تو شریفاں بہل جاتی۔

ایک دو روز سے دادی نے دیکھا تھا کہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا کھڑکی میں سے گزرتے شریفاں کو ٹافی یا کھانے کی اور کوئی چیز تھما دیتا تھا جسے وہ خوشی خوشی تھام لیتی۔ بچی کو مسکراتا دیکھ کر دادی خوش ہو جاتی کہ بچی کا دل بہلا ہوا ہے اور زور زور سے ہاتھ کا پنکھا جھل کر اپنے گرد منڈلانے والی مکھیاں اڑانے لگتی۔

ایک روز غلام فاطمہ کے کام پر جانے کے بعد دادی نے ڈولتے ہاتھوں سے اپنے سر میں تیل لگایا اور پل بھر کو آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ شریفاں پاس ہی بیٹھی زمین پر رکھی دیگچی میں سے چاول کھا رہی تھی، دادی مطمئن ہو کر اونگھنے لگی۔

دادی کو گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھنے میں کچھ وقت لگا۔ اسے ایک لمحے کے لیے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ ننھی پوتی زمین کے بجائے بستر پر پڑی تھی اور اس کے اوپر ایک ہیولہ جھکا ہوا تھا۔ شریفاں کے گلے سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی اس کے گلے پر چھری پھیر رہا

ہو۔ دادی نے اپنی اندھی آنکھوں کو کوستے ہوئے ادھر ادھر ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ بچی کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو چکی ہے۔ پنکھے کی ڈنڈی سے ہیولے کو پیٹتے ہوئے دادی کے منہ سے ایسی دلدوز چیخیں نکلیں کہ ہیولے نے گھبرا کر ایک چھلانگ ماری اور کھلے دروازے میں سے باہر بھاگ گیا۔ دادی نے شور مچا مچا کر سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ لوگ ننھے پھول کو یوں بے دردی سے مسلا ہوا دیکھ کر سن رہ گئے۔

کسی نے بھاگ کر غلام فاطمہ کو فون کروا دیا جو اس وقت مونا بی بی سے شیری کو کئی دن سے ساتھ نہ لانے پر ہلکی ہلکی ڈانٹ کھا کر زیر لب مسکرا رہی تھی۔ فاطمہ نے گھر پر نمبر تو چھوڑا ہوا تھا مگر کسی نے کبھی اسے فون نہ کیا تھا۔ بات کو یقین اور بے یقینی کے عالم میں سن کر اور نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے کچھ سمجھ آ ہی گئی تھی۔ غلام فاطمہ نے سینے پہ دو ہتڑ مار کر چیخنا، چلانا شروع کر دیا اور مونا بی بی کو وہ سب بتا دیا جو اس نے فون پہ سنا تھا۔

"O My God! اتنا ظلم، چلو جلدی میرے ساتھ، میں تمہیں گھر لے چلتی ہوں۔"

مونا نے جلدی سے اپنی گاڑی نکالی اور روتی ہوئی، دہائی دیتی ماں کو اس میں بٹھا کر اس کی بستی جا پہنچی۔ گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا جو غلام فاطمہ کے ساتھ آنے والی میڈم کو اپنی زبانی رپورٹ دینے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ مونا نے شیری کو گود میں لینا چاہا مگر ننھی تتلی کے نازک نچے ہوئے پر اور جسم کے چیتھڑے دیکھ کر وہ سہم گئی اور آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کیا کوئی اتنا ظلم بھی کر سکتا ہے۔

مونا نے ماں بچی کو گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال جا پہنچی۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم حرکت میں آ گئی اور پریس والے "چائلڈ ریپ" کیس پہ اپنی رپورٹیں تیار کرنے پہنچ گئے۔ خواتین کی تنظیموں کی ارکان نے بھی آ کر اپنی سپورٹ کا اعلان کیا اور اس کیس کے مجرم کو سخت سے سخت سزا دلوانے کے مطالبے کرنے شروع کر دیے۔ چاروں طرف ایک شور مچ گیا۔

مسز شیرازی کو پتہ چلا تو وہ گھبرا گئیں۔ ان کی جوان غیر شادی شدہ بیٹی کا اس قسم کے واقعے میں ذاتی طور پہ انوالو ہونا، پریس کو بیان دینا، بچی کو اٹھائے ہسپتال جا پہنچنا۔ یہ سب ان کے خاندان، سکول کی ریپوٹیشن کے لیے کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ کل کو اس لڑکی کی کہیں شادی بھی ہونا تھی۔ بڑی ناسمجھ تھی ان کی بیٹی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگیں۔

موٹا گھر پہنچی تو مما نے اس کے خوب لتے لیے۔ ''کیا ضرورت تھی تمہیں اس معاملے میں اتنا آگے بڑھ جانے کی؟ تمہیں اپنی ماں، باپ، فیملی کی پرسٹیج کا کیا کوئی خیال نہیں آیا؟ لوگ سو طرح کی باتیں بنائیں گے۔ کبھی تو عقل سے کام لیا کرو موٹا۔''

''مما آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اس ننھی معصوم جان کے ساتھ اتنا ظلم ہوا ہے، آپ کو احساس ہے اس بات کا؟ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ایسے وقت میں جب ان ماں بیٹی کو ہماری ضرورت ہو تو ہم انہیں اس Big bad world میں تنہا چھوڑ دیں۔ سوری مما۔ میری Sensibility مجھے اس چیز کی اجازت نہیں دیتی۔'' موٹا بھی اپنے موقف پہ ڈٹی رہی۔

''دنیا میں ازل سے ظلم ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ کوئی آئیڈیل ورلڈ نہیں ہے جس میں ہم تم سانس لے رہے ہیں۔ ہم کس کس کے دکھ دور کر سکتے ہیں آخر۔'' مما نے اسے ڈانٹ کر جواب دیا۔

''میں اس درندے، اس جانور کا پتہ لگا کر اسے اپنے کیے کی سزا دلوا کر رہوں گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ گھٹیا جاہل، گندے لوگ، ایک معصوم بچی کی زندگی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ انہیں خدا کا خوف نہیں ہوتا؟ تو بہ اس طبقے میں اکنامک فرسٹریشن اور جہالت اتنی ہے کہ انہیں زندگی ڈھنگ سے گزارنے کی تمیز ہی نہیں رہی۔'' موٹا کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔

''اس، رویے کا طبقے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا موٹا، میری بچی۔ یہ مرد کا عورت کو قابل تصرف، ڈسپوزایبل شے سمجھنے کے تصور کا نتیجہ ہے اور بس۔ میری جان، اس حقیقت کو جان لو کہ عورت، کو انسان نہیں ایک Object سمجھنے کی روایت صدیوں سے دنیا کے معاشروں میں موجود ہے۔ جب تک مرد، عورت کو اس سے کچھ مختلف نہیں سمجھے گا، یہ ظلم ہوتے ہی رہیں گے۔ بس اب تم ہسپتال نہیں جاؤ گی، سمجھیں؟'' مما نے پیار سے سمجھاتے سمجھاتے موٹا کو پھر ڈانٹ پلانی شروع کر دی۔

''What's going on بھئی؟ موٹا بے بی تم اپ سیٹ لگتی ہو؟'' پاپا بھی شاید ماں بیٹی کو اونچی آوازوں میں بحث کرتے سن کر اپنی لائبریری سے نکل آئے تھے۔ ''کیا پرابلم ہے؟'' انہوں نے مما کو مخاطب کیا۔

''اپنی بیٹی سے ہی پوچھ لیں۔'' مما نے تنکا سا جواب دیا اور خود پیر پٹختی کمرے سے

باہر نکل گئیں۔

مونا باقاعدگی سے جم جا کر ورزش کرنے والے، اونچے لمبے، خوبصورت شخصیت والے گریس فل پاپا کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔ نفیس طبع، سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ کتنا ٹھہراؤ تھا ان کی طبیعت میں۔ کتنا احساس تحفظ ملتا تھا ان کے آس پاس ہونے سے یوں جیسے کڑکتی دھوپ میں چلتے چلتے کوئی چھتری سر پہ تن جائے اور جسم کو بھسم ہو جانے سے بچا لے۔ شیری کو تو باپ کا سایہ ہی نہیں ملا۔ اسے کیا پتہ سینس آف پروٹیکشن کیا ہوتی ہے۔ "ایک جانور نے شیری جیسے اجلے معصوم فرشتے کو روند ڈالا ہے۔ مما میں ایسے ظلم کو سمجھ نہیں سکتی، میں آج کی جنریشن ہوں، میں ظلم سہنے کی روایت کے خلاف بغاوت کرتی ہوں۔ مجھے کوئی روکنے کی کوشش نہ کرے مگر بتائیں مما ایسا کیوں ہوتا ہے؟" مونا رو کر پوچھنے لگی۔ "کیونکہ اس دنیا میں اجلے فرشتوں کے ساتھ ساتھ کالے فرشتے بھی سانس لیتے ہیں، ابلیس ہر جگہ آن دھمکتا ہے کہ اس کی رگوں میں ہر دم نیگیٹو انرجی دوڑتی ہے۔ وہ تو خدا سے بھی ٹکر لے سکتا ہے..... ہے نا شیرازی صاحب؟" مما نے پاپا سے سوال کر کے انہیں کنفیوژ سا کر دیا اور خود دبے قدموں کمرے سے باہر جا کر لان میں ٹہلنے لگیں۔ کاش وہ اپنی معصوم بیٹی کو سمجھا سکتیں کہ دنیا انصاف سے خالی ہوتی ہے۔ بلائیں معصومیت کو نگل جاتی ہیں اور سیاہ رات دن کی پاکیزگی پہ غلبہ پالیتی ہے۔ مگر مونا کو سمجھانا آسان نہیں تھا۔

پاپا خاموش بیٹھے پائپ پیتے رہے۔ یہ تو انہوں نے نوٹ کیا تھا کہ مونا میڈ کی بیٹی کے ساتھ غیر معمولی طور پہ پیار کرتی ہے مگر حالات و واقعات اس طرح کا رخ اختیار کرلیں گے یہ انہیں بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ مونا کو ہر دکھ سے کیسے بچا سکتے تھے۔ مونا ان کی جان، ان کی زندگی تھی مگر اس کا دل چکنا چور ہو چکا تھا اور وہ بے بس تھے۔ مما کا سوال سن کر پاپا کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا۔ مگر چند ہی لمحوں میں انہوں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور مونا کو پیار سے پچکارنے لگے۔

"میری بچی تو اتنی حساس ہے، تیرا کیا ہوگا، مجھے تو یہی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اچھا چلو ایسا کرتے ہیں کہ اس ساری بات کو بھول کر ہم دونوں باپ بیٹی، باہر چلتے ہیں، ڈنر کے بعد آئس کریم اور پھر گھر آ کر کوئی اچھی سی کامیڈی فلم دیکھتے ہیں۔ ٹھیک؟"

"پاپا میرا اس قسم کا کوئی موڈ نہیں ہے پلیز۔ میں بہت اپ سیٹ ہوں۔" مونا نے حیرت سے پاپا کو دیکھا جو اس وقت گڈ ٹائم کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ننھی شریفاں کے پرزے

پڑ رہے ہو جانے کا ان ماں باپ کو کوئی احساس کیوں نہیں ہو رہا تھا؟'' یہ یقیناً کلاس کے فرق کی وجہ تھی۔ اگر اپر کلاس کی کسی بچی کے ساتھ یہ ہوا ہوتا تو ان لوگوں کے کلیجے پر بھی ہاتھ پڑتا۔ مگر پاپا تو اتنے کلاس کانشس نہیں تھے پھر وہ بھی میری اس فیلنگ کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ مونا کو تھوڑا سا افسوس ہونے لگا۔

مونا کی زندگی میں اتنا سنگین واقعہ ہو چکا تھا مگر مما اور پاپا کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دونوں حسب معمول اپنی روٹین کے مطابق زندگی گزارے چلے جا رہے تھے۔ آنے والے دنوں میں پاپا ذرا زیادہ ہی خوش مزاج نظر آنے لگے۔ اکثر مونا کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے، اسے باہر لے جاتے اور اس مخصوص موضوع پر بات کرنے سے مونا کو باز رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے۔

مونا نے ہسپتال جا کر شیری کو دیکھنا نہ چھوڑا۔ وہ ننھے فرشتے کو ٹافیاں، برگر، غبارے دے کر ڈاکٹروں سے اس کے بارے میں صلاح مشورے کرتی تو غلام فاطمہ کے دل سے اس کے لیے دعائیں نکلنے لگتیں۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بدقسمتی سے بچی جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے گی۔ اب مونا کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ تمام زندگی اس بچی کی خیر و عافیت کی ذمہ داری نہیں لے سکے گی۔ نہ جانے کیسے طے کرے گی وہ زندگی کا کٹھن سفر، وہ دن رات یہی سوچتی رہتی۔

آٹھ دس دن بعد غلام فاطمہ کام پر واپس آ گئی کہ کام بنا تنخواہ نہیں ملتی اور تنخواہ کے بغیر زندگی نہ گزرتی تھی۔ اس صبح اتفاق سے مونا گھر پر ہی تھی۔ ایک ضروری کالج اسائنمنٹ پہ کام کرنے کے لیے کچھ ہی دیر میں اسے لائبریری جانا تھا جس کے لیے وہ تیار ہو رہی تھی۔ غلام فاطمہ کو دیکھتے ہی اس نے سب سے پہلا سوال اس کی بیٹی کے بارے میں کیا۔ ''کہاں ہے شیری اور تم اسے کس کے پاس چھوڑ کر آئی ہو۔''

غلام فاطمہ نے بتایا کہ اس کی بہن گاؤں سے آ گئی ہے اور بچی کی تیمارداری کے لیے کچھ عرصے تک اس کے گھر ٹھہری رہے گی۔ شریفاں ابھی تک خوف سے چیخیں مارتی اور سانس روک لیتی تھی۔ مونا کچھ مطمئن سی ہو گئی اور غلام فاطمہ صفائی کرتے کرتے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مما

نے اس روز سکول میں فنکشن کی وجہ سے کچھ لیٹ جانا تھا اس لیے ان کی بھی غلام فاطمہ سے ملاقات ہوگئی۔ مما نے سرسری انداز میں شریفاں کی طبیعت پوچھی اور پھر دھیمی آواز میں کہنے لگیں۔

''غلام فاطمہ، میری بات دھیان سے سنو، اب آئندہ تم اپنی بچی کو اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں لاؤ گی۔''

''جی بی بی جی، بیگم صاحب.....وہ.....؟'' غلام فاطمہ کی سوالیہ آنکھوں میں حیرت اور تاسف کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

''بیگم صاحب شریفاں بہت زیادہ ڈرنے لگی ہے جی اکیلے میں۔''

''بس میں نے کہہ دیا نا.....تمہاری بچی کی وجہ سے میری بیٹی بہت پریشان رہتی ہے۔ ٹھیک ہے تمہارے گھر میں حادثہ ہوگیا ہے، لیکن.....بس ہمیں معاف کردو.....اللہ تعالیٰ تمہارے حال پہ رحم کریں گے.....انشاءاللہ.....'' مما کے الفاظ مونا کے کانوں میں انگاروں کی طرح اترے اور روح کو جھلسا کر خاک کر گئے۔ اس کا جی چاہا وہ اٹھ کر جائے اور مما سے پوچھے ''مما، ایسا کیوں کر رہی ہیں آپ؟ کیوں اس نیک پاک فرشتے کو یہاں آنے سے روک رہی ہیں؟'' مگر وہ خاموش رہی۔ اسے پتہ تھا مما کوئی جذباتی عورت نہیں تھیں، جو فیصلہ ایک بار کر لیتیں اس پہ ثابت قدمی سے ڈٹی رہتیں۔ انسانیت سے زیادہ شاید انہیں اپنی کلاس، سٹیٹس، مرتبے کا خیال تھا۔ یکدم مونا کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے بلب کی طرح روشن ہوگیا۔

''شاید مما میری شیری سے محبت سے حسد محسوس کرتی ہیں شاید وہ نہیں چاہتیں کہ میں کسی سے بھی محبت کروں۔ ان کی طرح محبت سے خالی زندگی گزار دوں۔ کسی کو ان سے زیادہ توجہ نہ دوں۔ ہوسکتا ہے ان کا کوئی نفسیاتی پرابلم ہو.....''

''یہ سوچتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلی اور مما کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''مما ایک بات پوچھوں؟'' اس نے لان میں پھولوں کی کیاری کو پانی دیتی مما سے سوال کیا۔ مما نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مما۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ہر اس شخص کو مجھ سے دور کر دیتی ہیں جس سے مجھے پیار ہو یا دوستی ہو جائے۔''

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کتنی فضول بات کی ہے تم نے؟" مما کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا موتیے کی کیاری بھی ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"آپ..... آپ نے..... شیری کو یہاں آنے سے منع کردیا ہے..... اور آپ نے امریزہ کو بھی مجھ سے دور کردیا تھا....."

"امریزہ؟" مما کے حلق سے ایک سسکی نکلی، وہ یکدم جیسے کسی خواب سے چونک اٹھیں۔

"امریزہ کا کیا ذکر، اتنے برسوں بعد؟" مما دھیمی آواز میں بولیں اور گلاب کی کیاریوں کی مٹی کو پاؤں سے کریدنے لگیں۔ تمہیں اب تک امریزہ بھولی نہیں؟"

"کیسے بھول سکتی ہوں اسے میں۔ کتنی دوستی تھی میری اور اس کی اور پھر ایک دن آپ نے اسے مجھ سے دور کردیا اور میں روتی رہ گئی۔ نہ جانے کیوں۔

وہ معصوم بچی تھی..... مگر..... مجھے یاد ہے..... وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔"

مما یکدم جیسے تھک سی گئیں۔ پاس پڑی لان چیئر پر بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے لگیں۔

موتا کے ذہن میں روشنیوں کے جھپاکے سے ہونے لگے۔ وقت یکدم بہت پیچھے چلا گیا۔ خوبصورت سی گوری چٹی بارہ تیرہ سالہ امریزہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی جسے مما نے کسی پہاڑی علاقے سے موتا کو کمپنی دینے کے لیے بلوا کر ملازم رکھا تھا۔ مما سکول میں ہوتی تھیں تو انہیں موتا کی تنہائی کا فکر ہوتا تھا اسی لیے انہوں نے اس کے لیے اس کی عمر سے تھوڑی سی بڑی یہ پہاڑی لڑکی رکھ لی تھی تاکہ موتا کا خیال رکھے اور اس کے ساتھ کھیلے کودے بھی۔

موتا امریزہ اور مالی کا لڑکا یاسین ہر وقت اکٹھے کھیلتے تھے۔ کبھی باغ میں سے امرود توڑ رہے ہیں تو کبھی یاسین کی بازار سے لائی ہوئی کھٹی میٹھی املی کھا رہے ہیں۔ رات کو اکثر نوکروں کے دوسرے بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے برآمدے کے بڑے بڑے خاموش کھڑے ستونوں کے پیچھے چھپ جانا اور پھر ڈراؤنی آوازیں نکال کر ایک دوسرے کو ڈرانا..... کتنا مزا آتا تھا۔ ان سب حرکتوں میں۔ اچھے بھلے ہی تو رہ رہے تھے وہ سب کہ اچانک مما نے امریزہ کو اس کے گاؤں واپس بھیج دیا۔ امریزہ کو لینے کے لئے اس کی ماں آئی تو امریزہ اور موتا دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئیں۔ یاد رکھنے کے لیے چھوٹی موٹی نشانیاں بھی دی گئیں اور

پھر دوبارہ کبھی نہ کبھی ملنے کے وعدے بھی ہوئے مگر وقت کا ظالم سانپ سرسراتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا اور امریزہ نام کے جنگلی پھول کی مہک مونا اور مما کی یادوں سے بھی دھیرے دھیرے جاتی رہی۔

مونا کو اس کی رخصت کا دن کبھی نہیں بھولا تھا۔ مما اور مونا ڈرائیور کے ساتھ انہیں ٹرین پر چڑھانے گئی تھیں امریزہ کی ماں کے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی "ہم غریب آدمی ہیں بیگم صاحب ہم بڑے غریب ہیں۔"

مما نے اسے بہت سے پیسے بھی دیئے تھے شاید امریزہ کی اگلی پچھلی تنخواہ۔ مما کی بھی آنکھیں بار بار ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس روز کے بعد مونا نے امریزہ کو نہ پھر کبھی دیکھا نہ ہی اس کی کوئی خبر سنی۔

"بتائیں نا مما۔ آپ نے امریزہ کو اور مجھے الگ کیوں کر دیا تھا، کتنی خوش رہتی تھی میں اس کے ساتھ۔ وہ تو میری بہن کی طرح تھی۔ کتنا خیال رکھتی تھی میرا، لیکن شاید آپ سے برداشت نہ ہوا۔ آپ جیلس ہو جاتی ہیں مما۔ اس بات کا شاید آپ کو خود بھی احساس نہیں ہے۔"

مونا کی آواز کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں نے اسے کسی وجہ سے تم سے علیحدہ کیا تھا میری جان۔"

"کیا؟" مونا نے مما کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ "ایسی کون سی وجہ ہو گئی تھی؟"

"اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ظلم ہوا تھا۔" مما کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"کیا؟ نہیں؟ امریزہ..... وہ سویٹ سی لڑکی، میری سہیلی میری بہن،! خدایا۔" مونا نے دکھ سے آنکھیں بھینچ لیں۔

"کون تھا وہ؟ کس جانور نے یہ نیچ حرکت کی تھی مما....." مونا چلانے لگی۔

"یاسین؟" وہ جو ہمارے ساتھ، دوپہر کو آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا.....؟ اف خدایا۔"

مونا غصے اور دکھ سے بار بار مٹھیاں بھینچنے لگی۔

"یاسین کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ آپ لوگوں کو چاہئے تھا اسے پہاڑی لوگوں کے حوالے کر دیتے، وہ خود ہی مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیتے۔ آپ نے اتنی آسانی سے سب کچھ ہونے دیا۔ آپ کی اخلاقی ذمہ داری تھی یہ مما۔ آپ ایجوکیٹڈ عورت ہیں، پھر عورت

کے ساتھ اتنا استحصال ہوتا دیکھ کر چپ کیوں رہیں؟

بولیں نہ...... بتائیں نا..... آپ تو خود پردہ پوشی کر کے اس جرم میں حصہ دار بن گئیں۔
کاش میں اس وقت بچی نہ ہوتی تو اس جانور یاسین کے ٹکڑے کروا کے کتوں کے آگے ڈلوا دیتی۔
یہ ان پڑھ غریب طبقہ اسی لیے آج تک ترقی نہیں کر سکا۔ انہیں جہالت کی وجہ سے کوئی اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہتی۔"

"یہ کسی مخصوص طبقے کی بات نہیں ہے بیٹی۔ یہ ظلم عورت کے ساتھ ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔" مما نے برف جیسے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا "آپ نے یاسین کو اس واقعے کے بعد بھی گھر میں ملازم رکھا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کیوں؟ آخر آپ نے اسے کیوں اتنا برداشت کیا۔ Why۔"

"اس لیے کہ مجرم وہ نہیں تھا۔" مما نے ایک اور بم گرایا۔

مجرم وہ نہیں تھا؟ تو کون تھا؟ مما I dont understand مونا کنفیوژ ہو کر بولی۔

اسی لمحے سیڑھیوں پر سے پائپ کی مخصوص خوشبو نے نیچے اترنا شروع کر دیا" کون تھا وہ باسٹرڈ مما؟" مونا ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ پلیز Tell me"

مما صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور آنکھیں پوری طرح کھول کر، سیڑھیوں سے اترتے، پر وقار، مردانہ وجاہت کے نمونے، میرون ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس شخص پر گاڑ دیں۔
چند لمحوں کے لیے ماحول بالکل ساکت ہو گیا۔

دھوئیں کے مرغولوں کے پیچھے سے پہچانتے، مانوس چہرے کو دیکھ کر مونا کے لبوں سے ایک سسکی نکلی۔ "پاپا"......

ایک اور دریا

سکینہ کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ آنکھیں موندے موندے اس نے حیرت سے سوچا، ''میں مر چکی ہوں تو مجھے آوازیں کیسے سنائی دے رہی ہیں؟ کیا انسان مرنے کے بعد بھی سن سکتا ہے؟ کیا پتہ یہ فرشتوں کی آوازیں ہوں..... شاید میں جنت میں پہنچ چکی ہوں یا ممکن ہے دوزخ میں.....'' وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی کہ یکدم کسی نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر ہلا دیا۔ سکینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''اوئے اے تے زندہ اے'' ایک مردانہ آواز نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جان کر اس کے دل میں یکدم ایک خنجر سا کھب گیا کہ وہ ابھی تک زندہ تھی، مری نہیں۔ اف اللہ! تو کیا میں دوبارہ اس ظالم دنیا میں واپس آ چکی ہوں۔ یا اللہ! تو نے مجھے مرنے کیوں نہیں دیا؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بے ہوش ہو جانے سے پہلے کا منظر اس کی آنکھوں کے آگے فلم کی ریل کی طرح چلنے لگا۔ وہ ارادے کے مطابق قدم بڑھانا چاہ رہی تھی مگر پاؤں من من کے ہو کر زمین میں گڑ کے رہ گئے تھے۔ بالکل سامنے بہنے والا نیلا نیلا، چوڑا، چھلکتا کودتا نیلم دریا منہ زور ہو رہا تھا۔ جب اس کی بپھری ہوئی موجیں بار بار پتھروں سے سر پٹختیں اور پھر آگے جا کر سفید جھاگ میں تبدیل ہو کر سکون سے بہنے لگ جاتیں تو منظر بہت خوبصورت ہو جاتا۔

''کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے؟ جو کرنے آئی ہے کر۔'' دریا غصے سے دھاڑا۔

سکینہ سہم گئی اور پل بھر کو اس سے آنکھیں پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ اسے دریا سے ہم آغوش ہونا ہی تھا کہ پیچھے جانے کو اب کچھ بچا نہ تھا۔ واپسی کی سب راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ ساس، نند اور اس کے اپنے شوہر سرور نے اسے بانجھ ہونے کے طعنے دے دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی اسی لیے تنگ آ کر اس نے دریا کی طرف ہمدردی سے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اسے مایوس نہیں کرے گا۔ آخر یہ اس کا اپنا دریا تھا، اس کے بچپن کا دوست، اس کا بیلی۔ اس کے کنارے کھیل کود کر ہی تو اس نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنا سیکھا تھا۔ مگر دوست نے تو اس کے ساتھ غیروں والا سلوک کر کے اسے دھتکار دیا تھا۔ کیا دوست ایسے ہوتے ہیں؟ اس نے کرب سے سوچا۔

''اوئے اوئے چلو اٹھاؤ، اس کو۔'' اسی آواز نے کسی کو حکم دیا تو چند ہاتھوں نے اس کے جسم کو اٹھا کر الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔

یہ زنانی دریا میں بھلا کیا کر رہی تھی؟''

''شاید گر گئی ہو؟''

''لگتی اس پار کی ہے، ہماری طرف کی نہیں۔''

وہ مختلف آوازیں سن رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اب اس کا کیا ہوگا؟ کچھ ہی دیر میں اس پر غنودگی چھا گئی۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہ ہسپتال میں ہے۔ ہسپتال والوں نے اس کے پیٹ سے پانی نکالا، ہوش میں لائے تو اسے معلوم ہوا کہ اب وہ سرحد پار کے ملک میں ہے، جہاں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا اور وہ کسی کو جانتی تک نہیں تھی۔ اگلے دن اسے بڑے بڑے فوجی افسروں کے سامنے پیش کیا گیا، جنہوں نے اس پر تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''ہاں بی بی بول، تو کون ہے اور سرحد کے اس پار کیا کر رہی ہے؟ تجھے کس نے بھیجا ہے؟''

''میں کچھ نہیں جانتی جی۔ میں نے تو دریا میں چھلانگ لگائی تھی، مجھے نہیں پتہ میں یہاں کیسے پہنچ گئی ہوں۔'' وہ گھگھیانے لگی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آس پاس کھڑے باوردی سپاہی اس کے ساتھ کسی قسم کا لحاظ کرنے والے نہیں تھے۔ وہ تو محض اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔

"تجھے کچھ نہیں پتہ؟ او بی بی تو جانتی نہیں کہ تو اس وقت ہندوستانی علاقے میں ہے۔ سچ سچ بتا دے ورنہ....." ایک حوالدار نے اسے سختی سے جھنجھوڑا تو۔ سکینہ نے خوف سے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اپنی کہانی سنائی، بتایا کہ گھر میں اس کی کوئی عزت نہ تھی، سو اس نے سوچا شاید زندگی سے فرار میں ہی قرار مل جائے۔ اس نے دریا کی ایک موج بن جانے کی خواہش میں سوچے سمجھے بغیر چھلانگ لگا دی تھی اور بس۔

مگر کوئی اس کی کہانی پر یقین کرتا نظر نہ آ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں جی، میں واپس چلی جاتی ہوں..... مجھے پتہ نہیں تھا۔ مجھے میرے گاؤں بھیج دیں۔"

"سر یہ مجھے کوئی پاکستانی جاسوس لگتی ہے۔" ایک سپاہی نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔

"جسوس!" سکینہ کو جھرجھری سی آ گئی۔

"نہ جی نہ، میں تو سکینہ ہوں جی۔ مظفر آباد کے پرلی طرف کے چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی۔ میں کوئی جسوس وسوس نہیں ہوں جی۔" سکینہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کس نے بھیجا ہے تجھے؟ کسی ایجنسی نے یا کسی آتنک وادی گروپ نے؟"

"چلو چلو فی الحال اسے حوالات میں بند کر دو..... مقدمہ چلے گا تو عدالت فیصلہ کرے گی کہ اس غیر قانونی طور پر داخل ہونے والی کا کیا ہوگا۔"

سکینہ نے واسطے دیئے، خدا رسول کا نام لیا تو سپاہی کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "لے بھئی غلام محمد، تیری قوم ہے، تو ہی سمجھا اسے کہ زیادہ ڈرامے نہ کرے اور چپ کر کے بیٹھی رہے۔"

غلام محمد کھسیانی ہنسی کے ساتھ اٹھا اور سکینہ کے اردگرد گھوم پھر کے چکر لگانے لگا۔ "سوہنی تے بڑی اے۔" غلام محمد نے اپنے ڈنڈے سے اس کی ٹھوڑی اونچی کی اور اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"غلطی ہو گئی سرکار، مجھے واپس بھیج دیں۔ وہاں میرا گھر والا میرا انتظار کر رہا ہوگا جی۔"

حوالدار شیکھر نے رجسٹر بند کر دیا اور روتی کرلاتی سکینہ کو حوالات میں بند کرنے کا حکم دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

سرسبز جنگل کے بیچوں بیچ بہنے والا دریا دو دیسوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا تھا۔ اس کے شفاف پانی میں نہ جانے ایسے کتنے نمکین موتی بھی گھلے ہوئے تھے جو دریا کنارے رہنے والوں نے دوسرے پار رہنے والے سجنوں کی یاد میں بہائے تھے۔ اب سکینہ بھی اپنے گھر والوں، ہم وطنوں کی یاد میں دن رات روتی تھی، مگر دریا اس سے دور تھا اور حوالات کی کال کوٹھڑی اندھی، گونگی اور بہری۔ سکینہ دن رات یہی التجا کرتی کہ اسے اس کے گاؤں واپس جانے کی اجازت دے دی جائے مگر ان لوگوں کی بھی اپنی تکنیکی مجبوریاں تھیں۔ یہ تو سید حاساد اور اندازی کا کیس تھا، وہ کیا کرتے۔ بارڈر پار کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر اس طرف سے کوئی کتا بھی غلطی سے بھٹک کر اس طرف آ نکلتا تو کئی دن تک اس کی نگرانی کی جاتی۔ چھان بین ہوتی کہ کہیں کتے کے ذریعے دشمن کوئی جدید حساس خفیہ آلہ نہ استعمال کر رہا ہو۔

دوسری طرف والے بھی تقریباً ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کی طرف کوئی بھولا بھٹکا کتا آ نکلتا تو اسے برا بھلا کہہ کر وہ بھی اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لیتے۔ صرف پرندوں پر ہی دشمن کے ایجنٹ ہونے کا شک نہ کیا جاتا۔ چڑیاں، کوے، تتلیاں آزادانہ سرحد کے اس طرف والے درختوں، پودوں سے اڑ کر اس طرف جا بیٹھتیں اور پھدکتی پھرتیں۔ نہ کوئی چڑیا کلثوم تھی اور نہ کوئی سعیدہ، نہ وہ ہندو تھی نہ مسلمان، وہ تو بس چڑیا تھی اور خوش قسمت تھی سرحد کے دونوں طرف بلا ویزے آتی جاتی رہتی تھیں۔

سکینہ حوالات کی کھڑکی سے چڑیوں کو بارڈر پار اڑ کر جاتے دیکھتی تو حسرت سے اس کے دل میں دراڑیں پڑ جاتیں۔ اسے دریا پر غصہ آتا کہ اس نے اسے کیوں زندہ چھوڑ دیا تھا' وہ کیوں بچ گئی تھی۔ اب اس کی زندگی کی کسی کو کیا ضرورت تھی۔ دریا تو اس کا دکھ جانتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا دامن خالی تھا، گود ویران تھی، تو وہ اب جی کے کیا کرتی۔ دریا نے اسے اپنے اندر پناہ دینے کے بجائے باہر تھوک دیا تھا۔ کیسا وقت آن پڑا تھا کہ دریا بھی دوست نہ رہا تھا۔

حوالات کے تنگ و تاریک بوسیدہ کمرے میں قید گوری چٹی صحت مند جوان پاکستانی عورت چراغ کی طرح جھلملاتی تھی۔ مدتوں گھروں سے دور رہنے والے سپاہی عورت کے وجود کی خوشبو اپنے اتنے قریب پا کر خواہ مخواہ بات بے بات اونچا اونچا بولنے اور ہنسنے لگ گئے تھے۔ کبھی کبھی ان کا اسے گھورنے کے بعد کوئی ذومعنی جملہ سکینہ کے کان میں پڑ جاتا تو وہ دل

ہی دل میں ڈر جاتی۔ رال ٹپکاتے، بدصورت تھوتھنیوں والے کتوں سے اسے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا، مگر اب کیا کرتی، کتے بہانے بہانے سے اس کی کال کوٹھڑی کے قریب آ کر بھونکنے اور چکر لگانے لگے تھے۔

ایک روز کچھ عجیب ہوا۔ سکینہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کوئی اس کے علاوہ بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ''غلام محمد! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' سکینہ نے آدھی رات کے بعد اپنے کمرے میں کسی وجود کو پا کر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

''تسلی رکھ سکینہ بی بی! او میں تو تیرا ہمدرد' تیرا اپنا ہوں۔ ان سالوں کی بری نظر سے تجھے اب تک میں نے ہی تو بچا کر رکھا ہوا ہے۔ جھلیے تجھے کیا پتہ؟'' اس نے نرمی سے کہا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''اچھا!'' سکینہ نے فوراً ہی یقین کر لیا۔ ''شکریہ، بھائی غلام محمد! تو تو میرا اپنا ہی ہے نا..... بھائی میں یہاں سے کب چھوٹوں گی۔ مجھے چپکے سے سرحد پار کروا دو نا..... مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' سکینہ دل کی بات فوراً زبان پہ لے آئی۔

''او ڈرنے کی کیا بات ہے، سکینہ! میرے ہوتے ہوئے تو بس فکر نہ کر.....''

''اچھا بھائی! تیری مہربانی۔'' سکینہ نے چادر اپنے اوپر اور کس کے لے لی اور تشکر بھری نظروں سے اپنے ہمدرد کو دیکھنے لگی۔

''اچھا ایک بات سن ذرا..... ادھر کو آ نا میرے پاس۔'' غلام محمد نے اپنے دونوں بازو کھول دیے اور عجیب عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سکینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہاں غلام محمد نہیں بلکہ ایک بدصورت تھوتھنی والا کتا ہانپتا ہوا رال ٹپکا رہا تھا' ہمدرد دوست کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ سکینہ جھجک کر پیچھے ہٹی اور چیخنے کی کوشش کی مگر غلام محمد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔ کتے کے مضبوط طاقتور بپھرے ہوئے وجود کے آگے اس کی اپنی ہستی بے معنی ہو گئی۔ کتے نے اپنے شکار کو جھنجھوڑا، جھنجھوڑا اور پھر ریزہ ریزہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

باہر جنگل سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا اور دریا اپنی لہروں کو تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔ ستارے اپنی خمار آلود آنکھوں کو کبھی کھولتے اور کبھی جھپکتے تھے۔ سب مصروف تھے' کسی کے پاس

فرصت نہ تھی کہ وہ سکینہ کی مدد کو آئے اور اسے کسی حملہ آور سے بچائے۔

اس واقعے کے بعد سکینہ بالکل خاموش ہو گئی۔ اس سے کوئی بات کرتا تو سفید پھیکی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگتی یا یونہی بیٹھی ناخنوں سے فرش کریدتی رہتی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس پر ایک بہت بڑا مقدمہ بن چکا ہے اور جلد چھٹکارا ملنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ اب اسے بڑے شہر کے کسی بڑے جیل خانہ میں بھجوا دیا گیا تھا، جہاں اسے اپنے مقدمے کے فیصلے تک ٹھہرنا تھا۔

جیل کے زنانہ حصے میں ہر دم اپنی ہی سوچوں میں گم چپ رہنے والی پاکستانی عورت ہندوستانی قیدی عورتوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ وہ سوچتیں وہ یہاں کیوں اور کیسے پہنچی ہے۔ ان سے کچھ مختلف بھی دکھتی تھی۔ کبھی وہ فرش کو ناخنوں سے کریدتی اور کبھی نماز پڑھ کر زور شور سے دعائیں مانگتی نظر آتی تو عورتیں ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگ جاتیں۔ انہیں کبھی کبھار اس پر ترس بھی آتا کیونکہ اس کی کوئی ملاقات کبھی نہ آتی تھی۔ چند ایک آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو کر اس کے قریب جانے لگیں اور اس کی اسیری کے بارے میں اس سے سوال جواب کرنے لگیں تو سکینہ کا بھی کچھ دل لگنے لگا۔

اس روز جیل میں درگا دیوی کی پوجا کا بہت زیادہ پرشاد آیا تھا۔ ایک تھالی سکینہ کو بھی ملی تھی، جسے اس نے کلمہ پڑھ کر کھا لیا۔ اس میں موتی چور کے لڈو تھے جو اسے ہمیشہ بہت اچھے لگتے تھے مگر کھاتے ہی اس کی طبیعت کچھ عجیب سی ہو گئی اور وہ باقی عورتوں کو کھاتے پیتے، مسکراتے دیکھتے، حسب معمول اپنے پیر کے ناخن سے فرش کریدنے لگی۔ یکا یک اسے لگا زمین سے ایک ہری ہری کونپل پھوٹ رہی ہے۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں لپکا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او خدایا'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا کیونکہ یہ کونپل کہیں اور سے نہیں، اس کی اپنی کوکھ سے پھوٹ رہی تھی۔ ''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' لیکن وہ تو بانجھ تھی، تو کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ بانجھ نہیں تھی اور یونہی سسرال کے طعنے کھاتی رہی تھی۔ اس احساس نے اسے خوشی سے اتنا نہال کر دیا کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس کا ماں بننا کن حالات کے تحت ممکن ہوا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے قدرت کا انعام سمجھے یا سزا؟ ''لیکن میں نے تو کبھی

کوئی گناہ نہیں کیا تھا، سوائے خودکشی کی کوشش کے اور وہ بھی پوری تو نہیں ہوئی تو سزا کس بات کی؟
یہ نئی نرم، سبز پھوٹتی کونپل سورج کی پہلی کرن کی طرح اس کے وجود میں اجالا بھر رہی تھی۔ سکینہ کو ایک دم ڈر سا لگنے لگا۔ اب کیا ہوگا؟ اسی کشمکش میں چند ہفتے اور گزر گئے۔ اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ ساتھی قیدی عورتوں نے اپنے اپنے اندازے لگا کر اس سے معلومات حاصل کرنا چاہیں، مگر سکینہ خاموش رہی۔ ایک دو نے اسے طنزیہ انداز میں چھیڑا اور ایک دو نے بدحالی بھی دی مگر سکینہ چپ رہی۔

جیل کی سب سے بزرگ عورت مدھومیا کو خبر ملی تو وہ سکینہ کے پاس چلی آئی اور اس سے پیار سے پوچھنے لگی کہ ماجرا کیا ہے؟ مدھومیا نے سکینہ کی رام کہانی سن کر باقی سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور وہ سب اپنے اپنے کوارٹروں میں چلی گئیں۔ مدھومیا کی بزرگی کی وجہ سے اس کے آگے کوئی بھی زیادہ بک بک نہیں کرتی تھی۔

"پیٹ سے ہے ری پاکستانی؟" ایک عورت نے پاس آ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے پوچھا۔ اسے زیادہ تر عورتیں "پاکستانی" کہہ کر بلاتی تھیں۔

سکینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں چند اور بھی اس کے اردگرد جمع ہو گئیں اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"ارے تو پھر کیا ہوا۔ پیٹ میں بچہ ہے اور بھولی بنتی ہے۔" ایک نے کڑوا تیز جملہ بولا تو باقی سب قہقہہ مار کے ہنسنے لگیں۔

چلو دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے!" مدھومیا نے سب کو ڈانٹ کے بھگا دیا اور سکینہ کو پچکارنے لگی۔ "تو فکر نہ کر بٹیا۔ یہ سالی حرامزادیاں تو یونہی بکواس کرتی رہتی ہیں۔ برسوں سے اس جیل میں پڑی سڑ رہی ہیں نا تو بس یونہی دل جلانے کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ تو برا نہ ماننا ان کا۔"

"میں خوش بھی ہوں اور پریشان بھی میا۔" سکینہ نے میا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تو اگر چاہے تو..... اس کی خلاصی بھی کروائی جا سکتی ہے۔" مدھومیا نے کان پاس لا کر سرگوشی کی۔ "اس جیل میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں، میا! مجھے خلاصی نہیں چاہئے۔ یہ بچہ میرے بے قصور ہونے کا ثبوت ہے۔ میری آئندہ زندگی کے ساتھ کا رشتہ ہے..... اس کے سہارے میں باقی جیون کاٹ لوں گی۔"

سکینہ نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دھیمے انداز میں جواب دیا۔

"مگر بٹیا! یہ بلادکار کا بچہ ہے..... آخر تو دنیا والوں کو کیا جواب دے گی۔" میا نے اُسے حقیقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"میا یہ بچہ صرف میرا ہے، کسی اور کا نہیں۔ میں ہی اس کی ماں اور میں ہی اس کا باپ ہوں۔ حرام حلال کا مجھے نہیں پتہ۔ بس یہ میرا بچہ ہے اور کسی کا اس پر کوئی حق نہیں۔" سکینہ مضبوط لہجے میں بولتی چلی گئی۔ اسے احساس ہوا کہ زندگی میں پہلی بار وہ کسی انسان، کسی رشتہ کے بارے میں اتنی خود اعتمادی سے بات کر رہی تھی۔ اس سے پہلے تو اس کی زندگی اور اس کے معاملات کے فیصلے دوسرے ہی کرتے چلے آئے تھے۔ وہ تو بس خاموش تماشائی بن کر ہی جیتی رہی تھی۔

"میں اسے پالوں گی۔ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ اسے مجھ سے کوئی چھین نہ سکے گا۔ اللہ نے مجھے میری تنہائیوں کا سہارا دے دیا ہے۔ یہ میرے اپنے جسم کا ٹکڑا ہے..... میں اسے کیسے ختم کر دوں؟"

سکینہ کی بات چند ہی روز میں ساری جیل میں پھیل گئی۔ جیل کے اعلیٰ حکام کو بھی علم ہو چکا تھا کہ پاکستانی قیدی کی کہانی میں مزید الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے مجرم غلام محمد کے بارے میں اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس کی پکڑ ہوئی یا اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس پہ کیس ہوا یا کیس دبا دیا گیا؟ اس کو تو پرواہ بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک خوشی سی اس کے لہو میں گردش کرتی رہتی تھی کہ آخر کار وہ بے معنی، بے مقصد کے بجائے ایک کارآمد زندگی گزارنے جا رہی ہے۔ وہ زندگی جو اب کسی کے کام آئے گی۔ اس کونپل کو بیل کو سینچ کر وہ ایک تناور درخت کی صورت میں دیکھے گی۔ 'ماں' کا میٹھا بول سنے گی۔ کتنا اچھا لگے گا اسے یہ سب کچھ۔ اب وہ خود میں ہر چٹان سے ٹکر لینے کی طاقت محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اب پہلے والی بزدل، کمزور سکینہ نہیں بلکہ کوئی نئی عورت ہے۔ ولولوں اور ارادوں سے بھرپور، ہر طرح سے مکمل۔

جیل کی قیدی خواتین اب اس سے کچھ نرمی برتنے لگی تھیں۔ اس کی صحت کا خیال رکھا جانے لگا اور اس سے زیادہ مشقت کے کام بھی نہ کروائے جاتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی دل جلی یہ کہہ کر طنز بھی کر جاتی "مسلی کے پیٹ میں مسلے کا ہی بیج ہے تو پھر پریشانی کیسی؟ اپنا ہی خون ہے تو مسئلہ کیا ہے؟ کم از کم کسی ہندو پرش کو تو اس پاپ کا ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔" سکینہ یہ سن کر خاموش رہ

جاتی۔ اس کے مقدمے کا فیصلہ تو التوا میں ہی پڑتا چلا جا رہا تھا۔ نو چاند چڑھتے ڈھلتے دیکھتے سکینہ کے جسم میں کتنی نئی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور پھر بالآخر وہ مبارک دن بھی آ ہی گیا جس روز سکینہ کی سبز کونپل پھول بن کر ہمیشہ کے لیے اس کے دامن میں مہکنے کے لیے چلی آئی۔

سکینہ نے اس پھول کا نام بیبن رکھا کیونکہ بیبن اس کی ماں کا نام تھا اور ماں سکینہ کو بہت یاد آتی تھی۔ پتہ نہیں کس حال میں تھی وہ۔ کتنے دور ہو گئے تھے پیار بھرے رشتے اس سے، مگر اب یہ جو نیا رشتہ اس کی زندگی میں آیا تھا اسے سب سے توانا، خوبصورت اور اہم محسوس ہونے لگا تھا۔

"یہ میری ماں، بہن، سہیلی، بیٹی سبھی کچھ ہے..... میری پیاری بیبن۔" سکینہ اپنی ننھی بنیا کو چوم چوم کر نڈھال کر دیتی تو جیل کی ساتھی عورتیں اس کی دیوانگی پر ہنسنے لگ جاتیں۔

"اسے لے کر جائے گی تو گھر والوں سے کیا کہے گی؟" کبھی کبھار کوئی اسے حقیقت کی دنیا میں گھسیٹ لاتی تو سکینہ پل بھر کو ساکت ہو جاتی۔

"میرا سرور بہت اچھا ہے۔ بڑا پیار ہے اسے مجھ سے۔ بس میں اس کی گود میں بچے کو ڈال کر کہوں گی۔ یہ ہمارا بچہ ہے۔ ہم دونوں کا۔ شاید وہ..... شاید اس کا دل نرم ہو جائے!"

"اگر تجھ سے اتنا پیار کرتا تھا تو اسے چھوڑ کر دریا میں کیوں کودی تھی؟" کسی نے فقرہ چست کیا تو دوسری بھی ہنسنے لگیں۔ سکینہ خاموش ہو گئی اور سوچنے لگی، واقعی کہتی تو یہ ٹھیک ہیں۔ پتہ نہیں وہ سچ مچ مجھ سے پیار کرتا بھی تھا یا بس..... میرا وہم تھا۔

دن گزرتے گئے۔ سکینہ کا کیس لمبا اور پیچیدہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو بیبن پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی اور ساری جیل والیاں اس سے پیار کرنے لگی تھیں۔ کوئی اس کی ماسی تھی تو کوئی بوا، کوئی نانی تو کوئی دادی بن چکی تھی۔ بیٹی کا خوبصورت ساتھ پا کر سکینہ کو جیل بھی گھر کی طرح لگنے لگی تھی، مگر کبھی کبھار نہ جانے کہاں سے اڑ کر کوئی چڑیا یا کوا جیل کی منڈیروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگتا تو سکینہ کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔

"کیا خبر یہ میرے دیس سے آیا ہو؟ کوئی سندیسہ لایا ہو..... کیا خبر مجھے کوئی سرحد پار یاد کرتا ہو اور میرا انتظار کرتا ہو۔"

ماں کے کبھی کبھار بھول بھٹک کے آ جانے والے خطوں سے اسے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ اس کا ابا اس دنیا میں نہیں رہا تھا مگر اماں نے سرور اور باقی سسرال والوں کے بارے میں کبھی

نہیں بتایا تھا کہ وہ کس حال میں ہیں اور اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس نے جب بھی پوچھا اماں ان کا ذکر ہی گول کر گئی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اماں نے اس کی ببین کے جنم کی خبر سن کر بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کبھی اس کے بارے میں پوچھا تک نہیں، یوں جیسے اس کا ذکر نہ کر کے اس کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہو۔ سکینہ کا دل کڑھتا مگر پھر وہ سوچتی۔ اماں جب ببین کا چاند سا مکھڑا دیکھے گی تو خود ہی اس پر فریفتہ ہو جائے گی۔ مگر نہ جانے وہ مبارک دن کب آئے گا، جب ببین اور میں اپنے پاک وطن کو لوٹ سکیں گی۔

"سکینہ بی بی، یہ تمہارے دیس سے آئے ہیں، برنی صاحب۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" ایک روز جیلر نے اسے اپنے آفس بلوا بھیجا۔ اس نے دیکھا کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا شفیق چہرے والا شخص بیٹھا اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سلام صاحب جی!" اس کا ہاتھ بے اختیار ماتھے تک چلا گیا۔

اس کے ساتھ کھڑی ببین ایک اجنبی مرد کو دیکھ کر سکینہ کے پہلو میں گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ ہے تمہاری بیٹی؟" برنی صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"جی صاحب جی! سلام کر ببین ان کو....." سکینہ نے ببین سے کہا۔

"دیکھو سکینہ میں تمہارے کیس پر کام کر رہا ہوں..... مجھے تم نے ہر بات صاف صاف بتائی ہے، کچھ بھی چھپانا نہیں۔"

"جی صاحب جی" سکینہ نے نظریں جھکا کر بے اختیار ناخن سے فرش کو کریدنا شروع کر دیا شاید آزادی کی کوئی کونپل پھوٹنے والی ہو، اس کے دل میں خوش رنگ غنچے سے چٹخنے لگے۔ شاید اب میں گھر جا سکوں۔ اس نے سوچا۔

"صاحب جی! میں کب گھر جاؤں گی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے یہاں بند ہوئے۔"

"دیکھو سکینہ! یہ انسانی حقوق کی ایک تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اخبار کا جرنلسٹ ہوں، ان کے ساتھ ہی کام کرتا ہوں۔ ہم لوگ تمہیں جلد سے جلد رہائی دلوانا چاہتے ہیں، لیکن مسئلہ تمہاری اس بچی کا ہے....." برنی صاحب کے ساتھی نے کہا۔

"بڑے دن ہو گئے ہیں جی صاحب جی گھر گئے ہوئے۔" سکینہ کی آواز بھرانے لگی۔

''پانچ سال'' جیلر لیڈی نے برنی صاحب سے انگلش میں کچھ کہا اور پھر آگے کی گفتگو انگلش میں ہی ہونے لگی۔ سکینہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گفتگو اس کی بیٹی مبین کے بارے میں ہی ہو رہی ہے۔

''تو میڈم جی مسئلہ کیا ہے؟'' سکینہ نے بھولپن سے جیلر لیڈی سے سوال کیا۔ ''مبین میری بیٹی ہے، میں نے اس کو جنا ہے، یہ میرے بدن کا حصہ ہے، کوئی غیر تو نہیں۔''

''تجھے کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ تیری بچی ہندوستانی شہری ہے اور تو پاکستانی۔ یہ وہاں نہیں جا سکتی اور نہ ہی قانونی طور پر رہ سکتی ہے۔ تجھے سمجھ کیوں نہیں آتی؟''

''تو پھر ٹھیک ہے میڈم جی! میں ساری عمر اسی جیل میں گزار دوں گی۔ اگر کسی نے مجھے اور مبین کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو میں تو اپنی جان دیدوں گی۔'' سکینہ نے جذباتی انداز میں مبین کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور آنسو بہانے لگی۔

اس رات دال روٹی کھاتے ہوئے سکینہ کو بار بار ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے حلق میں نوالہ پھنس رہا ہو۔ کچھ نگلا ہی نہیں جا رہا تھا، مگر وہ پھر بھی زبردستی کھانا کھاتی رہی کیونکہ اس کی تقلید میں آ کر مبین بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتی تو سکینہ کو گوارا نہ ہوتا۔

برنی صاحب کو برسوں سے التوا میں پڑے ہوئے کیس کو حل کروانے میں از حد دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، اس لیے وہ اور انسانی حقوق کی ہم خیال تنظیمیں اب اس کہانی کو کسی انجام تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ حکومتیں اپنے اپنے پچ پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ حقیقتوں کی سنگینی کے نیزے بھالے میدان جنگ میں اتارے جا رہے تھے اور برنی صاحب انسانیت کا ٹرمپ کارڈ استعمال کر کے سکینہ اور اس کی بیٹی کو بازی جتوانا چاہتے تھے۔

سکینہ مبین کو یہ یاد دلاتی رہتی کہ وہ مسلمان ہیں، ان کا دھرم یہ نہیں ہے جو جیل والیوں کا ہے۔ جب سے مبین نے پاکستان واپس جانے، اپنے خاندان سے ملنے کی باتیں سنی تھیں، اس کا ننھا سا دل مشتاق اور حیران حیران سا رہنے لگ گیا تھا۔ وہ سوچتی کتنا سندر ہوگا آخر میری ماں کا وہ دیس جس کی یاد میں وہ تڑپتی ہے اور واپس جانے کو بے قرار ہوتی ہے۔ اسے اچھا لگتا، جب وہ سوچتی کہ ایک اور جہان اس کا منتظر ہے کہ وہ آئے اور آ کے اس میں سما جائے، اس کا حصہ بن جائے۔

مبین جیل میں ہی بڑی ہوئی تھی اس لیے وہ اپنے اردگرد ہونے والی لوجا پاٹ...

لگوا کر با قاعدہ حصہ لیتی' بھجن گاتی تو سکینہ اسے نہ روکتی۔ ایک تو اس طرح مبین اس ماحول کا حصہ بن کر خوش رہتی تھی، دوسرے یہ کہ جیل کی دیگر قیدی عورتیں بھی اسے اپنی بچے ہی کی طرح سمجھتی تھیں۔ اگر وہ اسے ان سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتی تو مبین کا وہاں رہنا اتنا آسان نہ رہتا اور انہیں کئی قسم کی مشکلات اور تعصبات کا سامنا کرنا پڑتا۔

سکینہ اپنے طور پر، دل ہی دل میں گاؤں کے مولوی صاحب کے سکھائے ہوئے سبق کو یاد کرنے کی کوشش کرتی رہتی تاکہ وہ بھول نہ جائے کہ وہ کون تھی، کون ہے، کہاں سے آئی تھی اور کہاں واپس لوٹ کے جانا ہے۔

ایک روز نہ جانے کیسے ایک نئے رنگ کا چمکتا سورج طلوع ہوا۔ سکینہ کو وہ خبر مل گئی جس کا اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔ حکومتوں کی مصلحتوں نے گھٹنے ٹیک دیے اور انسانیت جیت گئی۔ سکینہ کا تو خوشی سے برا حال تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا جیل کے آنگن میں ڈھول بجے اور وہ دل کھول کر ناچے۔

مبین اور سکینہ نے جب جیل چھوڑی تو سب ساتھی عورتیں رو رہی تھیں۔ کوئی خوشی سے اور کوئی ان سے بچھڑنے کے غم سے۔ کوئی ماتھا چوم رہی تھی، تو کوئی سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کوئی اپنے پاس سے کوئی چیز نشانی کے طور پر دینے کے لیے نکال لائی تھی تو کوئی اپنا پتہ ہاتھ میں تھما کر خط لکھنے کا وعدہ لے رہی تھی۔ مبین نے تو جب سے آنکھ کھولی تھی اس جیل کو ہی اپنا گھر سمجھا تھا۔ وہی عورتیں اس کی رشتہ دار تھیں، اس لیے وہ سب کو پیار کر کے وعدے کر رہی تھی کہ وہ ان سے ملنے ضرور آئے گی، انہیں کبھی نہیں بھلائے گی۔

برنی صاحب کے دفتر نے سکینہ کے شوہر کو رابطہ کر کے بتا دیا تھا کہ سکینہ چھوٹ کے واپس آ رہی ہے مگر سکینہ کے دل میں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ کیا پتہ سرور بدل گیا ہو؟ مجھے لینے ہی نہ آئے۔ کیا پتہ؟

واہگہ بارڈر کراس کروا کے برنی صاحب نے کچھ دیر انتظار کیا۔ حسب توقع سکینہ کا شوہر اسے لینے نہیں آیا تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔

''اماں چاچی کہاں ہیں؟ ہم کس کے ساتھ گھر جائیں گے؟'' مبین کے معصوم سوالوں کا سکینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یکدم دور سے نظر آنے والا ایک شناسا چہرہ قریب آتا چلا گیا تو سکینہ کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ [illegible]

"او میرے کاکے..... میرے ویر..... تو کتنا بڑا ہو گیا ہے۔" سکینہ نے بار بار اس کا ماتھا چوما اور یقین نہ آنے والی کیفیت سے نکلنے کے لیے بار بار اپنے سر کو جھٹکا دینے لگی۔ یہ وہی چھوٹا بھائی تھا جسے اس نے گودوں کھلایا تھا۔ اس کا گوموت صاف کیا تھا، ساتھ سلایا۔ کاکا بھی آپا کو دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

سلام کر مبین! یہ تیرے ماما جی ہیں!" سکینہ نے اپنے پیچھے چھپی مبین کو آگے لا کھڑا کیا۔

"سلام ماما جی!" ننھے ننھے ہاتھ ماتھے تک چلے گئے۔ کاکا یوں پیچھے ہٹا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

"تو اس گند کو بھی ساتھ لے آئی ہے؟" کاکا غصے سے دانت پیسنے لگا۔ "میں نے تو سمجھا تھا..... صاحب جی۔ یہ کیا؟ آپ نے تو خط میں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہندوؤں کی بچی بھی ساتھ ہوگی۔"

وہ برنی صاحب کی طرف شاکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کاکے یہ ہندوؤں کی بچی نہیں ہے۔ یہ میری اولاد ہے، صرف میری۔ میرا خون ہے یہ، میں اسے کیسے پیچھے چھوڑ کر آ سکتی تھی؟" سکینہ نے کاکے کے آگے ہاتھ جوڑ دیے مگر کاکا ان دونوں ماں بیٹی سے منہ پھیرے کھڑا رہا، یوں جیسے وہ کوئی غلیظ، کریہہ چیزیں ہوں اور وہ انہیں دیکھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو۔ برنی صاحب اسے ایک کونے میں لے گئے اور آدھ گھنٹے تک نہ جانے کیا سمجھاتے رہے کہ کاکا منہ بنا کر اپنی آپا کے پاس چلا آیا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کر دیا۔

واہگہ بارڈر پر آئی ہوئی خواتین کی این جی اوز کے نمائندوں نے ان دونوں ماں بیٹی کو آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیے۔ پریس والوں نے کھٹا کھٹ تصویریں کھینچیں اور رپورٹروں نے نوٹ بکیں سنبھال لیں۔ چند خواتین نے مبین کو بسکٹوں، ٹافیوں اور دیگر تحائف کے ڈبے دیے تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے اپنا نیا وطن پسند آ گیا تھا، جہاں قدم رکھتے ہی اس پر اتنی نوازشات کی برسات ہونے لگی تھی۔

مظفر آباد کی بس سے اترتے ہی مبین نے سوالات شروع کر دیے، "اماں گھر آ گیا! اماں ماما ہمیں کہاں لیے جا رہا ہے؟" سکینہ نے اس کو مختصر جواب دے کر خاموش کرنا چاہا مگر وہ بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جیل کی چار دیواری سے باہر کی دنیا ایسی ہوتی ہے؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ سکینہ بھی برسوں بعد ملنے والی آزادی کی خوشی سے سرشار تیز تیز قدم اٹھاتے بھائی کے پیچھے چلتی

جا رہی تھی مگر کاکا تو چپ ہی ہو گیا تھا۔ سوائے ہوں ہاں کے کسی بات کا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔

''اماں میں تیری بچی ہوں نا؟'' مبین نے سوال کیا۔

''ہاں میری بچی، تو میری جان ہے، میرے کلیجے کا ٹکڑا۔''

''مگر ماما تو کہہ رہا تھا میں ہندو کی بچی ہوں۔'' مبین نے ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سکینہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

اب وہ دریا کے قریب سے گزر رہے تھے۔ سرسبز وادی کی گود میں دریائے جہلم اسی شان و شوکت، اسی کروفر سے بہہ رہا تھا جیسے پہلے بہتا تھا۔ یہ وہی ظالم ہے، جس کی گہرائیوں سے میں نے پناہ کے موتی تلاش کرنا چاہے تو اس سفاک نے مجھے پناہ دینے کی بجائے بے رحمی سے دھتکار دیا تھا۔ سکینہ نے شکوہ بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اسے خیال آیا اگر دریا مجھ پر ظلم نہ کرتا تو مبین کہاں سے آتی؟ میری مبین، میری بچی۔ اس فرحت بخش خیال کے آتے ہی سکینہ کے چہرے پہ ممتا کا نور پھیل گیا اور مبین کے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ سکینہ کی نظریں بہتے ہوئے دریا پر دوبارہ جا ٹکیں۔ کنارے چلتے چلتے اسے ایسا لگا جیسے یہ وہ دریا ہی نہیں تھا جس میں وہ کودی تھی۔ یہ دریا وہ والا ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ہر دریا کے پانی تبدیل ہوتے رہتے ہیں بھنور نئے نئے گول دائروں میں قید ہوتے جاتے ہیں۔ لہریں ہر بار نئے نئے انداز سے اٹھلاتی ہیں اور کنارے چلنے والوں کے عکس لمحہ لمحہ مختلف ہوتے نظر آتے ہیں۔ اب اگر وہ اس دریا میں قدم رکھتی تو نہ تو وہی پانی ہوتا، اور نہ ہی وہ مانوس لمحہ جس میں اس نے پہلے پہل طوفانوں کی زور آوری کو آزمایا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی دریا تھا۔

مبین نے دریا کنارے اگی ہوئی پیلے پھولوں کی جھاڑی سے ایک پھول توڑ لیا اور اسے ہاتھ میں نچا نچا کر خوش ہونے لگی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر کاکے کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ خشمگیں نگاہوں سے بچی کو دیکھ کر بولا: ''جلدی کر کڑیئے، گھر بھی اپڑنا ہے۔'' مبین سہم کر ماں سے چپک گئی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

سکینہ نے ایک بار پھر دریا کو دیکھا، اب اسے یقین ہو گیا کہ اسے زندگی بھر ایک اور ہی دریا کا سامنا کرتے رہنا پڑے گا۔ ایسا دریا جو ہمیشہ اس کے سامنے بچھا رہے گا۔

ہمیشہ اس کے مدمقابل ہو گا۔

▼▲▼▲▼▲▼

نہ کسی کی آنکھ کا نور

''السلام علیکم منے بھائی۔'' کوئی میرے پیچھے سے آ کر مجھ سے پر جوش انداز میں بغلگیر ہو گیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میری گردن ہل ہی نہ پائی۔ کسی نے مجھے میرے بچپن کے نام سے پکارا اور وہ بھی یہاں امریکہ کے اس دور دراز شہر بالٹی مور میری لینڈ میں؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے کہ اس نے اچانک اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ میرے سامنے میرے بچپن کا دوست صغیر کھڑا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے تقریباً بیس سال ہو گئے تھے مگر پھر بھی اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور تین بچے بھی تھے۔

''اوئے سگو تو یہاں کہاں؟'' میں نے بھی اسے لپٹاتے ہوئے مسرت سے کہا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں ہمارا کرشن نگر کی گلیوں میں بتایا ہوا بچپن گھوم گیا۔ آوارہ گردیاں، محلے کی لڑکیوں سے عشق مشوکیاں، ہماری پتنگ بازی اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ بس یار قسمت ہمیں بھی یہاں لے آئی اور کیا؟ پنچھیوں کا کیا ہے؟ جہاں دانہ پانی لکھا ہو وہیں اڑ کے چلے جاتے ہیں اور تو سنا سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ بال بچے کیسے ہیں، کہاں ہیں؟'' وہ سوالات کرتا جا رہا تھا اور میں جلدی جلدی ان کے جواب دے رہا تھا کیونکہ شاپنگ مال کے باہر پارکنگ لاٹ میں میری بیوی ذکیہ اور بچے میرا انتظار کر رہے تھے اور ان کے فون پہ فون آ رہے تھے کہ جلدی آئیں گھر جانا ہے، دیر ہو رہی ہے۔

میں نے اسے اپنے گھر کا فون نمبر اور پتہ بتایا اور اگلے ویک اینڈ پہ آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس سے مل کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی اس لیے وقت بمشکل ہی کٹا اور پھر ہفتے کے روز سکو اور اس کی فیملی ہمارے ہاں دوپہر کے کھانے پہ چلے آئے۔ میں نے اپنے بچوں نما اور رازی کا سکو سے تعارف کروایا تو سکو نے بھی اپنے بچوں کو سامنے بلا کر سب سے ملوایا۔

''یہ رضیہ ہے، یہ فرقان اور یہ ہمارا خاص بچہ شمس الرحمٰن!'' میں نے صغیر کے وہیل چیئر پہ بیٹھے ہوئے بارہ تیرہ برس کے بیٹے کو بغور دیکھا، کتنا خوبصورت بچہ تھا وہ۔ یوں جیسے اسے دنیا کی کسی آلودگی نے کبھی چھوا نہ ہو، جیسے وہ نیا نکور ہو اور اس نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ ایک اطمینان بھری پاکیزگی اس کے چہرے پہ کھلتی اور آنکھوں سے معصومیت چھلکتی تھی۔

''کیا حال ہے بیٹے؟'' میں نے شمس کو خاص طور پہ پیار کر کے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں کو پیچھے کیا۔

''بالکل ٹھیک جی'' وہ مسکرایا۔ مجھے اس کا ٹھیٹھ پنجابی لاہوری لہجہ بڑا دلچسپ لگا۔ ''یہ ہمارا فرشتہ ہے، ہمارا خاص بچہ۔'' صغیر نے بھی اسے ہولے سے تھپکتے ہوئے کہا اور ذکیہ کی طرف پیار سے دیکھا۔

ہم نے ایک دوسرے کے بچوں کو پیار کیا، نام پوچھے اور انہیں آپس میں ایک جگہ بیٹھ کر ملتے جلتے دیکھ کر خود ڈائننگ ٹیبل پہ آ بیٹھے۔ بچوں کو زبان کا مسئلہ درپیش آ رہا تھا۔ میرے بچے پیدائشی امریکن ہونے کی وجہ سے زیادہ تر انگریزی میں بات کرنے کے عادی تھے اور صغیر کے بچے نئے نئے پاکستان سے آنے کی وجہ سے صرف پنجابی ہی بول سکتے تھے۔ ہم انہیں زبانیں مکس کر کے بولتے دیکھ کر ہنسنے لگے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے آپس میں مصروف ہو گئے۔

''یار سکو تیرے آنے سے اپنا بچپن لوٹ آیا ہے۔'' میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے کہا تو اس نے بھی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم لوگ گھنٹوں، گزرے دنوں کے قصے کہانیاں کہتے سنتے رہے۔ ہم دونوں کی بیویاں ہماری حماقتیں سن کر ہنستی رہیں اور ہمارے بچے ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے کھیلتے، اچھلتے کودتے دوست بن گئے۔

''ہاں یار یہ تو تم نے بتایا نہیں کہ تم لوگ آئے کب؟'' میں نے صغیر سے پوچھا۔ ''اب

تو تقریباً چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ تھوڑا بہت گھر سیٹ کر لیا ہے، بچے سکولوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن کا سپیشل سکول میں داخلہ ہو گیا ہے۔ بس ابھی ان کی انگریزی ذرا کمزور ہے اس لیے تھوڑا بہت مسئلہ ہے، مگر پھر بھی یار اللہ کا بہت شکر ہے۔'' صغیر ایک ذمہ دار شکر باپ کی طرح بولا۔ ہم لوگ آئندہ جلد ملنے کا پروگرام بنا کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک روز صغیر نے مجھے فون کر کے خاص طور پر اپنے گھر آنے کو کہا تو میں کام کے بعد سیدھا وہیں چلا گیا اور بیوی کو فون کر دیا کہ ڈنر پہ میرا انتظار نہ کریں۔ صغیر کے گھر گھستے ہی مجھے چاروں طرف بندھا ہوا سامان، سوٹ کیس اور پیک شدہ کارٹن نظر آئے تو میں نے حیران ہو کر اس کی بیوی سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟

''کیا آپ لوگ کہیں اور شفٹ ہو رہے ہیں؟''

''جی ہاں بھائی جان۔'' اس کی بیوی ثمینہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''پاکستان۔'' صغیر نے مختصر جواب دیا۔

''اچھا، مگر کیوں؟ میرا تو خیال تھا آپ لوگ اب یہیں رہیں گے۔''

''یار تجھ سے کیا چھپانا، ہم لوگ تو یہاں شمس الرحمٰن کے لیے آئے تھے۔ تجھے تو پتہ ہے معذور بچہ کتنی بڑی ذمہ داری ہوتا ہے۔ ہماری لائف بڑی ڈسٹرب تھی اس کی وجہ سے۔ ہم نے سوچا امریکہ جا کر اسے کہیں داخل کروا دیتے ہیں۔ تجھے تو پتہ ہے یہاں کے سسٹم کتنے ہیں۔ پاکستان میں تو اس کی معذوری کی وجہ سے ہم بڑے پھنس گئے تھے۔

''میں کچھ سمجھا نہیں'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی صاحب ہمارے شمس الرحمٰن کو ہینڈی کیپ ہونے کی وجہ سے سٹیٹ آف میری لینڈ نے اپنی ذمہ داری بنا لیا ہے۔ اسے یہاں ایک انسٹی ٹیوٹ میں رہائش، علاج، تعلیم سب کچھ ملے گا اور وہ بھی سرکاری خرچ پر ہے نا خوش قسمتی کی بات؟'' اس کی بیوی ثمینہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''بس ہم لوگ چند ہی روز میں پاکستان چلے جائیں گے۔ یار اپنے نارمل بچوں کو سنبھالیں، ان بے چاروں کو تو شمس الرحمان کی وجہ سے ہم لوگ پوری توجہ ہی نہیں دے پاتے

تھے۔ اپنا کاروبار ہے وہاں۔ بس اب جانا ہی ہوگا۔''

''ہمیں کیا ضرورت ہے کافروں کے ملک میں رہنے کی۔'' ثمینہ نے تنک کر کہا۔ بس ہمارا بچہ ٹھیک جگہ پہنچ گیا اب ہمیں کوئی فکر نہیں اللہ اس کا نگہبان ہو، سوہنے رب نے اس کے لیے خود ہی سوہنا انتظام کر دیا ہے۔'' ثمینہ نے تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ اسی لمحے نہ جانے کہاں سے چڑچڑاہٹ کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا شمس الرحمٰن غصے بھری نگاہوں سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ''انکل انکل میں اِتھے کلے نئیں رہنا، امی ابو مینوں چھڈ کے پاکستان چلے نیں، میں اِتھے نئیں رہنا۔ مینوں وی نال لے جاؤ۔''

بچے کی یہ حالت دیکھ کر میرے ماتھے پہ بھی بل آ گئے۔ ''یار صغیر بچہ یہاں نہیں رہنا چاہتا تو تم کیوں اسے چھوڑ کر جا رہے ہو، یہ بات ٹھیک نہیں ہے یار۔''

''میری بات سن، منے بھائی'' دیکھو ہم اسے سمجھا رہے ہیں کہ اس کی خاص دیکھ بھال، میڈیکل چیک اپ، سکولنگ، رہائش سب کچھ بہترین ہوگی۔ یہ تو خوش قسمت ہے پاکستان میں اس کی کوئی لائف، کوئی فیوچر نہیں ہوگا۔ یہاں تو معذور افراد بھی معاشرے کا اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ نہ بھئی اس کے لیے بہتر ہے کہ یہیں رہے۔ اس بیوقوف کو نہیں پتہ کہ اس کی تو لائف بن جائے گی۔ ویسے بھی ہم سب کا وزٹ ویزا ختم ہونے والا ہے۔ ہم لوگ اب یہاں رہ ہی نہیں سکتے تو مجبوری ہے نا۔'' صغیر نے وضاحت کی۔

صغیر اور اس کی بیوی نے مجھے اور ذکیہ کو اگلے روز خاص طور پر ان کے گھر آنے کی تاکید کی تاکہ ہم سب مل کر شمس الرحمٰن کو اس کے نئے گھر یا سٹل پہنچا آئیں۔ ہم سب لوگ دن کے تقریباً بارہ بجے انسٹیٹیوٹ پہنچ گئے اور ویٹنگ ایریا میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

''دیکھا کتنی سہولیات ہیں یہاں۔'' صغیر مستعد عملے کو ادھر سے ادھر جاتا، صاف ستھرے ماحول میں کام کرتا دیکھ کر خوشی سے کہنے لگا۔ اللہ کرے میرے پتر کا اچھی طرح خیال کریں یہ لوگ۔'' شمس الرحمٰن کی ماں کے چہرے پہ اداسی کی ایک سانولی سی پرچھائیں نظر آئی۔ مگر پھر جلد ہی غائب ہوگئی۔

''او ثمینہ تو فکر نہ کر۔ ان گوروں کے پاس بہت پیسہ ہے اور پیسہ ہو تو زندگی کی ہر سہولت خریدی جا سکتی ہے۔ انہیں کون سی تنگی ہے کہ وہ اپنے ہاں داخل ہونے والے بچوں کا خیال نہ

رکھیں۔ یہ کوئی پاکستان تھوڑا ہی ہے۔"

صفیر نے اسے مزید تسلی دی تو ثمینہ مطمئن ہو کر شس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی جو ایک خوفزدہ بلونگڑے کی طرح ادھر سے ادھر دیکھ کر ہولے ہولے سسکیاں لے رہا تھا۔ ثمینہ نے آیت الکرسی والا تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیا اور دعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکیں مارنے لگی۔

"بس میرا پتر حوصلے نال رہنا اے توں" ماں نے پچکارا تو بیٹا زور زور سے رونے لگا۔

"کیا ملک ہے یار۔ ہر چیز اتنے قاعدے، سسٹم سے ہوتی ہے کہ بس۔" صفیر نے کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تبصرہ کیا۔

"ابا مینوں چھڈ کے نہ جا۔ میں ایتھے نہیں رہنا۔" شس نے وہیل چیئر کو زور زور سے ہلا کر بلکنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو نرسیں دوڑی دوڑی آئیں اور آ کر شس کو انگریزی میں پیار سے پچکار کر کہنے لگیں۔

"سویٹ ہارٹ گھبراؤ نہیں یہ تمہارا اپنا گھر ہے یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارے جیسے اور بھی بچے ہیں۔ ان سے دوستی ہو جائے گی تو تم بڑا انجوائے کرو گے۔"

نرس نے دوسرے کیمپ بچوں کی طرف سے شس کے لیے بنائے گئے ویلکم کارڈز اور ننھے ننھے تحائف کے ڈبے شس کی گود میں لا کر رکھ دیے مگر شس کو اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ ہی اسے سمجھ آ رہی تھی کہ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ نرسوں کے امریکن لب و لہجے میں بولی جانے والی انگلش اس کے بالکل بھی پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے چیخنے چلانے سے ڈسٹرب ہو کر ایک اور نئے داخل ہونے والے بچے نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ یہ بچہ شس کے برعکس ذہنی طور پر معذور تھا۔ اس کی ناک سے بہتا پانی اور رال اس کا چہرہ خراب کرنے لگے تو نرس نے مادرانہ شفقت سے اس کا چہرہ ٹشو سے صاف کیا اور اسے بازوؤں میں بھر کر بچ بچ کرنے لگی۔

"دیکھیا کنی اچھی طرح اے نویاں ماںواں تیرا خیال رکھن گیاں۔"

شس کی ماں نے بیٹے کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ وقت رخصت قریب تھا ہم سب نے اسے باری باری پیار کیا اور وقت ختم ہونے پر وہاں سے چلنے لگے۔ شس کے پھیلے ہوئے بازو اور دلدوز چیخوں نے طبیعت بوجھل اور مکدر کر دی تھی اس لیے ہم سب خاموشی سے وہاں سے لوٹ آئے۔ ہم ایک دوسرے سے یوں نظریں چرا رہے تھے جیسے مجرم اور گنہگار ہوں۔

چند دنوں بعد صغیر اپنے بال بچوں کو لے کر پاکستان واپس لوٹ گیا اور پھر مجھے مدتوں اس کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ میں اور میری بیوی کئی بار شمس الرحمٰن کو یاد کرتے اور اس کی باتیں کرتے۔ کبھی جی چاہتا اسے جا کر دیکھیں کہ وہ کس حال میں ہے مگر سچی بات ہے ہمارا حوصلہ ہی نہ پڑتا اور نہ کبھی وقت ملتا۔ بس ہم ٹال مٹول کر رہ جاتے۔ پھر یہ بھی خیال آتا کہیں وہ ہمیں دیکھ کر ہمارے ساتھ جانے کی ضد ہی نہ کر دے۔ ایسا ہوا تو ہم لوگ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے ہم کسی کا بچہ اپنے گھر میں تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ اتنا بڑا دل یا گھر تو ہمارا ابھی نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ ہماری نہیں اپنے ماں باپ کی ذمہ داری تھا۔ انہی کا فرض اور حق بنتا تھا کہ وہ اسے سنبھالیں، پالیں، جیسے چاہے رکھیں یا پھینک دیں۔

اور پھر اچانک ایک روز ہمیں کہیں سے صغیر کا ٹیلی فون آ گیا وہ پھر ہمارے شہر میں آیا ہوا تھا اور ہم سے ملنے کی خواہش کر رہا تھا۔ ہم تو اسے اور اس کی فیملی کو تقریباً بھول ہی چکے تھے مگر اس کے فون نے پھر سے شمس الرحمٰن کی یاد تازہ کر دی۔

''سب ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے اس سے بڑا سرسری مگر گہرا سوال کیا۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے، بس یار مل کر بتاؤں گا۔''

اس نے جواب دیا اور میں نے اگلے ویک اینڈ پہ اسے گھر آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ فروری کی اکتا دینے والی سردی کے ٹھنڈے اداس اور منجمد دن تھے۔ برف کے طوفان تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ درخت سفید لبادے اوڑھے ہونقوں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ بہار دور تھی اور دل منتظر کہ کب شگوفے کھلنے کا موسم آئے اور مسکراہٹیں لبوں پہ کھلنے کا اذن مانگیں۔

صغیر اکیلا ہی آیا۔ ہم نے اس کی بیوی بچوں کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ لاہور ہی میں ہیں اور ساتھ نہیں آئے۔

''یار کتنا وقت گزر گیا تجھے ملے ہوئے اور اب تو ہم لوگ بوڑھے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔'' اس نے میرے گنجے ہوتے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں مسکرا دیا اور جواباً اس کی بڑھتی ہوئی توند کی طرف انگلی کر کے اس کی بات کی تائید کی۔

''اور سناؤ اتنے سالوں بعد کیسے دوبارہ امریکہ آنا ہوا؟'' میں نے کھانے کے دوران

لقمہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

''بس یار کوشش تو پچھلے کئی سالوں سے کر رہا تھا مگر بیچ میں کم بخت نائن الیون جان کو آ گیا اور گورے چالاک ہو گئے۔ ویزا ہی نہیں دیتے اب۔ پاکستان میں حالات بہت خراب ہیں مہنگائی ہے، ڈکیتیاں ہیں اور میرا کاروبار بھی بالکل ٹھپ ہو گیا ہے۔ روزگار سے تو جیسے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔ آپ لوگ خوش قسمت ہیں۔ اچھے وقتوں میں امریکہ سیٹل ہو گئے اب تو یہاں کی امیگریشن بس ایک خواب ہی بن کے رہ گئی ہے۔'' اس نے حسرت سے ٹھنڈی آہ بھری۔

''پھر بھی بھائی صاحب آپ کو وزٹ ویزا تو مل ہی گیا نا شکر کریں اب تو وزٹ ویزا بھی ملنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ زمانے گئے جب یہ سب آسان تھا اور آپ نے شمس بیٹے کو آرام سے یہاں بھیج کروا دیا تھا۔''

میری بیوی کے لہجے کی ناگواری چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''شمس الرحمٰن کیسا ہے؟ کہاں ہے'' منہ آئی بات نہ رہ سکی اور میں نے سوال کر دیا۔

''یہیں ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔ ماشاءاللہ پڑھائی میں بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس کی رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں سکول والے۔ دراصل عنقریب اس کی ہائی سکول گریجویشن ہے۔ اس کے بعد وہ کالج میں داخل ہو جائے گا۔ شکر ہے اس کی تو لائف بن گئی'' وہ بولتا چلا گیا۔

''تو آپ اس کی گریجویشن پہ آئے ہیں؟'' میری بیوی طنزیہ انداز میں بولی۔

''جی بھابی جی، آخر اتنا اہم وقت ہے اس کے لیے۔ ایسے میں کم از کم اس کا ایک پیرنٹ تو ہونا ہی چاہیے نا۔'' وہ ایک ذمہ دار باپ کی طرح بولا۔

''یار میں نے کہنا تھا کہ میں تو یہاں کسی کو جانتا نہیں ہوں۔ اس کی ہائی سکول گریجویشن کے موقع پہ آپ لوگ بھی میرے ساتھ چلیں تو مجھے اور شمس کو بہت اچھا لگے گا۔ دراصل میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ اسے یہ بالکل پتہ نہیں کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ کتنا خوش ہوگا وہ مجھے اور پھر آپ سب کو دیکھ کر بھی۔ آخر یہاں تو آپ لوگ ہی ہمارے اپنے ہیں۔''

''پانچ سال سے آپ نے اسے دیکھا نہیں، پہچان بھی لیں گے اسے یا نہیں؟''

''لو کمال کرتی ہیں بھابی جی اپنا خون ہے کیسے نہیں پہچانوں گا۔ بس میں تو تصور میں ہی اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ کتنا بڑا ہو گیا ہوگا۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو میری

آنکھیں بھی نم سی ہو گئیں۔ یہ والدین اور بچوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ ایک ڈوری ہوتی ہے جو بس بندھی رہتی ہے۔ تعلق ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں، جنون ہوتا ہے جو کبھی گھٹتا نہیں۔

گریجویشن ڈے پہ میں، میری بیوی اور صغیر مقررہ وقت پر سکول کے ہال میں جا پہنچے۔ ہمیں سپیشل مہمانوں کی آگے والی سیٹیں ملیں جہاں سے سٹیج کا منظر بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ سکول کا عملہ صاف ستھرے یونیفارم پہنے، خوش باش، مستعدی سے اپنا کام نمٹاتا نظر آ رہا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر صغیر مجھ سے شمس الرحمٰن کی پرانی باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ٹانگوں کی کمزوری کسی پٹھوں کی بیماری کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ بچپن میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا پھر اچانک اسے اس مرض نے آ لیا اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ اب کبھی دوبارہ نارمل طریقے سے چل پھر نہیں سکے گا۔

"مگر یار ذہن اس کا غیر معمولی طور پہ بہت تیز تھا۔ ہمیشہ کلاس میں اول آتا اور انعام جیتا کرتا تھا۔ اب تو اللہ کے کرم سے وہ دنیا کے بہترین ملک کے سکول میں پڑھ رہا ہے۔ اب تو ماشاءاللہ اور بھی لائق فائق ہو گیا ہے۔"

"آپ اسے فون نہیں کرتے تھے، میرا مطلب ہے اس کے سکول کی پراگریس رپورٹ لینے کے لیے؟" میری بیوی پوچھنے لگی۔

"نہیں بھابی جی..... کلیجے کا ٹکڑا ہے نا..... بس حوصلہ ہی نہیں پڑتا تھا، کیا پوچھتے اس سے..... اگر وہ رو دیتا تو ہم لوگ وہاں سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔" صغیر نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

سکول والوں نے وزٹ کا دعوت نامہ بھیجنے کے ساتھ ایک خط بھی منسلک کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ہم ہر گریجویٹ کو اپنے ہاں کے ایک پروگرام Hearts Desire کے تحت ایک خواہش پوری کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہی ان کا گریجویشن گفٹ ہوتا ہے۔ کتنی پیاری بات ہے نا۔ خواہش دل؟

صغیر نے ہماری طرف دیکھ کر تائید چاہی۔

"ہاں واقعی خواہش دل تو بہت خوبصورت بات ہے۔" میں نے بھی سر ہلا دیا۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔ شمس الرحمٰن کو ملتے ہی کہوں گا۔" چترا اپنی پوری فیملی کے لیے

یہاں کی امیگریشن مانگ لے۔ بس پھر تو سارے کے سارے ہی یہاں آ جائیں گے۔ خیری سلا۔ فیملی اکٹھی ہو جائے گی۔ یہ وقت ہے کہ تو اپنی فیملی کے لیے کچھ کر کے دکھائے۔ صغیر کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔

فنکشن کا آغاز بہت خوبصورت اور باوقار انداز میں ہوا۔ طلباء نے مل کر عالمی امن کی خواہش کے حوالے سے ایک مسحور کن گیت پیش کیا۔ ہم نے وزیٹنگ چیئرز پہ بیٹھے بچوں میں سے شمس الرحمٰن کو پہچاننے کی کوشش کی اور پھر بالآخر صغیر کی نشاندہی پر ایک کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ واقعی شمس الرحمان تھا مگر پہلے سے کتنا لمبا اور خوبصورت ہو گیا تھا۔ سبھی بچوں میں گریجویشن کے ڈپلومے تقسیم کیے گئے، تالیاں بجیں اور غبارے ہوا میں چھوڑے گئے۔ کامیابی اور محبت کے نغمے گائے گئے۔

''میرا سوہنا پتر!'' صغیر نے زیرلب کہا اور دل کھول کر تالیاں بجائیں، فنکشن کے بعد ہم تینوں شمس سے ملنے ہاسٹل کے بڑے سے میٹنگ ہال میں پہنچ گئے جہاں بچوں کے ماں باپ، رشتہ دار، ان سے ملاقات کے لیے کرسیوں پر پہلے سے ہی براجمان تھے۔ ان کے مشتاق دل اور متلاشی آنکھیں اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ ماحول کو خوبصورت بنانے کے لیے وائلنسٹ میٹھی میٹھی دھنیں بجا رہے تھے اور کھڑکیوں کے شیشوں سے برف کے سفید سفید پھول ٹکرا ٹکرا کر تاک جھانک کر رہے تھے۔

''یہ دیکھو ینگ مین، تمہیں ملنے کون آیا ہے؟ ایک اٹینڈنٹ نے آگے بڑھ کر شمس الرحمٰن کو متوجہ کیا جو مزے سے چاکلیٹ کھاتا ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ صغیر آگے بڑھا اور جا کر شمس سے لپٹ گیا۔ ''میرا پتر..... میرا سوہنا پتر۔'' وہ اس کے ماتھے پہ بوسے دینے لگا، شمس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور ایک دم بولا۔

''ایکسکیوزمی، پیچھے ہٹیں، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اپنے بیٹے کے منہ سے شدھ امریکن لب و لہجے میں انگلش سن کر صغیر مسکرا کر ہم سے مخاطب ہوا۔ ''کتنی اچھی انگلش بولنے لگا ہے میرا پتر۔ او پتر پہچانا نہیں، میں تیرا ابا۔'' صغیر نے پھر اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ شمس نے اس کو دھیرے سے پرے ہٹا دیا۔

''آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ نرس یہ کس زبان میں بات کر رہے ہیں۔ I don't

understand this language اس نے انگریزی میں بات کا جواب دیتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"اوئے یو آرشمس الرحمان۔ڈونٹ فارگیٹ۔"

اب کے صغیر بھی ذرا سخت لہجے میں بولا۔"لوجی یہ تو اپنی زبان ہی بھول گیا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"سوری میں آپ کو نہیں جانتا۔ میرا نام شمس Whatever! نہیں Shamus Raymond" شے مس ریمنڈ ہے۔" اس نے چبا چبا کر اپنا نام بتایا اور ہمارے حیرت سے کھلے کے کھلے منہ دیکھ کر چہرہ وپرے کرلیا۔

اسی لمحے اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔" سٹوڈنٹس اپنی اپنی ہارٹ ڈیزائر بتائیں، ہم اسے پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔"

چند بچوں کے بعد ہی شمس الرحمٰن کی باری آگئی۔ اس نے مائک ہاتھ میں تھام کر پہلے ایک سٹاف ممبر کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہنے لگا" میرے دل کی خواہش ہے کہ میں اس شخص یا اس کی فیملی کو آئندہ زندگی میں پھر کبھی نہ دیکھوں۔ میں امریکن ہوں اور یہ خواہ مخواہ ہی مجھ سے رشتہ جوڑنا چاہ رہے ہیں جبکہ میں انہیں جانتا تک نہیں۔

Please keep them away from me.

یہی میری خواہش ہے۔"

"خون سفید ہوگیا ہے بے حس لڑکے کا۔ دیکھو تو سہی۔"

بالکل ہی امریکن ہوگیا ہے۔ صغیر نے غم و غصے سے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ شمس ریمنڈ اپنی موٹرائزڈ، جدید ترین سہولتوں سے مزین وہیل چیئر کو مشاقی سے چلاتا ہوا، کاریڈور میں سے دور تک جاتا دکھائی دیتا رہا اور باہر برف گرتی رہی۔

جو کوئے یار سے نکلے.....

ملیحہ نے اپنے آپ کو اس حادثے کے بعد کافی اچھی طرح سنبھال لیا تھا جس کے بعد کوئی بھی عورت ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس کے شوہر فرقان علی نے اسے پانچ بچوں کی ماں بنا دینے کے بعد آرام سے طلاق دے کر کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ وہ بدل گیا تھا اور انقلاب ملیحہ کے اندر بھی آ چکا تھا۔ اب وہ سیالکوٹ کی سیدھی سادی ایف اے پاس لڑکی نہیں بلکہ آروگ برگ پنسلوینیا کی جہاں دیدہ، خود اعتماد، بہادر پاکستانی عورت تھی۔

اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اسلامی تعلیمات میں غرق کر لیا اور اپنی آئندہ زندگی کا ہر فیصلہ قرآن کی روشنی میں کرنے لگی۔ وہ کہتی تھی "اسلام عورت کو بہت زیادہ طاقت دیتا ہے۔ عورتوں کو دبانے والا اسلام نہیں بلکہ برصغیر کا معاشرتی ڈھانچہ اور معاشی ناہمواری ہے۔ عورت خود کفیل ہو تو اسے دبنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" اس نے اپنے ایریا کی فیملی کورٹ میں فرقان علی کے خلاف خرچے کا مقدمہ درج کرا دیا اور پانچ سال تک ثابت قدمی سے پیشیاں بھگتنے کے بعد کامیاب ہو گئی۔ کہنے والے کہتے تھے اسے آدھا ملین ڈالر ملا ہے۔

پنسلوینیا کی پاکستانی کمیونٹی کی عورتیں اور مرد اس کی ہمت اور استقلال پر حیران ہوتے تو وہ کہتی "فرقان علی سے پیسہ لینا میرا حق ہے، کیا میں نے بیس سال تک اس کی بیوی اور بچوں کی ماں بننے کا جاب نہیں کیا؟" لوگ خاموش ہو جاتے کہ کہتی تو وہ بھی سچ تھی۔ مگر عام طور پر عورتیں ایسی آزمائشوں سے بھاگ جاتی ہیں اور اپنا حق چھوڑ دیتی ہیں اس لیے یہ سب کے لیے ہی اچنبھے کی بات تھی۔

اس نے کیلی فورنیا کے ایک بہت بڑے اسلامک سنٹر کی زیرِ نگرانی اپنا ایک چھوٹا اسلامک سنٹر کھول لیا اور مبلغ حمزہ یوسف کی آڈیو ویڈیو کیسٹوں، سی ڈیز اور اسلامی لٹریچر کی سیلز اور تقسیم کے کام میں خود کو مصروف کر لیا۔ اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے دوسری شادی کر لینا چاہئے، کیونکہ اللہ کو، اکیلی عورت کا بغیر نکاح کے رہنا، اتنا پسند نہیں۔

ملیحہ نے اپنے لیے نئے شوہر کی تلاش شروع کی تو کمیونٹی کی عورتوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ اسے کچھ برا بھلا تو کہہ نہیں سکتیں تھیں کیونکہ وہ حد درجہ مذہبی اور راست کردار عورت تھی۔ بس ہائے ہائے کہہ کر، اس کی باتوں پر تبصرہ کر کے رہ جاتیں اور سوچتیں کہ یہ کیسی عورت ہے؟ کیا خناس بھرا ہوا ہے اس کے سر میں!

ملیحہ نے چند ایک ایسے پاکستانی مردوں سے رابطہ کیا جو رنڈوے تھے یا جن کی اپنی بیویوں سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ ان سے بات چیت آگے بھی چلی مگر جب ان حضرات کو یہ پتا چلتا کہ دلہنیا اپنے ساتھ بچے بھی لائیں گی تو وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ بچوں والی عورت کسی کو گوارا نہ تھی اور ماں، اپنے بچے چھوڑنے پر کسی صورت رضامند نہ تھی لہٰذا وہ اپنی قوم کے مردوں سے مایوس ہو گئی۔ پھر اس کی ملاقات نو عمر نو مسلم امریکن طارق سے ہو گئی جو اسلامک سنٹر کی بڑی سی وین چلاتا تھا اور پارٹ ٹائم فلائنگ کلاس بھی اٹینڈ کرتا تھا۔ طارق پہلی عراق امریکہ جنگ میں بطور امریکی فوجی تعینات رہا تھا۔ وہ فارغ وقت میں عراق کی مسجدوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تو وہیں اس نے ایک امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ عراق میں قریباً پچیس ہزار امریکنوں نے عیسائیت ترک کر کے اسلام کو گلے لگایا تھا۔ اس بات کی تشہیر سے امریکی میڈیا نے ہمیشہ کنی کترائی تھی لہٰذا کسی کو اس بات کا کوئی خاص علم نہیں ہے۔

ملیحہ کی مشکل زندگی کی باتیں سن سن کر اسے وہ اچھی لگنے لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سسٹر، برادر کہتے کہتے آپس میں دوست بنتے چلے گئے۔ وہ ملیحہ کو ایک سچی اور بہادر عورت سمجھ کر اس کی بہت تعظیم کرتا اور دونوں گھنٹوں اسلامی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے۔ ملیحہ نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مرد عورت صرف نکاح کے بعد ہی ایک دوسرے سے آزادانہ میل جول رکھ سکتے ہیں لہٰذا اپنے رسول پاکؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی اسے نکاح کا پیغام دینا چاہتی ہے۔ طارق نے کچھ روز سوچا اور پھر یہ کہہ

کر اس سے نکاح کر لیا کہ ''تم ایک اچھی مسلم عورت ہو...اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہئے؟''

طارق اور ملیحہ ہنسی خوشی رشتہ ازدواج میں بندھ گئے اور پاکستانی کیونٹی میں چہ مگوئیاں بڑھ گئیں۔

''اس کی جرات دیکھو! ایک امریکن، دوسرے عمر میں چھوٹا، پھر غیر شادی شدہ.....''

''بھئی کمال ہے.....اپنے کلچر کو تو بالکل ہی بھلا بیٹھی ہے۔امریکن ہو گئی ہے۔''

''اس کی تو اپنی بیٹی جوان ہے، اس کا سوچنا چاہئے تھا.....توبہ.....حد ہو گئی۔''

ملیحہ کو سب پتہ تھا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کیا کہہ رہے ہیں مگر اس نے اپنے آپ کو اندر سے اتنا مضبوط کر لیا تھا کہ کسی بات کا اس پر کوئی منفی اثر ہوتا ہی نہیں تھا۔

طارق نے عراق کے سوا دنیا کا کوئی اور ملک دیکھا نہیں تھا۔اسے پاکستان جانے کا بہت شوق ہو رہا تھا مگر مصروفیت مہلت نہیں دے رہی تھی۔خود ملیحہ کو پاکستان سے کٹے ہوئے تقریباً پندرہ برس ہو گئے تھے۔وہ زندگی کے جھمیلوں میں اتنی الجھی رہی تھی کہ اسے ماں باپ بھی بھول گئے تھے۔وہ تو چند سال پہلے اس نے اپنے دو بھائیوں کو سپانسر کر کے امریکہ بلوالیا تھا اور امی ابو ان کے گھر آنے جانے لگے تھے ورنہ ملیحہ تو بس امریکہ ہی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

''نائن الیون'' کے بعد سے حالات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ملیحہ اور طارق کے اسلامک سنٹر کے کئی بار شیشے توڑے گئے۔ان کی کھڑکیوں پر کالے پینٹ سے Go Home، Islamic Scum لکھا گیا' ٹیلی فون پر دھمکیاں ملیں۔منصفانہ امریکی معاشرہ بے رحم اور تنگ دل ہو چکا تھا مگر طارق اور ملیحہ نے بین المذاہب مکالے شروع کر کے چرچ جانا شروع کر دیا تاکہ انہیں کوئی تنگ ذہن، محدود سوچ رکھنے والے مسلمان نہ سمجھنے لگے۔

طارق آرمی ریزرو میں میرین Marine (گارڈ) بھی تھا۔ایک روز اس کے کمانڈنٹ نے اسے بلا بھیجا تو وہ اس کے تفتیشی رویے سے پریشان سا ہو گیا۔انہیں کہیں سے خبر مل چکی تھی کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور ایک مسلمان عورت سے شادی بھی کر چکا ہے۔

''تم نے ایسا کیوں اور کیسے کیا! اس کی تفصیل بتاؤ'' افسر نے اسے گھور کر پوچھا۔

''سر! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔امریکی آئین کے مطابق مجھے مکمل طور پر مذہبی اور شخصی

''لیکن تمہاری بیوی کوئی اسلامک سنٹر چلاتی ہے، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس کا القاعدہ سے کوئی لنک تو نہیں؟ سنا ہے وہاں کافی میٹنگز وغیرہ ہوتی ہیں۔''

''آپ جب چاہیں آ کر چیکنگ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو ذاتی گارنٹی دیتا ہوں کہ وہاں کچھ غلط نہیں ہوتا۔ میری بات پر یقین کیجئے۔'' طارق افسروں کو تسلی دے کر چلا آیا مگر اس کا دل کٹتا ہو گیا۔ یہ اس کا اپنا ملک تھا اور وہ یہاں آزادی سے جو جی چاہے کر نہیں سکتا تھا۔ امریکہ آزادی، آزادی کی رٹ لگائے رکھتا ہے مگر اب ان کے ہاں آزادی کے مفہوم ہی بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ امریکہ کا جم پل تھا مگر اب غیر سمجھا جانے لگا تھا۔ دکھ کے مارے اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔

اس نے گھر آ کر ملیحہ اور اس کی دونوں بڑی بیٹیوں کو بتایا تو وہ پریشان ہو گئیں۔ نیوجرسی میں رہنے والے ملیحہ کے دونوں بھائی اپنی لمبی لمبی داڑھیوں اور شلوار قمیص کی وجہ سے پہلے ہی ایک بار ایئرپورٹ پر گھنٹوں بے لباس کر کے کمرے میں بند کر دیئے گئے تھے۔ دونوں چھوٹ جانے کے بعد مغلظات بکتے گھروں کو چل دیئے اور امریکنوں کو جی بھر کے گالیاں تو دے دیں مگر اب چارہ ہی کیا تھا۔ امریکہ میں رہنا ان کی مجبوری تھی کہ ان کا کام وہاں تھا۔ بچے وہیں پیدا ہوئے تھے، نئی جڑیں لگ چکی تھیں، انہیں اکھاڑ کر نئی جگہ لگانا بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا۔

''کیوں نہ ہم پاکستان کر جا رہیں! ہمارا اپنا مذہب، اپنے لوگ، اپنا ماحول ہوگا۔'' ایک روز طارق پر اشتیاق لہجے میں کہنے لگا۔

''ہمیں بھی پاکستان جانے کا بہت شوق ہے۔ ہم بھی دیکھیں ہمارے اپنے ملک میں رہنا کیسا ہوتا ہے۔ اپنے رشتے دار، اپنے لوگ.....Lets go''

ملیحہ کی بڑی بیٹی آصفہ نے طارق کے خیال کی تائید کی۔ چھوٹی آمنہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ملیحہ نے ایک نظر اپنی سروں پر حجاب اوڑھے بیٹیوں کو دیکھا..... کتنی معصوم اور پاک ہیں یہ دونوں۔ اللہ ان کے نیک نصیب کرے اور اچھے مسلم لڑکوں سے ان کی شادیاں ہوں۔'' ماں نے کئی بار کی مانگی ہوئی دعا ایک بار پھر مانگی اور پاکستان جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اب امریکہ میں ان کی حیثیت تیسرے درجے کے شہریوں جیسی ہو گئی تھی مگر پاکستان سے بچھڑے بھی تو ایک زمانہ ہو چکا تھا۔

چھوٹی سی عمر میں وہ بیاہ کر امریکہ آ گئی تھی بلکہ اس نے تو ہوش بھی امریکہ میں ہی آ کر سنبھالا تھا۔ Sesame Street جیسے بچوں کے پروگرام دیکھ دیکھ کر اس نے انگلش سیکھی تھی اور اب یہ حال تھا کہ اس سے اردو، پنجابی میں بات نہیں کی جاتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ پہلے ایک چکر پاکستان کا لگا آئیں پھر آ کر سوچیں کہ وہاں کب اور کیسے سیٹل ہونا ہے۔

ملیحہ کو یاد آیا، بھائی جان بھی اپنی بڑی بیٹی نازو کی شادی میں شامل ہونے کے لیے اسے بہت مجبور کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے "میں تو اپنی ننھی بہن ملی کی شکل دیکھنے کو ہی ترس گیا ہوں۔" ملیحہ کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ سوچنے لگی: چلے ہی چلتے ہیں۔ اچھا تجربہ ہوگا۔ طارق اور بچے سب سے مل بھی آئیں گے اور شادی میں شرکت بھی ہو جائے گی۔ اس کا فیصلہ سن کر سب لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور گھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اپنا ملک پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ ملیحہ نے استغفار پڑھی اور امریکنوں پر لعنت بھیجتی ہوئی پاکستان کی تیاریاں کرنے لگی۔

لاہور ایئرپورٹ پہنچتے ہی لمبی سی عبا پہنے، سر پر ٹوپی سجائے گورے چٹے امریکن طارق نے ادھر ادھر دیکھ کر زور زور سے سانس لی۔ "الحمدللہ میں مسلمان ملک میں ہوں..... سبحان اللہ کتنا خوبصورت ایئرپورٹ ہے....." وہ متاثر ہو کر مسکرانے لگا۔

"اسلام علیکم! ہیلو! ہائے" کی مختلف آوازوں پر اس نے آنکھیں گھمائیں اور دیکھا، ملیحہ کے کئی قسم کے رشتہ دار اس سے اور بچوں سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ طارق کو آگے بڑھتے دیکھ کر کچھ نے ہاتھ بڑھا دیا اور کچھ سکڑ کر وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔

سب تھکے ہوئے تھے لہٰذا گھر جا کر کھانا کھاتے ہی سو گئے۔ صبح ہوتے ہی بھائی جان نے ملیحہ کو اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔ ملیحہ نے غور کیا کہ بھائی جان کا گھر کسی محل سے کم نہیں تھا۔ بڑے بڑے کمرے، سبز گھاس والے کھلے کھلے لان، پورچ میں کھڑی ہر فرد خانہ کی اپنی اپنی گاڑی، وہ بھائی جان کے پراپرٹی بزنس کی کامیابی کے مظاہر دیکھ کر خوش ہو گئی۔ "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ" ملیحہ نے دل ہی دل میں کئی بار کہا۔

"دیکھو ملی! مجھے تمہارے اور بچیوں کے یہاں آنے کی بہت خوشی ہے مگر سوری! میری بات کو مائنڈ نہ کرنا۔ تم اس کو کیوں ساتھ اٹھا لائی ہو؟" بھائی جان نے ملیحہ سے کہا۔

"اس کون بھائی جان؟" وہ سمجھی نہیں۔

''بھئی وہ امریکن، اور کون؟'' بھائی جان نے صاف صاف کہہ دیا۔

''بھائی جان! وہ کوئی غیر نہیں میرا شوہر ہے..... طارق نام ہے اس کا!'' ملیحہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

''تمہیں شاید احساس نہیں، یہاں لوگ بہت اینٹی امریکن ہو رہے ہیں۔ اب ہم کس کس کو سمجھائیں گے کہ یہ گورا امریکن مسلمان ہو چکا ہے۔ بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے ہمیں۔''

''ویسے ملیحہ! تمہیں اپنی عمر سے اتنا چھوٹا خاوند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تم اسے یہاں لے آئی ہو۔ شادی میں اسے لے کر ساتھ گھوموگی تو لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔'' بھابی نے بھی ناک چڑھا کر لقمہ دیا اور بولتی چلی گئیں۔ ''سچی بات تو یہ ہے ملیحہ کہ ابھی ہم لوگ اتنے ماڈرن نہیں ہوئے کہ اپنے سے دس بارہ سال چھوٹے آدمی سے شادی کر لیں اور کوئی کچھ بھی نہ کہے۔ لوگ کہیں گے، اسے اپنی عمر، اپنے کلچر کا آدمی نہیں ملا تھا کیا؟''

بیوی کی بات سن کر بھائی جان نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

ملیحہ چپکے سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ طارق کو شادی کی تقریب سے دور کیسے رکھے۔ وہ بے چارہ تو آیا ہی رشتہ داروں میں گھلنے ملنے کے لیے تھا۔ طارق آنے والے دنوں میں ہر ایک سے تپاک سے ملتا، My Muslin Brother کہہ کر گلے لگاتا۔ ہر بات پر الحمد للہ، سبحان اللہ کہتا، اور گھر کے کاموں میں نوکروں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تو سب حیران ہو کر اسے دیکھتے رہ جاتے۔

''کیوں نہ ہم لوگ شادی اٹینڈ کرنے کے بجائے شمالی علاقوں کی سیر کو نکل جائیں!'' ایک روز ملیحہ نے موقع پا کر طارق کے سامنے ایک تجویز رکھی جسے وہ قطعاً سمجھ نہ پایا۔

'ہنی میں تو ابھی اپنے مسلم بھائی بہنوں سے اچھی طرح ملا بھی نہیں اور تم مجھے ان سے دور لے جانے کی باتیں کر رہی ہو!'' وہ حیران ہو کر بولا'' مجھے تو یہاں آ کر لطف آ گیا ہے..... سبھی لوگ ہم مذہب ہیں، کسی کو کسی سے کوئی تعصب نہیں۔ ونڈر فل.....'' وہ خوشی سے بولا۔

ملیحہ کو اسی وقت یاد آیا کہ کیسے آتے ہی اس کے بٹوے میں سے رقم چوری ہو گئی تھی۔ بھکاریوں نے اس کا بازار جانا مشکل کر دیا تھا اور خریداری کرتے وقت ہر لمحہ بے ایمانی سے چوکنا

رہنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل تھی مگر طارق شاید ہر بات کو مثبت طور پر دیکھنے کا تہیہ کر چکا تھا اس لیے اسے پاکستان میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی تھی۔

''نو مام! ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ شادی اٹینڈ کرنے ہی تو آئے ہیں تو اٹینڈ کرنے دیجئے نا..... بعد میں سیر کرلیں گے۔'' آصفہ نے ماں سے ضد کی۔ ''سنا ہے مہندی لگتی ہے تو بڑا مزا آتا ہے It's a lot of Fun میں تو کزن نازو کی شادی کسی قیمت پر مس نہیں کروں گی۔''

آمنہ نے بھی ماں کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "I am so excited" ملیحہ خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگی۔ ایک طرف بھائی اور بھابی کی کڑوی باتیں اور دوسری طرف طارق اور دونوں بیٹیوں کی معصوم خواہشیں۔ ''آخر ہم پاکستان کو ری ڈسکور کرنے، اس کے کلچر میں گھلنے ملنے کے لیے ہی تو یہاں آئے ہیں۔ عین شادی کے وقت یہاں سے کھسکنا کتنی نامناسب بات ہوگی۔''

ایسی کی تیسی! دیکھی جائے گی۔ ملیحہ کے اندر سے ایک آواز آئی The truth shall set you free جب میں نے کچھ غلط نہیں کیا، میں سچائی پر ہوں تو پھر مجھے شرمندہ ہونے اور ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے یکدم اپنے اندر ایک عجیب سی طاقت ابھرتی محسوس کی اور فیصلہ کر لیا کہ وہ شادی میں ضرور شرکت کرے گی۔ بھائی جان بھابی نے پھر کوئی بات نہ کی۔ برسوں بعد آنے والی بہن کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے مگر شادی کے دوران ملیحہ کی وجہ سے ان کا معذرت بھرا رویہ کسی سے چھپا نہ رہ سکا۔

حسب توقع مہمانوں نے اس کی اور طارق کی شادی کے موضوع میں خوب دلچسپی لی اور اس سے الٹے سیدھے سوال کرتے چلے گئے۔

''ہم بھی جوانی میں بیوہ ہو گئے تھے مگر شرافت سے بچوں کے سر پر زندگی کاٹ دی۔''

پھوپھو زہرہ نے دل کے پھپھولے پھوڑے مگر ان کی آنکھیں ملیحہ سے سرگوشی کر کے کہنے لگیں۔

''کاش تیری طرح مجھے بھی ایسی جرات نصیب ہوتی تو زندگی کا کٹھن سفر کچھ آسان ہو جاتا۔''

''ویسے ملیحہ! تم نے دوسری شادی کیوں اور کیسے کر لی؟'' بھابی کی چھوٹی بہن نے ڈائرکٹ سوال کر دیا۔

''اس لیے کہ اللہ کو مرد عورت کا حالت نکاح میں رہنا ہی پسند ہے۔ ویسے میرے میاں فرقان علی نے تو میری موجودگی میں ہی دوسری شادی کر لی تھی۔ انہیں تو کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

پھر مجھ سے آپ لوگ کیوں یہ سوال کر رہے ہیں؟"

"لیکن وہ تو مرد ہیں اور مرد ہمیشہ سے یہ سب کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔" بھابی نے لقمہ دیا۔

"اسلام میں مرد عورت ایک جیسے ہی بااختیار ہیں۔ دراصل آپ لوگوں نے اسلام کی صحیح روح کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے بڑی سٹڈی کی ہے اور مجھے یہ علم ہو چکا ہے کہ اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا مجھے خود حق حاصل ہے۔ پھر آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ امریکہ میں سارے کام خود کرنا پڑتے ہیں۔ سودا لاؤ، برتن دھوؤ، کھانا پکاؤ، گھاس کاٹو، کوڑا اٹھا کر باہر لے جاؤ، لمبے فاصلوں کی ڈرائیونگ کرو۔ میں نے سوچا ساتھی ہوگا تو ہاتھ بٹا دے گا۔ میری ذمہ داریاں کم ہو جائیں گی، بس اسی لیے میں نے شادی کر لی۔"

"بس اسی لیے؟" کسی نے سوال کیا اور اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

"لیکن آپ نے اس امریکن کو ہی کیوں پسند کیا؟" بھابی کی بہن بولی۔

"کیونکہ یہ ایک اچھا مسلمان ہے اور میرے لیے یہی کافی ہے۔" ملیحہ بھولپن میں ہر بات کا صاف جواب دیتی چلی گئی کہ اب اسے جھوٹ بولنے کی حاجت اور عادت نہیں رہی تھی۔ وہ ہر بات دوٹوک کہہ دیا کرتی تھی، چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا۔

ملیحہ کی اتنی صاف گوئی سب کے لیے بڑی اچنبھے کی بات بن گئی تھی۔ برسوں ایک منافقت زدہ معاشرے سے دور رہ کر وہ بھی بھول گئی تھی کہ رکھ رکھاؤ، دکھاوا اب یہاں پہلے سے بھی زیادہ ہو چکا ہے اور لوگ سچ سن کر عجیب سے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں مگر ملیحہ کو تو کسی کی پرواہ ہی نہیں تھی، صرف سچ کا خیال تھا اور بس۔

مہندی کی رات خوب ڈھول ڈھمکا ہوا۔ سبھی بے حال ہو رہے تھے۔ نوجوان طبقہ سگریٹ اور چرس کے دھوئیں اڑا رہا تھا اور بڑے انکل اور آنٹیاں بوتلوں سے گھونٹ بھر کے دیوانہ وار رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔ طارق، آمنہ، عارفہ کے لیے یہ سب کچھ بڑا حیران کن تھا۔ حجاب پوش امریکی لڑکیاں اور عبا پہنے ٹوپی والا امریکن ٹکر ٹکر سب منظر دیکھ رہے تھے اور انہیں یاد آ رہا تھا کہ امریکہ میں تو مسلم شادیوں میں سب سے پہلے ایریا کے امام صاحب آ کر ایک اسلامی لیکچر دیتے ہیں۔ مسلم میرج اور میاں بیوی کے رول پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مگر یہاں یہ سب کچھ نہیں ہو رہا

تھا، بلکہ کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

''آؤ بھئی تم لوگ بھی ہمارے ساتھ ڈانس کرو، آمنہ، عارفہ کو ان کی کزنوں نے اپنے ساتھ گھسیٹا تو وہ گھبرا کر ''نو تھینکس'' کہہ کر اٹھ گئیں اور کہا'' ہماری عشاء کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

کچھ شوقین مزاج خواتین نے طارق سے ہلکا پھلکا فلرٹ کرنا شروع کر دیا۔ اچھا خاصا ہینڈسم امریکن تھا مگر انہیں لفٹ ہی نہیں کروا رہا تھا۔ طارق نیچی نگاہیں کیے ان کی باتوں کا مودب انداز میں جواب دیتا رہا مگر جب خواتین نے اسے ڈانس کے لیے کھینچا تو اس نے فوراً یہ کہہ کر ہاتھ چھڑا لیا کہ'' آپ میرے لیے نامحرم ہیں۔'' خواتین حیرت زدہ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگیں اور پیچھے ہٹ گئیں۔ ملیحہ نے مضبوطی سے طارق کا ہاتھ تھام لیا جیسے احساس دلانا چاہتی ہو کہ میلے میں کھوئے ہوئے بچے کی ماں کہیں دور نہیں اس کے پاس ہی ہے اور سمندر میں ہچکولے کھاتی کشتی سنبھلنے لگی۔ ملیحہ کو یاد آیا طارق نے اسے بتایا تھا کہ ایک بار فلائنگ سبق کے لیے اسے لیڈی انسٹرکٹر کے ساتھ کاک پٹ میں بیٹھنا پڑ گیا تو وہ یہ کہہ کر باہر نکل آیا تھا کہ'' میرے مذہب میں اجازت نہیں کہ مرد عورت اکیلے ایک جگہ اکٹھے ہو سکیں کیونکہ ان کے درمیان میں شیطان آ جاتا ہے۔'' پھر جب تک طارق کو مرد انسٹرکٹر نہیں دیا گیا وہ سبق لینے پر رضامند ہی نہیں ہوا۔

شادی کی تقریب ختم ہونے کے اگلے روز مہمانوں نے واپس جانا شروع کر دیا تھا۔ ملیحہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے! پاکستان میں مستقل قیام کے پلان بنائے یا امریکہ واپس لوٹ جائے۔ بھائی جان سے مشورہ کرنے کو جی چاہا اور کچھ سوچ کر ان کے کمرے کی طرف چلی مگر ابھی کوریڈور میں ہی تھی کہ اس کے کانوں میں آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

''تھک گئے مہمانداری کرتے کرتے۔ اب تو بس آرام چاہیے۔'' بھابی کہہ رہی تھیں۔

ان کی بیٹی پنکی ابو کو متوجہ کر کے زور زور سے کہنے لگی'' ابا یہ پھوپھو ملیحہ کی Wierd فیملی کب واپس جائے گی؟ شادی پر یہ لوگ اتنے آؤٹ آف پلیس لگ رہے تھے۔ عبائیں، حجاب اور نیچے کام والے جوڑے! توبہ اور پھر بات بات پہ کہنا'' یہ اسلامک ہے، وہ ان اسلامک ہے'' ہاں ابو یہ تو بتائیں امریکہ کے مسلمان اتنے ابنارمل کیوں ہو جاتے ہیں! آخر انہیں ہو کیا جاتا ہے؟! اتنے

Fanatic اتنے بیک ورڈ.....! یہ نائن الیون کلچر انہیں آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ توبہ! میں تو ایسی گھٹی ہوئی ذہنیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔" دوسری بیٹی روزی نے بھی اپنا اظہار خیال شروع کر دیا۔

بھائی جان اپنی بیٹیوں کو ملکوں، مذہبوں، تہذیبوں کے تصادم وغیرہ کے موضوع پہ کچھ لیکچر سنا دینے لگے تھے مگر ملیحہ وہاں مزید کھڑی نہ رہ سکی اور مرے مرے قدموں سے گھر کے لان میں چلی آئی۔ اس نے اوپر نظر دوڑائی۔ لاتعداد پرندے کھلی فضا میں اڑتے پھر رہے تھے۔ کتنی آزادی محسوس کر رہے تھے وہ۔ پھر ملیحہ کی سوچیں کالے کوے بن کر اس کے سر میں ٹھونگیں مارنے لگیں۔ "اے اللہ! تو کہتا ہے میری زمین میں پھیل جاؤ اور میرا فضل تلاش کرو، تیری کائنات تو اتنی بڑی ہے۔ تیری سلطنت اتنی پھیلی ہوئی ہے مگر اب ہم جیسے بے وطن کہاں جائیں؟ کیا تیری اتنی وسیع زمین میں ہمارے لیے دو گز جگہ بھی نہیں ہے؟ اے میرے اللہ! مجھے جواب چاہیے!"

بس کا پیالہ

''مسئلہ کیا ہے؟، ابھی تو تیرے سنڈے فیچر کے آنے میں کافی ٹائم پڑا ہے تو پھر پریشانی کیسی؟'' ندیم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے دوست اسد سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار، سبجیکٹ ذرا مشکل سا ہے، ورکنگ ویمن ہاسٹل کے مسائل اور ابھی کوئی خاص انٹرویوز اور معلومات اکٹھی نہیں ہو سکیں'' اسد نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا، وہ ثمینہ گل کو آپریٹ نہیں کر رہی؟ پرانی ریذیڈنٹ ہے اس ہاسٹل کی، ویسے کرتی کیا ہے؟ وہ تو تیری کافی ہیلپ کر سکتی ہے اس سے پوچھنا۔''

''وہ؟ بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے کسی سینئر پوسٹ پہ..... بڑی مصروف ہوتی ہے یار۔ اسی سے تو ٹائم لینا مشکل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی بہت لیٹ آورز ڈیوٹی بھی کرتی ہے۔ اس سے بات کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ثمینہ ویسے ہے بڑی پرسنیلٹی والی، اس روز دیکھا تھا اسے، میں نے کہا، لو بھئی اپنا یار تو گیا'' ندیم ہنسنے لگا۔

''چل بکواس نہ کر۔ مگر یار ندیم پتہ نہیں اس لڑکی میں کیا بات ہے، ایک ہی بار ملا ہوں مگر..... اس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی گہری اداسی..... بڑی عجیب سی کشش ہے اس کی آنکھوں میں.....'' اسد بات کرتے کرتے کھو سا گیا۔

کچھ ہی دیر میں ورکنگ ویمن ہاسٹل کا گیٹ آ گیا اور اسد اتر کر چوکیدار سے اندر

جانے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ چوکیدار نے مہمانوں کو کامن روم میں بٹھا دیا اور خود ثمینہ گل کو بلانے کے لیے فون کرنے چلا گیا۔

ثمینہ کے ساتھ اس نے ہاسٹل کے مسائل پہ تفصیلاً بات چیت کی۔ اس نے بتایا کہ خواتین کو ہاسٹل میں رہنے سے آرام تو ملتا ہے مگر ساتھ ہی کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ، کامن روم میں سیٹنگ ارینجمنٹ کی دشواری، مہنگے بل، کھانے کا ناقص معیار وغیرہ، سبھی موضوع زیر بحث آئے۔

''کہیں باہر چلیں، میرا مطلب ہے آپ کو کافی، چائے کچھ پلاتے ہیں، مزا رہے گا۔'' ندیم خشک قسم کے موضوعات سے بور ہونے کے بعد بولا۔ ثمینہ نے کچھ دیر کے لیے سوچا، ایک آدھ بہانہ بھی بنایا مگر بالآخر اسد کے اصرار پر ہاں کہہ کران کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی۔ تینوں ایک پروقار سی کافی شاپ میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے، ہنستے ہنساتے رہے۔

ثمینہ کے کپڑوں، انگلیوں میں پہنی ہوئی ہیرے کی انگوٹھیوں اور خوبصورت امپورٹڈ جوتی کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے پارلر کی جاب سے اچھا خاصا کما لیتی ہے۔

''اگر آپ کے اتنے پرابلمز ہیں تو آپ ہاسٹل کی بجائے انڈی پینڈنٹ گھر میں کیوں نہیں رہتیں؟'' ندیم نے اس سے بے دھڑک سوال کر دیا۔

''میرا مطلب ہے آپ افورڈ تو کر سکتی ہیں نا۔''

''دراصل میرے والد اور دو چھوٹے بھائی ہیں جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ والدہ کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے اکیلا گھر لے کے کیا کرنا ہے۔ سکیورٹی کا بھی مسئلہ ہوتا ہے، بس گزارہ ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے۔'' ثمینہ نے جواب دے کر گفتگو کا رخ اسد کی اخبار کی اس اسائنمنٹ کی جانب موڑ دیا جس پہ وہ کام کر رہا تھا۔

....

گاؤں کے لوگ خوش تھے کہ اب کے برس سرکس بڑے اچھے موسم میں آیا ہے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں خنکی بھلی لگتی تھی اور شامیانے کے اندر حبس محسوس نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں سرکس آتا تو تماشائیوں کا برا حال ہو جاتا تھا۔ کچی زمین پہ بندھے ہوئے جانوروں کی پیشاب کی باس، سرکس کے کارندوں کے نائیلون سے بنے چست ملبوسات سے اٹھتے ہوئے پسینے کے بھبکے

اور چہرے سے ٹکرانے والی گرم لو کے تھپیڑے کسی کو بھی بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ اب کی بار اچھا تھا، سرکس اور میلہ خوشگوار موسم میں آئے تھے۔

دس سالہ منا اپنے یار بیلیوں کے ساتھ شام کو سرکس کا پہلا شو دیکھنے کے لیے دوپہر سے ہی تیار ہوا بیٹھا تھا۔ ابو پولیس کانسٹیبل اکرم الٰہی گاؤں کے ایک معتبر آدمی تھے۔ سرکس والوں نے پہلے سے ہی آٹھ دس فری پاس بھجوا دیے تھے جس کی وجہ سے منے کا اپنے دوستوں میں بڑا امیج بن گیا تھا۔ وہ کلف لگے، اکڑے ہوئے شلوار کرتے میں ملبوس کب سے منتظر بیٹھا تھا کہ شام ہو اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سرکس کے گول خیمے میں شان سے داخل ہو سکے۔

....

اسد نے ورکنگ ویمن ہاسٹل کے مسائل والا فیچر اپنے ایڈیٹر گیلانی صاحب کو دے دیا اور وہ چھپ بھی گیا مگر نہ جانے کیوں ثمینہ گل اس کے ذہن پر چھا کر رہ گئی۔ اسے بھولتی ہی نہ تھی۔ ہر وقت اس کا خیال آتا اور دل بے چین سا ہو جاتا۔

اس لڑکی سے ابتدائی ملاقاتوں کو آخری سمجھنے پر دل رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ اس عام سی شکل و صورت والی سانولی سلونی لڑکی کا بات بات پر چونک جانا، اپنے گھنگھریالے بالوں کے چھلوں کو انگلی سے مستقلاً مروڑتے رہنا، کبھی اس کی طرف بھرپور انداز میں دیکھنا اور کبھی اس کی موجودگی سے بے خبر اپنے ہی خیالوں میں کھوئے رہنا، اسد کو اکیلے میں رہ رہ کر یاد آنے لگا۔

وہ اپنے آپ سے جنگ کرنے لگا "اسے فون کروں یا نہ کروں؟ کیا سوچے گی وہ میرے بارے میں؟ کہیں کوئی غلط رائے ہی نہ قائم کر لے؟" آخر ایک روز تنگ آ کر اس نے اسے فون کر دیا اور پھر فون پہ گفتگو کا سلسلہ قائم کرنے کے بعد ایک روز اسے باہر کھانے پہ مدعو کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس نے لاکھ مصروفیت کا بہانہ بنایا مگر اسد نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

"تمہاری فیملی تو تم پہ بہت مان کرتی ہو گی۔" وہ کھانے کے دوران کہنے لگا۔

"پتہ نہیں۔ شاید" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"بھئی تم ان کا اتنا اچھا بیٹا ہو، انہیں سپورٹ کرتی ہو، محنت کرتی ہو۔"

"بیٹا؟" وہ ہنس پڑی۔ "اچھا لگا تمہارا بیٹا کہنا۔" اور ہنستے ہنستے آئس کریم اسد کے

بازو پہ ٹکا دی۔ اسد نے فوراً آستین الٹ کر ٹشو سے آئس کریم صاف کر دی تو ثمینہ غور سے اس کا بازو دیکھنے لگی۔

''لگتا ہے میرے قوی، ہینڈسم بازو کو دیکھ کر تمہارے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔ وہ اپنے بالوں سے بھرے خوبصورت بازو سے قمیض ہٹا کر اسے دکھا کر اترانے لگا تو ثمینہ ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔

''ہنستی رہا کرو، ہنستی ہو تو بڑی اچھی لگتی ہو'' اسد کہنے لگا۔ ''زندگی اسی کا نام ہے۔''

''اچھا؟ تم زندگی کو سمجھتے کیا ہو آخر؟'' ثمینہ نے اچانک سوال کر دیا۔

''میں سمجھتا ہوں زندگی ایک جام ہے، فرحت بخش، خوش رنگ اور خوش ذائقہ اور تم زندگی کو کیا سمجھتی ہو؟'' اسد نے جواباً اس سے سوال کر دیا۔ ثمینہ خاموش ہو کر خلا میں گھورنے لگی۔

....

سرکس میں طرح طرح کے تماشے تھے۔ ہاتھی کا سٹول پہ چڑھ کر سونڈ اٹھا کر چنگھاڑنا، ننھے ننھے سفید کتوں کا جلتی آگ کے پہیے میں سے بحفاظت کود جانا، مسخروں کی الٹی سیدھی چھلانگیں، تنے ہوئے رسے پہ جوان لڑکے، لڑکیوں کا توازن قائم رکھتے ہوئے مشاقی سے جھولے لینا، شیروں کا دھاڑنا، منے اور اس کے دوستوں کی تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر پروگرام کے اختتام سے پہلے ایک ایسا انوکھا تماشہ دکھایا گیا جو کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا تھا۔

تماشے میں سب سے پہلے بتیاں مدھم کر دی گئیں، جس سے ماحول کافی پراسرار سا ہو گیا۔ لوگ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ بڑی سی چھت والے گول سفید رنگ کے شامیانے کے عین بیچوں بیچ ایک میز لا کر رکھی گئی جس پہ ڈھکی چادر کے نیچے کوئی لیٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈھول کی تھاپ دھیمی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نے دھیرے دھیرے کپڑا سرکایا تو حاضرین کے سانس اوپر کے اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ کانچ کے رنگ برنگے ٹکڑوں کی کئی تہوں کے اوپر ایک نو دس سالہ لڑکی نیم عریاں لباس پہنے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ یوں جیسے وہ ایک بے جان گڑیا ہو۔ تماشہ گر نے مائیک تھام کر اعلان کیا۔ ''بھائیو اور بہنو! آج نظارہ کیجئے میری بچی کی بہادری کا۔ ایسا تماشہ آپ نے پہلے کبھی دیکھا نہ ہوگا۔'' پھر اس نے اپنے ایک ہاتھ کو بلند کیا اور اس میں تھامی گول سی ٹوکری کا ڈھکنا بچی کے بالکل قریب لا کر دھیرے دھیرے کھولنا شروع کر دیا۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہونے لگی۔ مسخرے

دیوانے ہوکر ناچنے لگے۔حاضرین کے دل دھک دھک کرنے لگے۔موسیقی کا شور بڑھ گیا۔

....

"چلو، کسی دن اسلام آباد چلتے ہیں" اسد نے ثمینہ سے کہا۔

"کیوں؟"

"امی ابو سے ملتے ہیں، گپ لڑائیں گے۔امی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے۔"

اسد نے نیٹ فون پر گفتگو کے درمیان اچانک آفر کی اور ثمینہ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

ثمینہ باتیں کرتے کرتے یکدم خاموش ہوگئی۔یوں جیسے اچانک کمرے کی بجلی چلی گئی ہو۔پھر پل بھر توقف کرنے کے بعد بولی "اسد ہم لوگ تو گلوبل وارمنگ کے اشو پہ بات کر رہے تھے، یہ اچانک امی ابو کا ذکر کہاں سے آ گیا؟"

"بھئی میں نے سوچا گلوبل وارمنگ کے بعد اب ذرا ہارٹ وارمنگ کی بات کرلیں تو کیا بولتی تو؟ آتی کیا اسلام آباد؟ وہ لہک لہک کر گانے لگا۔

"سوری اسد۔تم جانتے ہو کہ میں بہت مصروف ہوتی ہوں، کہاں ٹائم ملے گا مجھے۔"

"دیکھو! میں آخر کسی خاص وجہ سے ہی کہہ رہا ہوں نا' چلو......پلیز......"

"اسد میرا خیال ہے میں ایک بات واضح کردوں تو اچھا ہے۔میں مستقبل کے کسی ارادے میں تمہارے ساتھ شامل نہیں ہوسکتی۔کیا ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح نہیں مل سکتے۔تمہیں شاید پتہ نہیں مجھے ایک اچھے، پرخلوص دوست کی کتنی شدید ضرورت ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"پاگل لڑکی۔اگر دوست ایک دوسرے کے ساتھی بھی بن جائیں، ہمیشہ ساتھ نبھائیں تو اس میں کیا برا ہے......تم تقریباً چھ ماہ سے مجھے دیکھ رہی ہو، میں شریف لڑکا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں نہ شراب، ٹھیک ٹھاک آمدنی ہے تم چاہو تو اپنی جاب جاری رکھ سکتی ہو، ہم مل جل کر......"

"اسد پلیز مجھے ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں لگتا۔آج کے بعد یہ بات نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے، ورنہ میں تمہیں ملنے سے انکار کردوں گی۔ثمینہ غصے میں آ گئی اور اسد خاموش ہوکر سوچنے لگا۔

"یہ جسے مذاق سمجھ رہی ہے وہ تو میری زندگی کی سب سے اہم حقیقت بنتا جا رہا ہے.....میں کیا کروں اس لڑکی کا، یہ سمجھتی کیوں نہیں؟"

....

ڈھکن کھلتے ہی ایک سیاہ بھیر سانپ پھن پھیلائے لڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔ ہجوم نے سانس روک لیے۔ منے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے بھی دوستوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ سانپ زور سے پھنکارا۔ پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا اور لیٹے ہوئے بے بس شکار کے جسم میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ لڑکی اسی طرح اطمینان سے سیدھی لیٹی، چھت کی جانب دیکھتی رہی۔ یوں جیسے شامیانے کے اوپر چھائے نیلے آسمان پہ اڑنے والے پرندوں کے نغمے سن رہی ہو۔

شیشوں کی سیج سے تماشہ گر کے پہنے ہوئے شوخ اور چمکدار کپڑوں کے رنگ منعکس ہوتے رہے اور تالیاں بجتی رہیں۔ لوگوں نے کھل کے داد دی، ور تماشہ گر باپ نے ہاتھ اونچے کر کر کے ہجوم سے شاباش اور ڈھیر سارے نذرانے وصول کیے۔ اس نے مہارت سے سانپ کو دوبارہ اس کی گول ٹوکری میں بل دیتے ہوئے قید کر دیا اور بیٹی کو اٹھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ باپ کے چہرے سے پھوٹتی کامیابی کی خوشی اور فخر سے جوڑے ہوتے بیٹے کو دیکھ کر ننھی بٹیا بھی مسکرانے اور داد پانے کے لیے آگے آ گئی۔

ایسا تماشہ کسی نے پہلے کبھی کہاں دیکھا تھا؟ لوگ جوق در جوق روز اس خاص اختتامی پروگرام کے لیے سرکس دیکھنے آنے لگے اور گاؤں کے ہر گھر میں اس کا تذکرہ رہنے لگا۔ منا بھی گھر آنے کے بعد بار بار اپنے امی ابو اور چھوٹے بہن بھائی کو اس تماشے کے بارے میں بتاتا رہا۔ رات کو سویا تو بھی اس کے ذہن میں وہی نظارہ گھومتا تھا۔ کبھی اس نے خود کو خواب میں سرکس کے اونچے جھولے پر ڈنڈا تھامے محتاط قدم اٹھاتے دیکھا اور کبھی سانپ کے پھن کے مدمقابل۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ بہت سے کانچ کے رنگ برنگے ٹکڑوں کے عکس بین میں قید ہو گیا ہے اور کبھی ہاتھی کی کمر پر بیٹھا ہلکورے لیتا نظر آتا۔

منے کے دل و دماغ پر سرکس کا نیا تماشہ بری طرح چھا چکا تھا۔ اتنی بہادر لڑکی..... وہ سوچتا تو اسے جھرجھری آ جاتی۔ کتنے آرام اور مضبوطی سے اپنے جسم کو شیشوں کے ٹکڑوں پہ ٹکائے رکھتی تھی۔ کیا مہارت تھی واہ!! ابو کے مفت پاسوں کی بدولت وہ دو تین بار سرکس سے ہو آیا تھا مگر اس تماشے کے فسوں سے آزاد نہ ہو سکا تھا۔

ایک روز سرکس کے پچھواڑے لگے بیری کے درخت پر پتھر مارتے، بیر توڑتے، وہ

یکا یک ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ اپنے چھوٹے سے خیمے کے باہر کھڑی اسے بیر توڑتے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ منے نے نہ جانے کیوں بیروں سے بھری جھولی اس لڑکی کی طرف اچھال دی۔ وہ لپک کر آگے بڑھی اور بیر چننے لگی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" منے نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

"بلوری" اس نے مختصر جواب دیا اور اس کی طرف دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ ویسے مجھے سارے بلو کہتے ہیں۔"

منا اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا چلا گیا، اتنی روشن جیسے کانچ کے دو بنٹے ہرے سمندروں میں تیرتے ہوں۔ جیسے رات کے پچھلے پہر کے دو روشن دیے مسافروں کو رستہ دکھاتے ہوں۔

"تین بار تماشہ دیکھ چکا ہوں تمہارا" منے نے اسے فخریہ انداز میں بتایا۔ "ابو نے پاس لا کر دیے تھے، بڑا مزا آیا۔"

"اور تمہارا نام؟" بلوری نے بیر کی گٹھلی زمین پر تھوکتے ہوئے پوچھا۔

"منا۔ اچھا بلو! یہ تو بتا تجھے سانپ سے ڈر نہیں لگتا، تجھے درد نہیں ہوتا؟" منے نے پر تجسس انداز میں سوالات داغنے شروع کر دیے۔

"تو مجھے کیوں سانپ کے کاٹنے سے درد ہوگا۔ میں سپیرے کی بیٹی جو ہوں۔ ابا کہتا ہے سانپ میرے بھائی ہیں۔ ہماری روزی ہیں، وہ مجھے پیار سے ڈستے ہیں تو اس لیے مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوتا..... ویسے بھی اگر میں بلوں تو مجھے شیشہ چبھ جائے گا۔ بس یہی سوچتی رہتی ہوں کہ میں شیشوں کے اوپر نہیں بلکہ پھولوں کی سیج پہ لیٹی ہوں۔ نرم خوشبودار پھول میرے نیچے ہیں، جو اماں کہا کرتی تھی ایک دن ضرور میرے بستر پہ بچھے ہوں گے۔"

"اچھا! وہ کب؟"

"جب میری شادی ہوگی اور کب؟ جب دلہن بنوں گی تب تو کتنا اچھا لگے گا۔"

"بلو او بلو پتر کہاں دفع ہوگئی ہے؟" اس کے باپ کی آواز کان میں آئی تو وہ جھولی میں بھرے بیر جھاڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ منا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

اس روز کے بعد منا جب بھی بیری سے بیر توڑتا، تھوڑے سے چھپا کر ایک لفافے میں

ڈال کر نیچے گرا دیتا اور پھر چھپ کر دیکھتا، بلو موقع پاتی ہی آتی، بیگ اٹھا کر بھاگتی تو اسے بڑا اچھا لگتا۔ وہ اپنی اس نیکی کی وجہ سے بڑا خوش رہنے لگ گیا تھا۔

"لیکن میں سوچتا ہوں کہ تمہیں سانپ کاٹتا ہے تو تم زندہ کیسے رہتی ہو؟ مجھے کاٹے تو میں تو بس گیا۔" ایک روز اس نے مرنے کے انداز میں زمین پر گر کر دکھایا تو بلو ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔

"ارے بابا مجھ پر زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ بتایا تو تھا اس دن۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں ابا مجھے روزانہ ایک سانپ سے ڈسواتا ہے۔ اماں لڑتی تو کہتا تھا، تجھے نہیں پتہ، اس طرح اس پر سانپ کے ڈسنے کا کبھی اثر نہیں ہوگا۔ اب اگر مجھے کسی دن سانپ نہ کاٹے تو میں بیمار ہو جاتی ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا، سارا جسم دکھنے سا لگتا ہے....." بلو بولتی چلی گئی۔

گئے زمانے کے راجاؤں نے سوچا کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے کہ ہمارے دشمنوں کی شکتی ٹوٹ جائے اور مات ان کا مقدر بنے۔ انہوں نے دیس کے چار کونوں سے ویدوں کو طلب کیا، بدھی مانوں سے سوال کیا، سپیروں سے صلاح مانگی کہ کوئی ایسا کارن کرو کہ بس ایسا ہی ہو ہم ہار کا منہ کبھی نہ دیکھیں۔

سیانوں نے سر جوڑے، بدھی لڑائی اور ایک تجویز راجہ کو پیش کی۔ کہنے لگے مہاراج! پرش کی شکتی کو جتنی آسانی سے ایک ناری توڑ سکتی ہے اور کوئی نہیں توڑ سکتا۔ ناری جاتی کے پاس جو شکتی ہوتی ہے، پرش اس کا ہرگز مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ آپ آگیا دیں تو ہم اس مقصد کے لیے خاص طور پر ایسی ناریاں پال پوس کر جوان کریں جو آپ کی اس اچھا کا پالن کریں۔

"آگیا ہے۔" مہاراج بولے۔ پھر گاؤں والوں نے اپنی بہت سی بیٹریاں پیدا ہوتے ہی ماؤں کی گودوں سے لے کر مہا پروہت کی جھولی میں ڈال دیں، جہاں بڑی عمر کی دیو داسیوں نے ان کی پرورش کا ذمہ لے لیا اور دن رات اس کام میں جت گئیں۔ راجہ کی اس ننھی ناری فوج کو خاص خوراکیں کھلائی جاتیں خوشبودار تیل، شہد اور پھولوں کے رس سے ان کے نازک کامنی بدنوں کی مالش کی جاتی اور روزانہ ننھے ننھے سانپوں کا تھوڑا زہر حلق میں ٹپکایا جاتا کہ ان کے لہو کے ساتھ رگوں میں وش بھی ٹھاٹھیں مارے اور جزو ہستی بن جائے۔ جواں ہونے تک ان ناریوں کو وش کی ایسی عادت ہو جاتی کہ نہ ملنے پر ان کا جسم ٹوٹنے لگتا، وہ تڑپتیں، مچلتیں، منت

کرتیں اور کسی پل چین نہ پاتیں۔ یہ خوبصورت کنواری کنیائیں پوری طرح تیار ہو جانے کے بعد راج محل کی سازشوں کا پتہ لگانے کا کام کرتیں اور یدھ سے دشمن کو تحفتاً بھیج دی جاتیں۔ جو بھی ان کو دیکھتا ملن کی آرزو کرتا اور سمبندھ قائم ہوتے ہی نڈھال ہو جاتا کہ ان وش کنیاؤں کے جسم کے ہر مسام، ہر انگ سے وش پھوٹتا اور دوسرے کو گھائل کر دیتا تھا۔

....

"یار یہ لڑکیاں بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ ان کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ثمینہ کو دیکھو مجھے تو لفٹ کروائے چلی جا رہی ہے۔" اسد نے جاگنگ کرتے ہوئے اپنے پارٹنر ندیم سے کہا۔

"تجھے تو کہا ہے اس کا خیال چھوڑ دے، کسی اور طرف دھیان کر.....وہ دیکھ یار گلابی کپڑوں والی لڑکی کتنی زبردست ہے....." ندیم نے پارک میں واک کرنے والی لڑکیوں میں سے ایک کو تکتے ہوئے کہا اور خود بھی واک کرنے لگا۔

"کئی بار سوچتا ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤں مگر نہ جانے کیوں بس کمزور پڑ جاتا ہوں۔ اس کی بھوری آنکھوں میں چھپی بھید بھری اداسی..... یہ میرے بس میں نہیں ہے کہ اسے بھول جاؤں۔"

I think i Really love her.

اگلے دن اسد ہاسٹل کے گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی کہہ دیا۔ "بی بی گئی ہوئی ہیں" اسد ڈھیٹ بن کر گاڑی میں بیٹھا رہا اور اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ جب آئی تو رات کے تقریباً تین بج رہے تھے۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ درشتی سے بولی۔

"تمہارا انتظار، مگر تم کہاں رہ گئی تھی؟ میں پریشان ہو رہا تھا۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ ملائمت سے بولا۔

"دیکھو اسد میرے لیے کوئی پریشان ہو تو مجھے عجیب اور بے جا لگتا ہے، پلیز میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

I told you

"تم اکیلی اس وقت تک باہر کیوں تھیں، خیر تو ہے؟"

"ایک ماڈل کا فوٹو شوٹ تھا۔ تمہیں پتہ ہے میرا پارلر کا کام ایسا ہی ہے۔ اس میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔" "اب پلیز تم گھر جاؤ، میں بھی بہت تھکی ہوئی ہوں۔" اس نے اسد کو وہیں کھڑا چھوڑ کر گیٹ کھلوایا اور بے نیازی سے ہاسٹل کی عمارت کے اندر چلی گئی۔۔

....

سپیرے کی بیٹی کے تماشے کی خبر دور دور تک پھیل چکی تھی۔

ایک روز گاؤں کے چودھری صاحب نے بھی سرکس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ کانسٹیبل اکرم ان کی نشستوں اور خصوصی دیکھ بھال کے انتظامات کرنے کے لیے متحرک ہو گیا۔ سرکس والے بہت خوش تھے کہ اتنی بڑی شخصیت ان کا پروگرام دیکھنے آ رہی ہے۔ انہوں نے اس روز خاص طور پر شامیانے کے ارد گرد صفائی کروائی، پانی کا چھڑکاؤ کیا، جانوروں کو خوشبو دار صابن سے نہلایا اور پنڈال کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا کر چودھری صاحب اور ان کے ہمراہ آنے والے معززین کا انتظار کرنے لگے۔ مقامی اخبار کے رپورٹر اور فوٹو گرافرز بھی وقت پر پہنچ گئے اور شو دیکھنے میں محو چودھری صاحب کی کئی تصاویر بنا ڈالیں۔

بلو کے باپ سپیرے نے شو سے پہلے اعلان کیا کہ آج مہمانوں کے لیے اس تماشے میں حیرتوں کے مزید سامان ہوں گے تو لوگ پہلے سے زیادہ متجسس ہو کر انتظار کرنے لگے۔ منا بھی اپنے ابو اور دیگر تماشائیوں کے ساتھ مشتاق نظروں سے شیشوں کی سیج پر لیٹی بلو کی طرف دیکھنے لگا جس کا جسم ابھی تک چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ آج نہ جانے بلو کیا کرنے والی تھی، وہ سوچ رہا تھا۔ سپیرے نے دھیرے دھیرے بین بجانی شروع کر دی اور ایک مددگار نے آگے بڑھ کر بلو پر سے کپڑا سرکانا شروع کر دیا۔ بلو اس روز بہت خوبصورت چمکدار مگر پہلے سے بھی زیادہ مختصر کپڑوں میں میک اپ کیے، زیور پہنے، بالکل سیدھی لیٹی نظر آ رہی تھی۔

ابا نے اپنی لیٹی ہوئی فرمانبردار بیٹی کے جسم پر بڑے سلیقے سے ایک تختہ بچھایا تو ڈھول کی تھاپ مزید دھمکدار ہو گئی۔ بلو نے حیرت سے ابے کی طرف دیکھا مگر ابا اس وقت مصروف تھا اس لیے اس کی آنکھوں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ سانپ نے ٹوکری سے برآمد ہو کر حسب معمول بلو کو ڈسا تو بلو روز کی طرح بے حس و حرکت پڑی چھت کو گھورتی رہی۔ مگر آج ابا نے سانپ کو واپس ٹوکری میں نہیں ڈالا بلکہ اسے بلو کے جسم پہ بچھے تختے پر بٹھا دیا جسے کچھ مددگار ساتھیوں نے

دونوں طرف سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پنڈال کی بڑی بتیاں بجھا دی گئیں اور ہلکی روشنی میں تماشائیوں نے دیکھا کہ پنجرے میں قید ایک نیولا بھی سانپ کے برابر بٹھا دیا گیا ہے۔ لوگ حیرت و مسرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر سیٹیاں بجانے اور الٹی سیدھی آوازیں نکالنے لگے جس سے بلو کی آنکھوں میں مزید تحیر پیدا ہوتا نظر آنے لگا۔ نیولے اور سانپ نے ایک دوسرے کی موجودگی محسوس کرتے ہی حملے کرنے شروع کر دیے اور ایک دوسرے کو دبوچنے، کاٹ کھانے کے لیے کشمکش شروع کر دی۔ منے نے بلو کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ اس سب کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھی لہٰذا اس نے چیخنا اور کسمسانا شروع کر دیا۔ وہ بلی تو شیشوں پر ٹکا اس کا جسم قطرہ قطرہ نیچے رسنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے زور زور سے حرکت شروع کر دی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ ''ابا میرے ہاتھ کھولو..... ابا..... اس نے رسیوں سے بندھے اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا تو شور سے پنڈال گونج اٹھا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔

منے کو نہ جانے کیا ہوا وہ بلو، بلو پکارتا ہوا تیر کی طرح کرسی سے اٹھا اور اپنی دوست کے قریب جا پہنچا۔ اس کے اپنے گال بھی آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ اس نے بلا سوچے سمجھے بلو کی رسیاں کھولنے کی کوشش شروع کر دیں اور ہاتھ مار کر اس کے جسم پہ لٹکا تختہ دور اتار پھینکا۔ اسے یہ بھی نہ پتہ چلا کہ اس ساری کارروائی میں اس کے اپنے بازو میں ایک نوکیلا شیشہ دور تک گھاؤ بناتا گھستا چلا گیا ہے۔ ابا نیچے بچ گئے سانپ اور نیولے کو پکڑنے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ پولیس کانسٹیبل اکرم الٰہی نے اپنے کاکے کے بازو سے خون نکلتے دیکھا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی طرف بھاگا اور خون بند کرنے کے لیے پٹی ڈھونڈنے لگا۔ بلو کے زخمی جسم اور شیشوں کے تر بتر ہونے کے نظارے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے فوٹو گرافرز نے کھٹا کھٹ تصاویر کھینچنا شروع کر دیں اور اخبار کے رپورٹر نے اپنا قلم اور کاغذ سنبھال لیا۔

''اوئے یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' پولیس کانسٹیبل نے ڈنڈا گھمایا۔

''مائی باپ کیا بتاؤں، اس مرجانی نے تماشے کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ ایک ذرا سے نیولے سے ڈر گئی۔ بلو کے باپ نے بلو کو دھموکے لگانے شروع کر دیے۔ ''اوئے بدبختے آج وڈے چودھری صاحب آئے ہوئے تھے، آج ہی تو نے تماشہ خراب کرنا تھا؟ کیا ہوتا اگر تم اااا

چار پیسے کما لیتا؟ نذرانے ملتے تھے آج بڑے بڑے۔ بزدل کہیں کی۔ بالکل اپنی ماں پہ گئی ہے...... کمینی نہ ہووے تے"..... ابا بکے جا رہا تھا اور بلو روئے چلی جا رہی تھی۔

"اوئے کیا تماشا لگایا ہوا ہے تم نے۔ اس بچی کو ہسپتال لیکر جاؤ، اس کی مرہم پٹی کراؤ۔"

چودھری صاحب اپنی کرسی سے اٹھے کہ اب ان کی مداخلت کا وقت بھی آ چکا تھا۔ تماشائیوں نے تماشہ پورا نہ ہونے پر شور مچا مچا کر پنڈال سر پر اٹھا لیا اور کرسیاں توڑنے لگے۔

"اوئے ادھر آ" چودھری صاحب نے سپیرے کو بلایا۔ "اوئے اتنا ظلم اس معصوم بچی پر، اوئے کچھ حیا کر...... یہ کوئی تماشہ ہے؟ فٹے منہ تیرا۔"

چودھری صاحب کی ڈانٹ سن کر سپیرا گھگھیا کر معافی مانگنے لگا۔ انہوں نے اس وعدے پر اسے معاف کر دیا کہ وہ بچی کا آئندہ اس طرح تماشہ نہیں لگائے گا۔ اسے سکول میں پڑھوائے گا، اس کا علاج کروائے گا۔

چودھری صاحب نیک دل تھے، صاحب اولاد تھے، انہیں بچی کا اس طرح سے تماشہ بننا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ سپیرے نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور بچی کو لے کر ہسپتال چل دیا۔

اگلے روز منا حسب معمول سرکس کے پچھواڑے لگی بیری پہ چڑھنے کے لیے دوپہر کو بھاگ کر پہنچا تو یہ دیکھ کر زمین اس کے پیروں تلے سے نکل گئی کہ وہاں سرکس نام کی کسی چیز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ویرانی ایسے ڈیرے جمائے تھی جیسے وہاں کبھی کوئی ذی روح پھٹکا ہی نہ ہو۔ چولہوں کی بجھی ہوئی سیاہ راکھ اور بچی کھچی ہڈیاں چچوڑتی ہوئی آوارہ بلیاں سامان زیست پہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں اور بیری پھل سے لدی کھڑی تھی۔ اس روز منے نے ایک بھی بیر نہ توڑا اور چپکے سے نیچے اتر آیا، وہ پھر دوبارہ اس طرف کبھی نہ گیا۔

....

ندیم کے کہنے پر اسد نے ثمینہ سے فیصلہ کن بات کرنے کی ٹھانی اور اس کے ہاسٹل جا کر گیٹ کے باہر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ثمینہ کئی گھنٹوں کے بعد گیٹ پہ نظر آئی تو اس نے سوچا، کتنا اوور ٹائم کرتی ہے بیچاری Poor thing! اگر یہ میرا ہاتھ تھام لے تو اس کے سارے درد دور کر دوں گا۔ فیملی سپورٹ کرنے میں اس کی مدد کروں گا۔" چوکیدار کو سو روپے کا نوٹ تھما کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ثمینہ کے سیڑھیاں چڑھنے کے بعد چپکے چپکے اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔

بیل بجنے پر ثمینہ نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اسد کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اسد نے اندر آ کر دیکھا، نفاست سے سجے ہوئے کمرے میں ہلکا پھلکا فرنیچر اور ایک چھوٹا سا ٹی وی سیٹ پڑا تھا۔ دیواروں پہ کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں جو شاید فیملی والوں کی ہوں گی۔ ثمینہ نے اسے پاس پڑی کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"ثمینہ۔ واٹ از رونگ، تم کہاں غائب ہو؟ اپنا عادی بنا کر مجھے اپنے سے کیوں دور کر رہی ہو..... سویٹ ہارٹ، بند کر دو یہ جاب..... اتنی محنت کرتی ہو تم لٹ می ٹیک کیئر آف یو۔ میں جانتا ہوں تم کو بھی مجھ سے اتنا ہی پیار ہے جتنا مجھے تم سے ہے۔ یہ جذبے جینوئن ہیں تو پھر ہم کیوں انہیں جھٹلائیں؟" اسد بولتا چلا جارہا تھا کہ ثمینہ نے اس کے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا.....

"جذبے ہی تو مصیبت بن جاتے ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"میں تمہیں مصیبتوں سے بچانا چاہتا ہوں ثمینہ، پلیز مان لو میری بات....."

"تم مجھے نہیں بچا سکتے اسد..... مجھے اس بات کا پورا یقین ہے" ثمینہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اٹھی اور واش روم میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اسد نے کمرے کی چیزوں کو یونہی الٹنا پلٹنا شروع کر دیا اور دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ایک تصویر نے اس کی رگوں میں لہو منجمد کر دیا۔

بلیک اینڈ وائٹ اخبار سے تراشی گئی تصویر میں ایک بچی سرکس کے شامیانے میں لیٹی چیخیں مار رہی تھی اور ایک نوعمر لڑکا اس کے جسم سے شیشے ہٹا رہا تھا۔ ٹائٹل پر لکھا تھا "راجن پور سرکس 1970ء"

"او مائی گاڈ بلو" اسد نے واش روم سے نکلتی ثمینہ کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ چند لمحوں کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کے بدنوں میں لرزش اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

ثمینہ بولی "منے، تم کہاں سے میری زندگی میں دوبارہ چلے آئے ہو؟ اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"بلو..... بچپن سے لے کر آج تک..... میں تمہارے خیال سے کبھی آزاد نہ ہو سکا۔ جانتی ہو تم؟" وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔

"مگر میری دنیا نہیں بدل سکی اسد۔ میں اب بھی ہر رات شیشوں کی سیج پر لیٹتی ہوں اور

سانپ مجھے ڈسنے آتا ہے۔"

اسد نے غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"اسد میرے ابا اور بھائیوں کو خرچہ چاہیے۔ ایک عرصے سے بس سلسلہ حیات یونہی چل رہا ہے..... اور اب تو عادت ہو گئی ہے۔" بلو کی آنکھوں سے نیلا سمندر بہہ نکلا۔ اسد منجمد ہو گیا، اسے کہنے کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

"یہ کیا بات ہے۔ تم ایجوکیٹڈ تو ہو گئی تھیں نا..... کچھ اور کر سکتی تھیں، فیملی سپورٹ کے لیے۔ لڑکیاں نوکریاں کرتی ہیں، ہزاروں کام کرتی ہیں۔"

"ہاں مگر سنے تم جانتے ہو میں تماشہ گر کی بیٹی ہوں، میری ساری زندگی ایک تماشہ رہی ہے..... مجھے کسی اور کام میں اتنے پیسے نہیں مل سکتے تھے۔" ثمینہ نے طنز اور دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"مس ثمینہ گل میں نہیں مانتا کسی بھی تاویل کو....."

"اسد ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت بھوک ہے اور بھوک ایک سانپ ہے۔ جب یہ سانپ پھن پھیلا کر ڈسنے آتا ہے تو ایمان، عقیدے، دھرم، فلسفے، سب کے سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس کا زہر عقلیں، نسلیں، رشتے سب چاٹ جاتا ہے۔ کوئی نہیں بچتا اس کے ڈنگ سے، کوئی نہیں۔" وہ ہذیان بکتی جا رہی تھی۔

"تمہیں گھن آ رہی ہے نا، ہم غربت کی ڈنگی ہوئی لڑکیاں بڑی مجبور ہوتی ہیں سنے۔ ہم سے نفرت نہ کرو، ہمیں معاف کر دیا کرو۔"

"ثمینہ میری زندگی تو ایک خوش رنگ..... خوش ذائقہ فرحت بخش جام تھی، یہ تم نے کیا کر دیا؟" اسد شاکی لہجے میں اس کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑانے لگا۔

"سوری مگر کچھ لوگوں کے لیے زندگی وِس کا پیالہ ہوتی ہے جسے وہ گھونٹ گھونٹ پی کر جیتے جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میں جانتی ہوں اسد! اب تم سنے نہیں ہو، بڑے ہو گئے ہو، لیکن ایک بار پھر کیا تم بلو کو؟..... ادھوری بات نے بلو کے لبوں پہ ہی دم توڑ دیا۔ اسد نے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس کے کمرے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کی بار وہ بلو کو نہیں بچا سکے گا۔

▼▲▼▲▼▲▼

انجوائے یور ڈنر

''اف کتنی ٹھنڈ ہے!'' عثمان اپنے آپ سے بڑبڑایا اور کانوں کو ڈھکنے کے لیے اپنی کیپ کو ماتھے سے مزید نیچے سرکا دیا۔ ہموار ہائی وے پر تیزی سے دوڑتی ہوئی، چاروں طرف سے بند وین کو ڈرائیو کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ منطقہ بادہ شمالی میں واقع کسی ٹھنڈے دیس کی لمبی سرنگ کا سفر طے کر رہا ہو اور منزل دور سے دور ہوتی چلی جا رہی ہو۔ عثمان کو اب اس سردی کا پانچ سالہ تجربہ ہو چکا تھا مگر جنوری کے مہینے کی ''نیویارکی سردی'' اسے پہلے ہی کی طرح خوفناک اور ظالم لگتی تھی۔ وہ بہت چاہنے کے باوجود اب تک خود کو اس کا عادی نہ بنا سکا تھا۔ ہیٹر کا درجہ حرارت بڑھانے کی خاطر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ بے اختیار ساتھ والی سیٹ پر پڑے سفید رنگ کے چپٹے گتے کے ڈبے سے ٹکرا گیا۔ اس نے جلدی سے اسے یوں جھٹک کر پرے کیا جیسے انجانے میں اس نے کسی کنواری کا بدن چھو لیا ہو۔ رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ڈبے کے لمس نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش میں اس نے سڑک کنارے جمع برف کے میلے میلے ٹیلوں پر نظریں جما دیں، مگر ڈبے میں سے اٹھتی ہوئی گرم گرم اشتہا انگیز مہک کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ہتھیار پھینک دیے اور ڈبے کو بغور دیکھنے لگا۔ ''Dominos Pizza.....لارج سائز!'' سرخ رنگ کی عبارت کو اس نے مکمل توجہ سے یوں پڑھا جیسے وہ راجا اشوکا کی جانب سے نصب شدہ کسی کتبے پر لکھی وہ اہم تحریر ہو جو اس نے اپنے زمانے میں پرجا کی رہنمائی اور اخلاقی

تعلیم کے لیے سڑکوں پر لگوائے تھے۔ ڈبے کی گرم سطح پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے سے اس کے اندر زندگی کی حرارت منتقل ہونے لگی مگر اس حرارت کے ساتھ ہی خوف کی ایک بیل سی لپٹی محسوس کر کے اس نے اپنا ہاتھ پھر سے ہٹا لیا۔ وہ ڈر گیا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر اس نے ڈبے کو پھر سے چھوا تو اس کے دل میں اسے ذرا سا سائیڈ سے کھول لینے کی امنگ ٹکریں مارنے لگے گی۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے گا۔ ہو سکتا ہے وہ پیزا کے ایک سلائس کا ننھا سا ٹکڑا کتر کر منہ میں ڈال ہی لے۔ سائیڈ پر گرا ہوا کوئی مشروم یا پگھلی ہوئی پنیر کو تھوڑا سا چکھ ہی لے۔ آخر وہ صبح سے بھوکا تھا اور گھٹنے سانس والے تازہ پیزا کی خوشبو کو نظر انداز کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا، لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ اگر وہ اس حالت میں مسز بریڈلی کو پیزا پہنچائے گا تو وہ یقیناً اس میں نقص نکالے گی۔ اس کے مالک کو شکایت کا فون کر کے خود تو مفت پیزا کی حقدار ٹھہرے گی اور مالک اسے سرزنش کرنے کے بعد نوکری سے برخواست کرنے کی دھمکیاں بھی دے گا جو وہ بالکل افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ مسز بریڈلی کی پیزا ڈلیوری سے اسے اس شام کوئی ٹپ بھی نہیں ملے گی۔

اسے امریکہ آئے ہوئے اتنے سال گزر چکے تھے مگر حالات اب تک اس کے قابو میں نہیں آسکے تھے۔ پاکستان میں کتنے اچھے دن تھے۔ ابو کا لاہور میں اچھا خاصا بزنس تھا۔ گھر، گاڑی، بینک بیلنس سبھی کچھ تو تھا مگر پھر اچانک نہ جانے کہاں سے ایک ایسی سرخ آندھی آئی کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ ابو کاروبار میں سب کچھ ہار بیٹھے تو انہوں نے جانماز بچھالی اور سال بھر بیٹھے تسبیح پھیرتے رہے۔ پھر ایک روز دروازے پہ چند مولویوں نے دستک دی تو ابا جان اس دستک کے جواب میں خلقِ خدا کو راہِ حق کی طرف بلانے، تبلیغ کے جوش میں، گھر سے بہت دور نکل گئے..... اتنی دور کہ ان کے ذہن میں پیچھے رہ جانے والوں کے چہرے بھی دھندلا گئے۔ امی نے تین بھوکے بچوں کے پیٹ میں روٹی ڈالنے کے لیے مجبوراً دوسری شادی کر لی۔

سولہ برس کا ہوتے ہی عثمان نے امریکہ جانے کے خواب کی پرورش کرنا شروع کر دی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اور وہ امی اور چھوٹے بہن بھائی کو چھوڑ کر چلا آیا۔ گلابوں کی سیج دکھنے والی امریکہ کی زندگی نے اسے تگنی کا ناچ نچا دیا مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ رہنے کو گھر، نہ جیب میں پیسہ، سٹوڈنٹ ویزے پر کام کرنے کی محدود سی آزادی۔ حالات دشوار تھے مگر اس کے دل میں اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کر گزرنے کی آرزو

اتنی طاقتور تھی کہ وہ آسانی سے سب کچھ جھیلتا چلا گیا۔

امی نے کہہ دیا تھا کہ انہیں منیر صاحب یعنی اپنے دوسرے شوہر سے اپنے بچوں کے لیے کچھ مانگنا اچھا نہیں لگتا لہٰذا وہ اپنی ذمہ داریاں پہچانتے ہوئے امریکہ پہنچتے ہی انہیں کچھ نہ کچھ بھیجنے لگ جائے۔ عثمان نے اپنی امی کی بات کی لاج رکھی اور ہر ماہ جتنی رقم ممکن ہوئی بھیجنے لگا۔

رہتا تو وہ ہاسٹل کے ایک مختصر سے کمرے میں تھا مگر اس میں ٹک کر بیٹھنا اسے کم ہی نصیب ہوتا۔ کلاسیں ختم ہوتے ہی وہ فوراً اپنی پیزا ڈلیوری کے لیے نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ یہ جاب دو لحاظ سے اچھی تھی۔ ایک تو پیزا ڈلیور کرنے کے بعد اسے پانچ سے دس ڈالر تک کی معقول ٹپ مل جاتی تھی پھر کبھی کبھار اس کا مالک اسے دیر ہو جانے پر پیزا ڈلیوری وین میں سو جانے کی بھی اجازت دے دیتا تھا، جو بہر حال خوفناک سرد موسم میں کسی ویران پارک کے بنچ پر جم جانے سے بہت بہتر تھا۔

دس ڈالر کی ٹپ سے اس کے روئیں روئیں میں خوشی کے دیپ جھلملانے لگتے۔ پاکستان میں تو دس ڈالر کے کافی زیادہ پیسے بن جاتے تھے۔ امی کے گھر میں چند روز کا سودا سلف آ سکتا تھا۔ چھوٹوں کی فیسیں، کپڑے، جوتے وغیرہ آخر کچھ کم اخراجات تو نہیں تھے۔ عثمان کی خواہش تھی کہ اس کے بہن بھائی اور ماں کو کسی محرومی کا ذائقہ نہ چکھنا پڑے۔ وہ لوگ ہرے بھرے اور سکھی، ہنستے مسکراتے رہیں۔ وہ ہر لحاظ سے بچت کی کوشش کرتا۔ اکثر دن میں ایک ہی وقت کا کھانا کھا کر گزارہ کر لیتا۔

''یس! کون؟'' بیل بجانے پر ونڈر کاسل اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اپارٹمنٹ نمبر بیس بی کے اسپیکر سے آواز آئی۔

''ڈامینوز پیزا ڈلیوری میڈم'' عثمان نے اسپیکر کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

''او کے۔'' ایک بٹن دبا اور Buzz کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ زنجیر لاک میں سے لونگ روم کافی حد تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ عثمان نے دیکھا حسب معمول اولڈ لیڈی اور اس کا کتا گھر میں اکیلے تھے۔ ٹی وی باتیں کر رہا تھا اور آتشدان کی دھیمی دھیمی آگ خاموشی سے سن رہی تھی۔

''ینگ مین آخر تم پہنچ ہی گئے۔ اتنی دیر لگا دی؟ میں نے تو گھنٹہ بھر پہلے فون کیا تھا۔

کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تمہاری شکایت کروں گی۔" سر پر اونی ٹوپی پہنے بڑھیا حسب معمول بڑبڑانے لگی۔

"سوری میڈم! دراصل سردی کی وجہ سے وین نے سٹارٹ ہونے میں کچھ دیر لگا دی تھی، اسی لیے۔" عثمان معذرتانہ لہجے میں بولا۔

"اچھا اچھا، ٹھیک ہے، لاؤ ادھر، اور یہ لو" بڑھیا نے پیزا کا گرم گرم ڈبہ لیتے ہوئے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں میں ٹپ تھما دی۔

"تھینک یو میڈم Enjoy your dinner" عثمان یہ کہہ کر روایتی امریکی انداز میں مسکرا کر اپنی وین کی طرف چل دیا۔ وین میں بیٹھنے سے پہلے ہی اس نے سبز سبز ڈالر گننے شروع کر دیے جنہیں کو چھوتے ہی اس کے شکم میں گرما گرم روٹیوں کی لذت بھری تسکین سی اترنے لگ گئی تھی۔

"دھت تیرے کی! بڑھیا کنجوسی کر گئی۔" دس کی جگہ آج اس نے محض سات ہی ڈالر دے کر اسے ٹرخا دیا تھا۔ عثمان کا پیٹ یکدم روٹیوں سے جیسے خالی ہو گیا اور بھوک بلا بن کر اس پر حملہ آور ہو گئی۔ یہ اس کی آخری کسٹمر تھی۔ اس کے حساب سے آج اسے مجموعی طور پر کم ٹپ ملی تھی جس کی وجہ سے اس کا بجٹ خراب ہو گیا تھا۔ اب وہ آج رات کے کھانے پر محض پانچ ڈالر ہی خرچ کر سکتا تھا۔

اس نے میکڈونلڈ کا رخ کیا اور ان کی سب سے سستی ڈیل کا مینو دیکھتے ہوئے آرڈر دے کر انتظار کرنے لگا۔ سارا کھانا پل بھر میں ہی ختم ہو گیا مگر بھوک بدستور برقرار رہی۔ خستہ، بھربھرے آلوؤں کی آخری قاش کو وہ دیر تک کیچپ میں بھگو کر دانتوں سے کترتا رہا۔ "کیوں نہ ایک اور برگر لے لوں!" اس کے دل میں خواہش ابھری۔ "نہیں" اندر سے جواب آیا۔ پچھلے ہفتے امی نے کہا تھا گھر میں نیا پینٹ کروانا ہے، پرانا پلستر ہر وقت اکھڑا اکھڑ کر گرتا رہتا ہے۔ کوئی آیا گیا ہو تو بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ پھر امی نے یہ بھی کہا تھا کہ ماموں کی بیٹی کی شادی آ رہی ہے اور ان کے ہاتھ میں سونے کی کوئی چیز نہیں۔ انہیں لازماً ایک کڑا بنوانا ہے ورنہ لوگ کیا کہیں گے بیٹا امریکہ میں ہے اور ماں کے ہاتھ سونے۔ چھوٹا بھائی رضوان بھی نئے ڈی وی ڈی پلیئر کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوے کو ٹٹولا اور پھر کچھ سوچ کر ہاتھ باہر نکال لیا۔

میکڈونلڈ میں بیٹھے لوگ مزے سے آئس کریم، ایپل پائی اور شوگر کو کیز سے لطف اندوز ہوتے نظر آ رہے تھے۔ عثمان نے اپنی نظریں باہر گرتی ہوئی سفید سفید برف پر ٹکا دیں۔ ایک تیز غصیلی آواز نے یکا یک اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ نان سینس۔ یہ میرے ساتھ دوسری بار ہوا ہے۔ آپ لوگوں کی کوئی کوالٹی کنٹرول بھی ہے یا نہیں۔ اپنے منیجر کو بلائیے" عثمان نے پلٹ کر دیکھا، درمیانی عمر کا ایک سوٹڈ بوٹڈ آنکھوں پر چشمہ، سر پر ہیٹ پہنے معزز سا شخص کاؤنٹر پر کھڑا کیشئر لڑکی سے بلند آواز میں شکایت کر رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں منیجر بھی آ گیا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو سرو کرنے سے پہلے ہر برگر کو فروزن سیکشن سے نکال کر اسی وقت تیار کرتے ہیں۔ خراب گوشت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا سسٹم تو آٹو میٹک ہے۔" منیجر نے تحمل سے صفائی پیش کی۔

"تو آپ کا خیال ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ کل شام جو بگ میک میں نے یہاں سے خرید کر کھایا تھا وہ انڈر کک تھا، یا وہ میڈ کاؤ کا گوشت تھا۔"

"میڈ کاؤ؟" منیجر اور لڑکی نے بیک وقت حیرت کا اظہار کیا۔

منیجر نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرے کسٹمرز بھی متوجہ ہونے لگے تھے۔

"آئی ایم سوری! ایسا تو ممکن ہی نہیں۔" منیجر کسٹمر کو کچھ خبطی سا سمجھ کر ہولے سے مسکرایا۔

"اس برگر میں سے ناخوشگوار بو آ رہی تھی مگر میں پھر بھی کھا گیا کہ آخر میکڈونلڈ کا ہے، خراب کیسے ہو سکتا ہے مگر گھر جاتے جاتے میری طبیعت خراب ہو گئی اور مجھے قے آ گئی۔ وہ تو شکر ہے میں نے گاڑی پارک کر دی اور سڑک کے ایک جانب ہو کر قے کر دی ورنہ میری گاڑی کا ستیاناس ہو جاتا اور آپ لوگوں کو اس کی صفائی کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے۔"

"ویری سوری! آپ کو تکلیف ہوئی۔ اب بتائیے ہم آپ کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔" منیجر نے معاملہ نبٹانا چاہا۔ "کیا آپ ایک بالکل فریش meal پسند کریں گے جو خاص طور پر آپ کی پسند کے مطابق بنایا جائے گا۔ فری آف چارج، آف کورس!" کیشئر گرل نے مہذب انداز میں درخواست کی۔

کسٹمر نے پل بھر کو کچھ سوچا، اپنی گھڑی دیکھی اور سر ہلا کر اپنی پسند کا برگر بنوانے لگا۔

''آپ بیٹھئے، ہم خود ہی کھانا لے آتے ہیں۔'' یونیفارم پوش لڑکی مسکرائی اور معزز شخص میز پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ "Enjoy your dinner" لڑکی نے تازہ تازہ بنے ہوئے ویل ڈن برگر اور فرنچ فرائز مع کمپلیمنٹری ایپل پائی سے بھی ٹرے کسٹمر کے آگے رکھ دی اور مسکرا کر اپنے کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

عثمان اپنا کھانا کب کا ختم کر چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنا کوڑا، کوڑے دان میں پھینکا، سر پہ سرخ کیپ جمائی، پیزا ڈلیوری کی جیکٹ پہنی اور باہر نکل گیا۔

اگلی شام جب وہ ساؤنڈ پونڈ سر پر ہیٹ، آنکھوں پر چشمہ لگائے اپنے ہوسٹل کے کمرے سے نکلا تو اس کے ساتھ والے کمرے والا رالف اسے پہچانے بغیر یونہی Hi کہہ کر پاس سے گزر گیا۔ عثمان پوری دو پہر لگا کر سیکنڈ ہینڈ کلوتھنگ شاپ سے کی گئی شاپنگ یاد کر کے مسکرا مسکرا کر منہ سے سیٹی بجائے گیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

راہ میں پڑنے والے پہلے ہی میکڈونلڈ پر اس نے گاڑی پارک کر دی اور کھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ پر شکم ہو کر واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا، آج کے برگر جتنے مزے دار تھے اتنے پہلے کبھی کیوں نہیں لگے۔ مفت کھانا کھانے کا مزا اتنا زبردست تھا۔ اس نے ایک فیصلہ کر لیا کہ اسے منہ کا مزا بدلتے رہنا چاہئے۔ آخر نیویارک شہر ہر طرح کے ریستورانوں سے بھرا پڑا ہے۔ کبھی اٹالین، کبھی میکسیکن، کبھی فرنچ، کبھی چائنیز، اچھا ہے جگہیں بھی بدلتی رہیں گی۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے مزے سے برداشت کرتے ہوئے اس نے حساب لگایا۔ اب کی بار امی کو پینٹ کروانے کے اخراجات کے ساتھ ساتھ وہ سونے کے کڑے کی رقم بھی بھیج سکے گا اور چھوٹا بھائی رضوان تو ڈی وی ڈی پلیئر لے کر اچھلتا پھرے گا۔ ''انجوائے مائی ڈیئر'' وہ دھیمے سروں میں گنگنانے لگا اور پیزا ڈلیوری کے لئے گاڑی تیز بھگا دی۔

ایک تھی ملکہ

ابھی رات کے صرف دس ہی بجے تھے کہ ملکہ کی طبیعت میں بے چینی شروع ہو گئی۔ سنڈریلا کی طرح وہ بھی رات بارہ بجے سے پہلے ہر قیمت پر اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ یہی وقت تھا اس کے دل کی مراد کے بر آنے کا، اس کی اور اس کے محبوب کی ملاقات کا۔ اس سے اس کے دل کے تار خوشی سے جھنجھنا اٹھتے اور وہ خود کو ہوا میں تیرتا محسوس کرتی تھی۔

بارہ کا گجر بج جانے پر ان دونوں کے گھر بھاگنے کا منظر بھی ایک سا ہوتا تھا۔ سنڈریلا، پارٹی کے مہمانوں کو حیرت زدہ چھوڑ، شیشے کی سینڈل پہن، اپنی خوبصورت بگھی میں جلدی جلدی جا سوار ہوتی اور تنومند گھوڑوں کی شکل میں تبدیل ہو جانے والے اس کے دوست مریل چوہے، اسے گھر پہنچانے کو سرپٹ دوڑنے لگ جاتے۔ ان دونوں کے گھر پہنچنے کے بعد کے حالات میں تھوڑا بہت فرق البتہ ضرور تھا۔

سنڈریلا کے گھر بہت سے بے مہر رشتہ دار اس کا انتظار کر رہے ہوتے جبکہ ملکہ کے گھر اس کا محض ایک ہی تعلقدار اس کا استقبال کرتا ملتا۔ تنہائی کی ماری ملکہ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے کی کوشش کرتی۔ کوئی دعوت، بنگلی ساتھیوں کی کوئی بیٹھک، رشتہ داروں کی کوئی تقریب، کوئی نہ کوئی جگہ اسے بہرحال مل ہی جاتی اور وہ یوں اپنے گھر میں تنہا شام گزارنے کے آزار سے بچ جاتی۔ اس کے سب دوستوں کو پتہ تھا کہ وہ رات بارہ بجے کے بعد رکا نہیں کرتی۔ مگر وہ اس بات کا برا ماننے کے بجائے ہنس کے نظر انداز کر دیتے تھے کیونکہ وہ اس کی وجہ سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

سنڈریلا کی طرح اس کی بھی مخصوص گھجر بج جانے پر جون بدل جایا کرتی تھی۔ سنڈریلا حسین وجمیل، متمول شہزادی سے دوبارہ ایک مفلوک الحال یتیم لڑکی میں تبدیل ہو جاتی اور ملکہ ایک خوش باش ہنستی مسکراتی، پراعتماد، اپنی ذات میں مکمل شخصیت سے ایک کمزور اور اداس عورت بن جاتی۔ سنڈریلا آنیوالے وقت کی شہزادی تھی اور اس ملکہ کا راج پاٹ مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ جو اس کے کچھ لگتے تھے انہوں نے بن باس لے لیا تھا اور اب ان کے درمیان فاصلوں کا بحرظلمات حائل ہو چکا تھا۔

اس نے وقت دیکھا۔ ابھی اس کے گھر پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ تقریب جاری تھی مگر اسے اٹھنا ہی تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب کو خدا حافظ کہا اور باہر سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی اپنی ہزار سی سی پاور کی پرانے ماڈل کی بگھی کو سٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھما دی۔ چند لمحوں کی گھوں گھوں کے بعد انجن کو رحم آ گیا اور وہ تیز تیز ڈرائیو کرتی گھر کو روانہ ہو گئی۔ تیسری منزل پر واقع اپنے گھر کی سیڑھیاں پھلانگتے پھلانگتے اس کا سانس پھول گیا مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ ان سے ملنے میں اب چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔ چابی گھما کر دروازے کو زور سے کھولنا ہی چاہتی تھی کہ یکدم اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا خیال آ گیا، جو اندر موجود تھا، اور اس کی تاک میں رہتا تھا۔ اس کا انتظار کرتا تھا۔ ملکہ کا خون جگر پی پی کر موٹا تازہ، ورندہ بن کر پورے گھر میں دندناتا پھرتا تھا۔

"ہیلو!" ملکہ نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی اور اپنے بھائیں بھائیں کرتے گھر کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

"آ گئیں سیر سپاٹا کر کے؟" سناٹا ایک سڑیل خاوند کی طرح چیخنے چھاڑنے، دھاڑنے لگا۔ گھر کی دیواریں یکبارگی زور سے لرزیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ وہ پہلو بچا کر اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ وہ بھی ساتھ ہی اندر گھس آیا اور اسے کپڑے بدلتے دیکھنے لگا۔ ملکہ نے شوشو کر کے اسے بھگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ "مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟" وہ زور زور سے طنزیہ قہقہے لگانے لگا اور اچانک اپنے نوکیلے پنجے اس کی روح میں گاڑ دیے۔

"تم کہیں دفعان نہیں ہو سکتے؟" ملکہ نے جھلا کر کہا اور ٹی وی آن کر دیا۔ سناٹے کو کاٹنے کے لیے وہ اکثر یہی کیا کرتی تھی، مگر حسب معمول ٹی وی بھی اس کے سامنے گونگا بن

کر بیٹھ گیا اور ماحول ویسے کا ویسا ہی رہا، اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

''میرے ساتھ ہی گزارہ کرنا سیکھو۔'' درندہ کچھ ڈھیلا پڑتا ہوا غرایا۔

ٹھیک بارہ بجے ملکہ نے اپنا جادو کا ڈبہ آن کیا اور سٹارٹ کا بٹن دبا دیا۔ ''Login نام بتائیے۔'' حکم ملا۔

''گزرا ہوا کل۔'' اس نے جواب دیا۔

موسیقی کی ایک مدھر لے کے ساتھ ہی راج محل کی طرف جانے والی بندر رہگزر ایک سمندر میں تبدیل ہو گئی اور لکڑی کا ایک موٹا سا تنا بہتا بہتا اس کی طرف آ گیا۔

''Enter ہونے کے لیے اسم اعظم؟'' سوال کیا گیا۔

ملکہ نے اپنا خفیہ اسم بتا دیا۔ ''جنت''

''کنکیٹ کروایا جائے۔'' اذن ملتے ہی برقی تاروں کا جال ادھر سے ادھر اچھل اچھل کر چھلانگیں مارنے لگا۔ ملکہ اشتیاق سے جادو کے ڈبے کی سکرین کو تکنے لگی جہاں اسے کچھ ہی دیر بعد ان سے ہمکلام ہونا نصیب ہونا تھا۔

راج محل کی سرزمین بھی عجیب تھی۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور آسمان پر عنکبوت کا تنا ہوا جال۔ ملکہ کو آگے سفر کرنے کے لیے اسی سمندر پر Surf کرنا تھا۔ وہ Log کو مضبوطی سے تھامے اعتماد سے آگے بڑھنے لگی۔ تار عنکبوت کے سفید ریشمی ریشوں پر جھولتی رکاوٹیں پھلانگتی، وہ جلد ہی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کتنا پراسرار تھا یہ راستہ! کتنی پُر پیچ تھی یہ وادی! کتنی دنیائیں تھیں راہ میں آباد اور کتنا گھنا تھا ہنکتوں کے درختوں کا پراسرار جنگل۔ Yahoo ایک بندر ٹہنیوں پر اِدھر سے اُدھر چھلانگیں مارتا چیخا۔

''کس سائٹ پر جانا ہے؟'' اگلے دربان نے وضاحت طلب کی۔

''گرما گرم..... لیجیے، گرم گرم۔'' ایک ڈاکیئے نے وصال و فراق کے جذبوں میں سلگتی ڈاک کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے آواز لگائی۔

''طلسم ہوشربا سے دل بہلائیے گا؟''

''تازہ ترین اخبارات، رسائل؟''

''اجنبی لوگوں سے دل کی باتیں، گپ شپ؟''

ریڑھیوں پر مختلف قسم کا سامان سجائے ریڑھی والے اپنی اپنی بولیاں بولتے اس کی جانب آئے اور پھر غائب ہوتے چلے گئے۔

''مجھے تو صرف MSN کے دروازے کی انٹری چاہئے اور کچھ نہیں۔'' ملکہ نے حسب معمول اپنی سادہ سی خواہش کا اظہار کیا۔ MSN کے دونوں نمایاں بت چمک کر اپنی موجودگی کا سگنل دینے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی وہ ان دونوں بتوں کو ایک میں تبدیل کردے گی تمام پتھریلی راہیں ہموار ہو جائیں گی اور وہ اپنے تینوں شاہزادوں سے ہمکلام ہو سکے گی۔

پہلی سعی سے ہی پہلی ونڈو کھل گئی۔ ''امی آپ کیسی ہیں؟'' ڈبے کی ساکت سطح پر ایک پرمسرت چیخ ابھری اور ساری سکرین پر چھا گئی۔

''جی میری جان!'' ملکہ کی انگلیوں نے جلدی جلدی جواب دیا اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ دور دیس میں اس وقت دن کے دو بجے ہیں۔ بڑی شہزادی کے آفس میں بھی بریک ٹائم تھا لہٰذا وہ اسی وقت ماں سے بات کیا کرتی تھی۔ ونڈو میں محصور بڑی شہزادی نے کہانیوں کی Repunzel ری پنزل شہزادی کی طرح اپنے لانبے سنہرے بال کھڑکی سے نیچے لٹکا دیئے۔ ری پنزل کا محبوب شہزادہ تو ان بالوں پر جھول کر اوپر آ جایا کرتا تھا مگر بڑی کی محبوب ماں ان بالوں کی نرمی کو چھو تک نہ سکتی تھی۔ بس وہ انہیں دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ جاتی۔

''ٹن۔'' سے ایک گھنٹی بجی۔ اعلان ہوا ولی عہد شہزادہ آن لائن تشریف لا رہے ہیں۔

''السلام علیکم امی۔'' اس نے پیار سے اپنے بیٹے کو پچکار کر جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نائٹ ڈیوٹی سے آنے کے بعد اسی وقت سو کر اٹھا ہوگا۔

''امی جی آج بہت نیند آ رہی تھی، شفٹ کچھ لمبی ہوگئی تھی۔''

''ہائے صدقے جاؤں کچھ کھایا تو نہیں ہوگا۔'' ماں کے کلیجے میں ٹیس اٹھی۔

''نہیں ابھی ناشتہ بناؤں گا میں نے کہا پہلے آپ سے بات کرلوں ورنہ آپ پریشان ہوں گی۔'' سات سمندر پار کی ورکنگ کلاس کے ایک نمائندے نے جواب دیا۔ ملکہ کا دل کٹ کے رہ گیا۔ کاش میں اس کے پاس ہوتی۔ اس کو ناشتہ بنا کر دیتی۔ اس کے گھر کی صفائی کر دیتی۔

''امی جی مجھ سے بھی بات کریں نا۔'' تیسری ونڈو میں کھڑی ننھی شہزادی نے ضد کرتا

شروع کر دی۔ وہ کب سے اپنی باری کی منتظر تھی۔

"میری لاڈو رانی، میری شہزادی تیرے صدقے جاؤں کیا کر رہی ہے تو؟" انگلیوں نے تختۂ حروف پر بے چینی سے متوالا رقص شروع کر دیا۔

"کلاس میں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے نا مجھے ہوسٹل کا باتھ روم شیئر کرنا پڑتا ہے اس لیے شاور کا بھی مزا نہیں آتا۔"

منی شہزادی نازوں کی پلی تھی مگر اپنی یونیورسٹی میں اب ایک عام سٹوڈنٹ جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ "اور پھر باتھ روم میں لوٹا بھی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پھولوں کو پانی دینے والا ایک فوارہ رکھا ہوا ہے جسے چپکے سے باتھ روم میں لے جاتی ہوں۔ ایک دن میری روم میٹ کہنے لگی۔ ہم نے تو باتھ روم میں کوئی پلانٹ نہیں دیکھے تو پھر تم کیوں یہ واٹر کین لئے جا رہی ہو؟"

منی شہزادی کا یہ جملہ سنتے ہی دوسری ونڈوز میں موجود اس کے دونوں بھائی بہن، زور زور سے ہنسنے لگے اور سمائلنگ چہرے بنا بنا کر سکرین پر پھول کھل کھلانے لگے۔ ملکہ بھی محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ شریر کہیں کے، اسے تینوں پر یکلخت پیار آ گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ یہ بھول گئی کہ وہ اس سے اتنی دور تھے۔ اسے بالکل ایسا لگا جیسے وہ آج بھی اس کے آنگن میں لگے امرود کے پرانے درخت تلے آپس میں کھیل رہے ہوں، لڑ جھگڑ رہے ہوں، دور دیس کی کسی آدم منڈی میں کھپے ہوئے کمین نہ ہوں۔

"میری بچی! باہر برف گر رہی ہوگی۔ سنو شوز اور دستانے پہنے بغیر باہر نہ نکلنا۔ سردی میں احتیاط کرنا۔" اس نے ننھی شہزادی کو تنبیہ کی۔

"اماں آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا پراٹھا بہت یاد آ رہا ہے۔" شہزادے نے حسرت بھرا پیغام بھیجا۔ ملکہ کے دل پہ کٹاری لگی مگر وہ خاموش رہی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ لٹی ہوئی راجدھانی کی ملکہ کی زندگی کی بساط تو کب کی الٹ چکی تھی۔ اس کے کوکھ جنے اپنا اپنا نصیب کھوجنے سات سمندر پار کوہ کنی میں مصروف تھے۔ وہ پیچھے رہ گئی تھی مگر پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھی تو احساس تنہائی اسے اس قدر پریشان کر دیتا کہ اسے لگتا وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھے گی۔ اسی لیے اس نے اس جادو کے ڈبے کو اپنا رازدان بنا لیا تھا۔ ہر رات اپنے بچوں سے گپ کرتی اور یوں ایک کے بعد ایک دن گزارنے میں کامیاب ہو جاتی۔

کچھ دیر کبوتر ادھر سے ادھر کی پیغام رسانی میں مصروف رہے۔ پھر حسبِ معمول، دھیرے دھیرے ونڈوز بند ہونے کا وقت آ گیا۔ شہزادے کو ناشتہ بنانے کے بعد دو دن کے جمع شدہ برتن دھونا تھے۔ منی کی کلاس شروع ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے اور بڑی شہزادی کے آفس کا بریک ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ اگلی شب ملنے کا وعدہ کر کے انہوں نے اپنے اپنے کواڑ بند کر لیے اور اپنی اپنی زندگیوں میں واپس لوٹ گئے۔

ملکہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ سکرین، جو ابھی کچھ ہی دیر پہلے زندہ اور متحرک تھی، ٹھنڈی اور بے جان ہو گئی۔ کہاں گئے وہ! ابھی تو یہیں تھے۔ مادر ملکہ نے اپنے بچوں کے گرم لمس کو محسوس کرنے کے لیے سکرین پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا اور اس زندگی بخش حرارت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ تین ستارے کچھ ہی دیر پہلے ایک ویران تاریک آسمان پر چمکے تھے اور اسے منور کر دیا تھا، مگر اب آسمان اکیلا تھا۔ میل ہا میل تک گہرائیوں سے اونچائیوں تک تنہا اور سنسان۔

جدائیاں اس کی زندگی میں بار بار آتی رہیں، تاہم وہ ان سے سمجھوتہ نہ کر سکی تھی۔ راج پاٹ الٹ جانے کے بعد سب سے پہلے بڑا شہزادہ اس سے علیحدہ ہوا تھا۔ فلائٹ کی رات وہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں چھپ چھپا کر آنسو بہا رہی تھی کہ وہ اسے تلاش کرتا ہوا اسی تک آ پہنچا اور خاموشی سے اس کے گرد بازو ڈال دیے۔ وہ تو چلا گیا مگر اس کی خوشبو ہمیشہ کے لیے اس سے چپک کر رہ گئی۔

اس کے جانے کے چند سالوں بعد بڑی شہزادی کو ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور اس نے بھی اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ فلائٹ کی رات وہ ہنس ہنس کر ماں اور چھوٹی سے باتیں کرتی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد غسل خانے جا کر تے کرتی رہی۔ پھر ننھی شہزادی اور ملکہ نے کئی سال اکٹھے گزار دیے۔ دونوں نے سہیلیاں بن کر رہنا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خوشیوں کے باغ سے پھول چنتیں، تتلیوں سے کھیلتیں، درختوں کے سائے تلے جا لیٹتیں، کھانے کھاتیں، ٹی وی دیکھتیں، موج اڑاتیں۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی کہ ایک دن چھوٹی کا بھی دور دیس کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا اور وہ برف ڈھکے ایک شہر کے سفر کو روانہ ہو گئی۔

مادر ملکہ کی کوکھ سے درروزہ کی آخری لہر اٹھی اور اسے بے بس کر گئی۔ ننھی کے جانے کے بعد اسے پہلی بار سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہو جانے کا احساس ہوا۔ اب اس کے پاس اپنی ذات کے

علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ننھی شہزادی کے کمرے میں جا بجا بکھرے اس کے بالوں کے کلپ، ربڑ بینڈ، سٹکرز، پوسٹرز، کیسٹیں، سٹفڈ Stuffed کھلونے، اس کی جدائی سے نڈھال نظر آتے تھے۔ دیواروں سے وہ نغمے چپک کر رہ گئے تھے جو کبھی اس کے کیسٹ پلیئر سے نکل کر اسے خوش کیا کرتے تھے۔ اس کے کمپیوٹر سے آنے والی ٹک ٹک کی مسلسل آواز، ٹیلی فون کے ریسیور سے پھسل کر باہر آنے والے، اس کی سہیلیوں کے قہقہے سب کہیں روپوش ہو گئے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے وہ؟ جب چیزیں وہاں پر نہیں رہتیں جہاں وہ ہوتی ہیں تو پھر کہاں چلی جاتی ہیں؟ وہ سوچتی رہتی۔

اب سارا دن گھر میں خاموشی کی اداس دھند چھائی رہتی جس سے بچنے کے لیے ملکہ دن بھر باہر رہتی۔ درودیوار ایک دوسرے سے لپٹے اس کی آمد کا انتظار کرتے اور اس کا سنگی ساتھی سناٹا سارے گھر پر راج کرتا۔

وقت کافی ہو چکا تھا۔ اسے آج کی رات کو شٹ ڈاؤن کرنا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر گھمائی۔ اس کا شریک حیات اس کے چاروں طرف چھایا ہوا اُسے چپ چاپ تکتا چلا جاتا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے اس کی طرف دیکھا...... ہوں...... ویسے اتنا برا بھی نہیں اس کا وجود۔ ملکہ نے ایک نئی سوچ کو کلک کیا۔ سناٹے کی ایک اپنی اہمیت اور ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ سناٹا نہ ہوتو ''بگ بینگ'' کے بعد کائناتیں وجود میں نہ آئیں۔ سلسلے آگے ہی نہ چلے۔ تخلیق کا کنول جب سکوت کے تالاب میں کھلتا ہے تو زیادہ دلفریب اور خوشبودار ہوتا ہے۔ سنڈریلا گزرے ہوئے کل کی خیالی شہزادی تھی اور ملکہ آج کی حقیقی عورت۔

یکدم ملکہ کی ساری افسردگی Delete ہونے لگی۔ اس نے مکمل سپردگی کے ساتھ اپنا وجود اپنے شریک حیات کے حوالے کر دیا۔ کتنا نرم و ملائم، پیارا اور ہمدرد تھا وہ۔ اسے بے اختیار اس پر پیار آنے لگا۔ اب سناٹا اسے اپنا دشمن نہیں بلکہ ایسا پرخلوص دوست محسوس ہو رہا تھا جس کی اپنائیت بھری گود میں تحفظ ہی تحفظ تھا۔ اسے یقین تھا اس کا یہ ساتھی اسے کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

رات والی بات

پلیٹ فارموں پہ بھاگم بھاگ، ایک ریزرویشن کھڑکی سے دوسری پر کھڑی ہو کر، بالآخر ہیلا نے ٹکٹ حاصل کر ہی لیا۔ ٹرین کا وقت نو بجے تھا اور ابھی شام کے صرف سات بجے تھے۔ اسے ہر صورت یہ ٹرین پکڑنا تھی اس لیے وہ وقت سے بہت پہلے ہی سٹیشن پر آ گئی تھی۔ اطمینان سے ٹکٹ کو پرس میں ڈالنے کے بعد اس نے بڑے سے پرانے طرز کے پلیٹ فارم کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا پلیٹ فارم کافی بوسیدہ حالت میں تھا۔ چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے کی وجہ غالباً ناقص وائرنگ یا انتظامیہ کی غفلت ہو سکتی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا کمزور پاور کے زرد بلب اداسی سے ٹمٹما رہے تھے۔ مسافر بہت کم تھے شاید اس لیے کہ ایک تو ان دنوں ریکارڈ سے زیادہ ٹھنڈ پڑ رہی تھی پھر یہ کہ چھٹیاں بھی تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ کچھ دن پہلے ہونے والی ٹرین دہشت گردی کی وجہ سے بھی شاید کچھ گھروں میں دبک گئے تھے۔

عام حالات میں تو وہ بھی شاید ان دنوں یہ سفر اختیار نہ کرتی مگر اس وقت ذہنی طور پر اسے اپنے منظر نامے سے ہٹ کر ایک نئے منظر نامے میں داخل ہونے کی ضرورت تھی۔ تعلیمی کانفرنس میں شرکت تو محض ایک بہانہ تھی، دراصل وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو بہلانا چاہتی تھی جو لہو لہان ہو کر قطرہ قطرہ اس کے اندر ٹپک رہا تھا۔

دراصل چند ہفتے قبل اس کے عزیز دوست اس کے جینے کے سہارے، باسط نے اچانک اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ وجہ نہیں جانتی تھی اس لیے حیران پریشان رہ گئی کہ ایسا

کیوں ہوا؟ باسط اور وہ دونوں تنہا تھے اسی لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اس کی بیوی چند سال قبل ایک حادثے میں جاں بحق ہو چکی تھی اور اب وہ اکیلا ہی اپنے تین بچوں کو پال رہا تھا۔ جہاں تک بیلا کا سوال تھا تو اس نے کبھی کسی سے ناطہ جوڑا ہی نہ تھا لہٰذا اس کا نہ کوئی بال تھا نہ بچہ۔ جوانی چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھا لکھا کر قابل کرنے میں بتا دی اور جب ذمہ داریوں سے فارغ ہوئی تو سر میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔ زندگی کی تیز دھوپ میں چلتے چلتے اس کے پاؤں جلنے لگے تھے کہ ایک روز اچانک باسط اس کی زندگی میں آ گیا اور سائبان کی طرح اس پہ چھا گیا۔ بیلا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو عزیز از جان سمجھ کر تھام لیا اور اس کو ہی اپنی دنیا بنا لیا۔ اس کی بے رنگ زندگی میں کہیں کہیں رنگ کے چھینٹے پڑنے لگے۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ تین سالوں کی رفاقت کے بعد یکدم باسط نے راستہ بدل لیا اور شہر چھوڑ کر ہر ناطہ توڑ کر رابطہ کیے بغیر کہیں غائب ہو گیا۔

بیلا کو کچھ سمجھ نہ آئی۔ اب وہ اپنے اسی دکھ کو گود لیے بیٹھی تھی کہ اس کے کالج والوں نے اپنی نمائندگی کے لیے اسے کسی دوسرے شہر کی تعلیمی کانفرنس میں بھیجنا چاہا۔ بیلا نے موقع غنیمت جانا اور سامان باندھ لیا۔ دل نے کہیں لگنا نہ تھا مگر اس نے پھر بھی اپنے آپ کو سمجھایا اور چند روز کے لیے چل دی۔

اب وہ کانفرنس ختم کر کے واپس گھر لوٹ رہی تھی، دوسرے شہر میں دن مصروف اور اچھے گزرے تھے مگر دل میں اب بھی سناٹا تھا، لب پہ سوال اور طبیعت میں انتشار۔ باسط کے رویے کی وجہ سے وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پلیٹ فارم پہ نظر دوڑائی، کافی سنسان دکھائی دیتا تھا۔

''یا اللہ کہیں مجھے پورے ڈبے میں اکیلے ہی سفر نہ کرنا پڑ جائے۔'' اس کے دل میں ایک خدشے نے جنم لیا، چند مشکوک سی شکلوں اور حلیئے والے لوگ، کھیس ٹوکریاں ٹرنک اور الم غلم سامان لیے بیٹھے نظر آئے، نہ جانے کون لوگ تھے؟ یہ کوئی دہشت گرد تو نہیں؟ بیلا اپنے وہم پہ خود ہی ہنس دی۔ دور اندھیرے کونے میں پلیٹ فارم کے کنارے ایک شخص دکھائی دیا۔ حلیئے سے شہری اور پڑھا لکھا لگتا تھا، بیلا نے شکر کیا کہ کوئی ڈھنگ کا مسافر اسے نظر آیا اور اپنا سامان گھسیٹتی ہوئی آرام سے اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

''ایکسکیوزمی کیا آپ لاہور جا رہے ہیں'' بیلا نے سوال کیا۔

"جی ہاں، آپ بھی؟" "آیئے آپ بھی میرے ساتھ یہاں انتظار کر لیجئے" وہ شائستگی سے بولا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ خاتون اکیلی ہونے کی وجہ سے کچھ گھبرا رہی ہے۔ بیلا نے اس پہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالی، سلونے رنگ کا، درمیانے قد و قامت کا عام سے نقوش والا نوجوان تھا۔ سر پہ اونی ٹوپی چڑھائے، آنکھوں پہ چشمہ پہنے، خاصہ معقول آدمی دکھائی دیتا تھا، اس سے بات چیت کر کے کچھ وقت کاٹا جا سکتا تھا۔ بیلا کو تسلی ہو گئی۔

"میرا نام حبیب ہے، میں وکیل ہوں اور اپنی این جی او چلاتا ہوں۔"

اجنبی نے اپنا تعارف کرایا، بیلا نے بھی اخلاقاً اسے اپنے بارے میں مختصراً بتا دیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں ایک محتاط حد تک دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔

"چلیں اچھا ہوا آپ مل گئیں ورنہ میں تو خاصہ بور ہو رہا تھا" وہ مسکرایا۔

"تھینکس" بیلا نے بھی خوش دلی سے جواب دیا اور ٹرین کے انتظار میں اپنی گھڑی پہ وقت دیکھنے لگی۔

ٹرین آئی تو دونوں اپنے سامنے آ جانے والے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ بیلا نے غیر شعوری طور پر اپنے پاس کھڑی ایک دیہاتن کو اشارہ کر کے کہا "تم بھی ہمارے ساتھ اس ڈبے میں آ جاؤ" تو وہ خوشی خوشی اس کی دعوت قبول کر کے اپنا سامان لے کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ تینوں ایک ہی ڈبے میں برابر برابر کی سیٹوں پہ پوری پوری برتھ لے کر بیٹھ گئے۔ ٹرین میں جگہ ہی جگہ تھی، کوئی مسئلہ نہ تھا پورا ڈبہ اپنا تھا۔

بیلا نے بیٹھ کر محسوس کیا، لکڑی کے پھٹوں والی سیٹیں کافی تکلیف دہ اور چبھنے والی تھیں وہ اپنے ساتھ صرف ایک ہی کمبل لائی تھی جسے اگر وہ نیچے بچھا لیتی تو اوپر کیا لیتی! اس نے بادل نخواستہ کمبل کو ہی نیچے بچھا لیا اور خود شال لے کر لیٹ گئی۔ حبیب بھی اپنا کمبل اوڑھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور اچٹتی ہوئی نظروں سے ڈبے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سردی ہڈیوں تک اترتی محسوس ہو رہی تھی مگر مجبوری تھی رات تو کاٹنا ہی تھی۔

"بھیا ذرا ادھر آؤ، آ کر میرا بستر بند تو کھلوا دو" دیہاتن نے ڈبے میں موجود واحد مرد کو مدد کے لیے پکارا۔ حبیب لپک کر اٹھا اور جا کر اس کے بستر بند کی پٹیاں کھولنے لگا۔

''اتنا بڑا ابسرڈ'' بیلا کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''دراصل میں اپنی بہنوں کے لیے گاؤں سے رضائیاں بنوا کر لے جا رہی ہوں۔''

.....''عقلمند ہے رضائیاں لائی ہے'' بیلا نے انگریزی میں حبیب سے کہا وہ بھی مسکرا دیا۔ دونوں نے رضائیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو دیہاتن تاڑ گئی کہ ماجرا کیا ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں۔''

''ایسا کریں آپ لوگ ایک ایک رضائی اوڑھ لیں'' وہ پیار سے بولی۔

''ارے نہیں کیسے ہو سکتا ہے، یہ آپ کی بہنوں کے تحفے ہیں بھلا ہم کیسے لے سکتے ہیں

بیلا ہچکچائی۔

''لے لیں نہ کوئی بات نہیں۔'' دیہاتن نے اصرار کیا، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، انہوں نے اس کی فراخدلانہ آفر کا فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً ہی رضامندی ظاہر کر دی اور نئی نکور تازہ بھروائی ہوئی رضائیوں میں سے ایک ایک اپنے لیے چن لی۔ اب رات اتنی گراں نہ گزرے گی، انہیں اطمینان ہو چلا تھا۔

''اللہ جی اگر یہ قبولیت کی گھڑی تھی تو کاش میں آپ سے کچھ اور ہی مانگ لیتی'' بیلا نے حسرت سے سوچا، اسے باسط شدت سے یاد آنے لگا۔ اس نے دکھ سے ہونٹ بھینچ لئے، آنکھوں سے کجرا بہہ کر گالوں پہ لڑھکنے لگا تو بیلا نے حالات و ماحول کا اندازہ لگا کر خود کو سنبھالا اور ذہن کو ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک جانے سے بچانے کے لیے کچھ اور سوچنا شروع کر دیا۔

اسے خیال آیا اس نے تو رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا، یہ سوچ کر اس نے شاپنگ بیگ سے اپنے لیے سینڈوچ نکالا، پانی کی بوتل کھولی اور ڈنر کا اہتمام کرنے لگی۔ حبیب کو بچوں کی طرح اپنا منہ تکتے دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور اس کو بھی اپنے آدھے سینڈوچ کی آفر کر دی۔

''نہیں نہیں، آپ کھائیں میں کھا کر آیا ہوں'' وہ تکلف سے بولا۔

''ارے ارے لے لیں، کوئی بات نہیں'' بیلا کے تھوڑے سے اصرار کے بعد اس نے سینڈوچ لے لیا اور کھانے لگا۔ دیہاتن بھی اپنے پراٹھے کھا کر لیٹنے کا بندوبست کرنے لگی۔

کھانے کے بعد بیلا نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے اور آ کر اپنے سرہانے والی کھڑکی کو مکمل طور پر بند کرنے کے لیے اسے زور سے گرایا مگر کھڑکی نہ جانے کب کی پھنسی ہوئی تھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس میں سے آتی ٹھنڈی برفیلی ہوا نیزے کی طرح آ کر انہیں چبھ رہی تھی۔ حبیب اپنی

سیٹ سے اٹھا اور بیلا کی مدد کرنے کے لیے کھڑکی سے زور آزمائی کرنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنے گلے کا مفلر اتارا اور اس کھلی درز میں پھنسا دیا جس سے ہوا کافی حد تک اندر آنا بند ہو گئی۔

اس ملی جلی کاوش پر اس نے مسکرا کر حبیب کا شکریہ ادا کیا تو اس نے اس کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ارد گرد رضائی کو اچھی طرح لپیٹ کر منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔

ابھی اسے لیٹے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک آواز نے سے چونکا دیا

''اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں آپ کے پاس آ سکتا ہوں؟'' حبیب کے منہ سے فقرہ کیا نکلا کہ گویا کوئی راکٹ میزائل بیلا کے جسم میں آ کر پیوست ہو گیا۔ وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔

''ہیں یہ آپ نے کیسی بات کی ہے؟ کچھ خدا کا خوف کریں، میں آپ کی ماں کے برابر ہوں، اگر میں نے آپ سے بات چیت کر لی تو اس کا آپ نے یہ مطلب نکالا؟ پلیز کچھ غلط سوچنے کی ضرورت نہیں آپ کو؟'' اس نے غصے سے اجنبی ہم سفر کو جھاڑ دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ حبیب خیر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے بیٹا کہہ سکتی مگر اس وقت اس کے منہ سے بس یہی نکل سکا۔ وہ خاموش رہا، ایک لفظ بھی نہ بولا مگر پھر بھی بیلا اندر سے کچھ ڈر سی گئی۔ اسے ایسی کسی بات کی ہرگز توقع نہ تھی وہ بڑی پر اعتماد عورت تھی۔ کسی بھی منزل پہ ڈگمگا جانے کا اسے کبھی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن یہ؟

اس اجنبی ہم سفر نے آخر اسے ایسا کیوں کہا تھا؟ وہ سمجھ نہ پائی سوال اس کے ذہن میں تیرے جا رہا تھا اور جواب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رات کا سناٹا ٹرین کا تقریباً خالی ڈبہ، شدید سردی ایک ان جانے شخص کی موجودگی۔ وہ پوری طرح چوکنی ہو گئی..... نہیں خیر، ایسی جرات تو وہ نہیں کر سکتا۔ پڑھا لکھا، مہذب اور تمیز دار آدمی لگتا ہے۔ ایسی بیچ بات؟ وہ سوچتی چلی گئی..... ایک دوسرے خیال نے اس کا دل دکھا دیا، اے کاش..... آج رات اس ڈبے میں باسط ہی ہوتا تو کتنا اچھا لگتا، کتنی رومانوی اور یادگار رات ثابت ہوتی..... ایسا فلمی سٹائل کا موقع بھلا حقیقی زندگی میں کہاں ملتا ہے، کیوں نہ میں باسط سے یوں انتقام لے لوں؟ اسے اس کی بے وفائی کا مزا ہی چکھا دوں، یکدم اس کے اندر کی کمینی عورت بولی۔ مگر نہیں مجھ میں اس طرح کا انتقام لینے کی بھلا کہاں قابلیت ہے؟ بھاڑ میں گئی پارسائی کی عادت، اس نے اپنے آپ کو کوسا، مگر بات یہ نہیں تھی بات تو بس صرف محبت کی تھی، صرف محبت ہی ایک ایسا جذبہ تھا جس کے لیے وہ ہر حد پار کر سکتی تھی ورنہ جسم سے اسے کوئی

لاگ نہ تھا اور باسط اپنی ساری محبتیں اس سے چھین کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سی عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو جھوٹ موٹ اپنے دام میں پھنسا کر وقت گزاری کر لیتی ہیں؟ وہ تو اس معاملے میں بالکل کوری تھی۔

وہ تو تمام عمر زندگی کے سمندر میں بس یونہی ادھر ادھر بہتی چلی گئی تھی۔ موجوں کے تھپیڑوں نے اسے اٹھا کر ادھر سے ادھر پٹخ دیا مگر کبھی ساحل تک نہ پہنچنے دیا۔ وہ جینا چاہتی تھی سو ہاتھ پاؤں مار کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اردگرد سے بہت سے تنکے پانی میں سے بہہ کر گزرتے گئے اور وہ انہیں گزرتا دیکھتی گئی۔ باسط عام مردوں سے مختلف تھا۔ بیلا نے اسے ایک مضبوط شہتیر سمجھ کر اپنا وجود اس کے حوالے کر دیا تھا مگر وہ بھی محض ایک کمزور تنکا نکلا، وقت کے دھارے میں بہہ کر کہیں دور نکل گیا اور بیلا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتی رہ گئی۔

اور اب یہ واقعہ، ایک اجنبی شخص کی یہ بات.....اس کا مطلب تو اسے سمجھ میں آ گیا تھا مگر وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔

اس کے بعد پوری رات حبیب نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ سفر دھیرے دھیرے کٹتا گیا، صبح پانچ بجے یکا یک ٹرین ایک سونے سے پلیٹ فارم پر جا کھڑی ہوئی۔ بیلا رات بھر جاگتی رہی تھی مگر اس نے یوں ظاہر کیا جیسے بے فکری سے سوتی رہی ہو اور اب کہیں جا کر آنکھ کھلی ہو۔

''کیا ہوا!'' دیبا تن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''میں دیکھتا ہوں'' حبیب ذمہ دارانہ انداز میں اٹھا اور باہر جا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔

''ٹرین میں کچھ خرابی ہو گئی ہے ہمیں یہیں اترنا ہو گا، بعد میں دوسری ٹرین آ کر ہمیں یہاں سے لے کر جائے گی۔'' اس نے اندر آ کر دونوں خواتین کو خبر دی۔

''اوہ نو مجھے تو آج صبح بڑی ضروری اسائنمنٹ کالج پہنچانا تھی۔'' بیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''مجھے تو آج بھانجے کے عقیقے میں پہنچنا تھا۔ ہائے ربا اے کی ہو گیا؟'' دیبا تن بے زاری سے بولی، حبیب اور بیلا نے ادھار مانگی ہوئی رضائیاں جلدی جلدی اتاریں اور لپیٹ کر اسے واپس کر دیں، حبیب نے اٹھ کر رضائیاں دوبارہ پہلے کی طرح بستر بند میں بند کر دیں

اور دونوں خواتین کا سامان اٹھا کر پلیٹ فارم پہ اتارنے لگا۔ ایسے وقت میں قلی کا دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ لہٰذا دونوں عورتیں حبیب کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی مدد کروانے لگیں۔

سامان اتارنے کے بعد وہ تینوں کسی طے شدہ منصوبے کے بغیر پلیٹ فارم پہ ایک طرف کو چل دیئے اور ایک بنچ کے قریب پہنچ کر اپنا سامان رکھنے لگے۔ کھلے آسمان تلے، ٹھنڈی یخ تاروں بھری رات میں یوں انجان جگہ، اجنبی لوگوں کے ساتھ بیٹھے بیلا کو لگا جیسے وہ تینوں کسی آرٹ فلم کے کردار ہوں اور حقیقی زندگی سے ان کا دور دور تک واسطہ نہ ہو۔

وہ سب یونہی کئی گھنٹے چپ چاپ بیٹھے رہے تب کہیں جا کر سوئے ہوئے سورج نے آنکھ کھولی اور اپنے تمازت بھرے قدم پلیٹ فارم پہ رکھ دیئے۔ کچی کچی دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی انہوں نے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سٹیشن ماسٹر کے اس اعلان نے کہ ٹرین ابھی کئی گھنٹے تک نہیں آنے والی، ان کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

چائے کا سٹال کھلتے ہی حبیب ان دونوں کے لیے چکی سی نیم گرم چائے لے آیا جسے عام حالات میں بیلا بالکل نہ پیتی مگر اس وقت مجبوری تھی لہٰذا چپکے سے کپ تھام کر چسکیاں لینے لگی۔ دیہاتن کے باتھ روم جاتے ہی حبیب بیلا کے پاس چلا آیا اور نظریں جھکا کر بولا۔

''دیکھئے میں رات والی بات پہ بہت نادم ہوں، آئی ایم سوری۔''

بیلا نے نظریں نیچی ہی رکھیں مگر کہے بغیر نہ رہ سکی'' آپ مرد لوگ آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ کوئی عورت اگر آپ سے خود بات کر لے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اویل ایبل ہوگئی ہے؟ میں تو ایسے موقعوں پر خود کو عورت بھی نہیں سمجھتی تو پھر آپ نے کیسے سوچ لیا کہ......؟''

بیلا جھوٹ بول رہی تھی حالانکہ وہ تو اپنے آپ کو بہت زیادہ عورت سمجھتی تھی۔ اس کا پرابلم یہ بھی تھا کہ وہ ایک بھرپور، حساس، زندگی سے بھرپور زندگی کی طالب عورت تھی۔ اب جو کسی نے اسے اندھی کھائی میں دھکا دے دیا تھا تو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اپنا عورت پن لے کر کہاں چلی جائے، جیتی جاگتی عورت سے لکڑی کی بے جان گڑیا کیسے بن جائے۔

وہ دن بھر بے چینی سے ٹرین کا انتظار کرتے رہے، ٹرین کہیں جا کر شام چھ بجے آئی، حبیب ان دونوں ہم سفر خواتین کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لیے لے کر آتا رہا، کبھی ان سے ٹرین اور موسم کے بارے میں بات کر کے انہیں حوصلہ دیتا پھر کبھی یونہی چپکے سے پاس بیٹھا رہتا۔ بیلا

دل ہی دل میں کچھ الجھی جا رہی تھی، یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ بے چینی میں اٹھ کر کبھی چہل قدمی کرنے لگتی تو بہت دیر تک چکر لگاتی رہتی اور پھر تھک ہار کر ان دونوں کے پاس ہی واپس آتی۔ کئی گھنٹے ساتھ گزارنے کی وجہ سے ان میں ایک عجیب سی دوستی اور یگانگی، توجہ اور لاتعلقی، اجنبیت اور شناسائی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا، کبھی وہ لوگ ایک دوسرے سے روٹھے روٹھے منہ موڑے رہتے اور کبھی بالکل آرام سے بات کرنے لگتے۔

بیلا اس کے ہاتھ سے بسکٹ کا ٹکڑا پکڑ لیتی اور کبھی آنکھ تک نہ ملاتی۔ وہ یوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت کاٹ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے کچھ لگتے بھی تھے اور نہیں بھی، حبیب اگر ذرا دیر کو ادھر ادھر ہو جاتا تو دیہاتن کہتی "مجھے تو پریشانی ہو رہی ہے، بھائی کہاں چلا گیا ہے؟" ایک بار بیلا کافی دیر کے لیے دوسرے پلیٹ فارم پہ ٹہلنے چلی گئی، واپس آئی تو دیہاتن فکر مندی سے بولی "شکر ہے ہماری باجی آ گئیں ہم دونوں تو فکر مند ہو رہے تھے کہ آپ کہاں چلی گئیں آئیں بیٹھیں بہت تھک گئی ہوں گی آپ۔"

بیلا نے بھی اس وقتی رشتہ داری کو کسی نہ کسی طور پر قبول کر لیا تھا۔ شام چھ بجے تک سب مسافر تھکن سے چور، سردی اور بھوک سے بے صبرے ہو چکے تھے۔

ٹرین آئی تو پھر حبیب نے ان دونوں کا سامان اندر اٹھا کر رکھا۔ "آپ کو سٹیشن پہ لینے کوئی آئے گا؟" حبیب معذرتانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"گھر والے، اس وقت باہر ہوں گے کسی کو میرے آنے کی خبر نہیں، میں رکشہ لے کر چلی جاؤں گی" وہ خوامخواہ جھوٹ بول گئی جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے گھر میں کوئی تھا ہی نہیں، وہ صرف ایک ملازمہ کے ساتھ رہتی تھی۔

"مجھے لینے گاڑی آئے گی، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا" وہ تمیز سے بولا۔

"تھینکس، آپ نے پہلے ہی کافی مدد کر دی ہے۔"

میں کسی طرح رات والی بات کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں پتہ نہیں وہ کون سا ایک پل تھا کہ میں نے آپ سے ایسا کچھ کہہ دیا۔"

"بس پلیز ذکر نہ کریں اس بات کا، میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے ایسا کہا کیوں؟" بیلا نے سوال کیا مگر حبیب نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہا، وہی

مردوں کی مصلحت آمیز خاموشی، یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' اسے غصہ آنے لگا۔

لاہور سٹیشن آیا تو حسیب نے سب سے پہلے خود اتر کر دونوں ہم سفر خواتین کے لیے قلی ڈھونڈنے شروع کر دیے، الگ الگ سامان لوڈ کروانے کے بعد پہلے دیہاتن کو روانہ کیا۔ بیلا کے منع کرنے کے باوجود ایک قلی کو اپنے پاس سے پیسے دیتے ہوئے تاکید کی کہ بی بی کو احتیاط سے رکشے میں سوار کروائے اور تنگ نہ کرے۔

''خدا حافظ'' وہ بولا۔

بیلا پل بھر کو رکی'' آپ نے اتنی زیادہ مدد کی، اس کا بہت بہت شکریہ، اتنا خیال رکھا آپ نے.....'' جواب میں حسیب نے اسے اپنا کارڈ تھما دیا۔

''ہم شاید اب زندگی میں کبھی نہیں ملیں گے۔'' بیلا نے قلی کو اشارہ کیا.....وہ ابھی تک مخمصے میں پڑی ہوئی تھی کہیں اس نے مجھے کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں سمجھ لیا تھا؟ مگر میرے تو کسی انداز یا بات سے اسے ایسا آئیڈیا نہیں مل سکتا تھا شاید.....شاید اس کے دل میں میرے لیے کوئی کشش پیدا ہو گئی ہو؟ وقتی کشش''.....وہ سوچنے لگی۔

''مگر میرا تو حلیہ بھی کسی صورت ایسا نہیں تھا کہ کوئی ڈھنگ کا آدمی میری طرف ملتفت ہو سکتا.....تن پہ سادہ سا موٹا کھدر کا سوٹ، سر پہ کس کے لی ہوئی گرم شال، پاؤں میں جوگرز، چہرہ مکمل طور پر میک اپ سے عاری جس پہ بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو چکے تھے۔ اگر ایسی حالت میں بھی میں ایک جوان آدمی کو اچھی لگ رہی تھی تو اس کا مطلب ہے میں ابھی اتنی گئی گزری نہیں ہوں، اس خیال کے آتے ہی بیلا کے دل میں دھنک سی اترنے لگی۔ ٹھیک ہے باسط نے مجھے چھوڑ دیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے وقعت ہو گئی ہوں۔ مجھے خود پر اعتماد نہیں کھونا چاہیے جہنم میں جائے وہ بے قدرا.....اس کا مطلب ہے رات والی بات.....ایک کمیلی منٹ تھی۔ بیلا کے ذہن کے بادل چھٹ گئے جگ ساپزل کا آخری ٹکڑا جڑ گیا اور تصویر مکمل ہو گئی، معمہ حل ہو گیا۔ بیلا کے چہرے پہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''کمیلی منٹ'' کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ قلی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کے قدم ہوا میں تیرنے لگے۔

▼▲▼▲▼▲▼

روز ڈیل کی روزی

لفٹ میں سے اترنے چڑھنے والے کا چہرہ اسے دیکھ کر کھل اٹھتا۔ ہر کوئی اسے ہائے روزی، ہیلو روزی، ہاؤ آر یو روزی کہہ کر بلاتا اور اس طرح کا ایک آدھ فقرہ کہتا "سویٹ گرل..... آج تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو، ارے کہاں تھیں اتنے دن؟ نظر نہیں آتی ہو تو بلڈنگ سونی سونی لگنے لگتی ہے۔" روزی ہنستی، مسکراتی، سب سے ہاتھ ملاتی اور جواب میں ایک پیار بھرا جملہ کہہ کر آگے بڑھ جاتی۔ لفٹ کے اس کی منزل کے پہنچانے تک وہ نہ جانے کتنوں سے ہی ڈھیروں باتیں کر چکی ہوتی۔

رحمان پورہ اچھرہ کی رضیہ بیگم، روز ڈیل برانکس نیویارک کی روزی کیسے بنی کسی کو اس کی خبر تھی نہ پروا۔ انہیں تو بس یہ پتہ تھا کہ روزی کتنی میٹھی طبیعت والی تھی اور کتنے اخلاق سے پیش آتی تھی۔ روز ڈیل میں اولڈ پیپلز کی رہائش کے لیے کئی خوبصورت منظم، پرآسائش بلڈنگیں کھڑی تھیں مگر سٹی فلاور رفاہی بلڈنگ ہی وہ خوش قسمت رہائش گاہ تھی جہاں پر روزی جاب کرتی تھی۔

رہائشی بوڑھے اور بوڑھیوں سے، خوبصورت صحت مند، شوخ رنگوں کے سکرٹ اور ٹائٹ پہنے چالیس پینتالیس سالہ روزی جب ہنس کے ملتی، ان سے چھیڑ چھاڑ کرتی تو وہ خوشی سے جی اٹھتے۔

"تم مجھے روز نظر آیا کرو روزی، ورنہ میں اداس ہو جاتا ہوں۔"

چارلس اپنا کئی بار دہرایا ہوا فقرہ دہراتا تو روزی ہنس کے اس کا بازو تھپتھپاتی.....

"ڈرٹی اولڈ مین..... میں سب سمجھتی ہوں۔"

''ارے ڈک تم نے آج بڑی سیکسی شرٹ پہنی ہوئی ہے۔'' وہ ڈک کو چھیڑ دیتی تو وہ اپنی نقلی بتیسی نکال کر کھی کھی کرنے لگ جاتا۔

یہی تھی روزی کی روزمرہ کی زندگی اور یہی اس کے لوگ۔ نیویارک میں رہنے والے اس کی فیملی کے دیگر لوگ اسے چھیڑتے کہ تو بڈھوں کی ہو کر رہ گئی ہے تو وہ ان کی بات کا برا نہ مناتی بلکہ کہتی ''ان میں رہنے سے میں خود کو جوان اور توانا سمجھتی ہوں کیونکہ وہ مجھے ایک لڑکی کی طرح محسوس کرواتے ہیں اور میں خوش ہو جاتی ہوں۔''

روزی اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ اس کا شوہر شیخ طفیل اور دو بیٹے بھی برانکس کے ایک سستے سے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ تو سمت میں واقع یہ تنگ و تاریک، سیلن زدہ اپارٹمنٹ روزی کو بالکل نہ بھاتا تھا مگر کیا کرتی مجبوراً رہے جا رہی تھی۔ غریب ہسپانوی، میکسیکن کالے اور کچھ انڈین پاکستانی لوگوں سے آباد، پرانی سی میلی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ روزی کو جیل خانہ محسوس ہوتی تھی، اسی لیے وہ خوشی خوشی روز ڈیل میں جاب کرنے چلی جاتی تھی۔ جہاں بڈھوں کے لیے بنے ہوئے کانڈومینیم روشن، کشادہ اور خوبصورت تھے۔ ان میں اچھے کیئر ٹیکرز کی ہمیشہ سے آسامی خالی رہتی تھی۔

رضیہ کا شوہر شیخ طفیل ایک نکما، شہدا، بڑبولا، ڈینگیں مارنے والا سیالکوٹیا تھا جسے بیوی کے جاب کرنے سے بہت آرام ہو گیا تھا۔ روزی کماتی اور سارا گھر کھاتا تھا، کبھی کبھار شیخ صاحب کوئی چھوٹی موٹی نوکری برائے نام بھی کر لیتے تاکہ خاندان والے محض بیوی کی کمائی پہ پلنے والا سمجھ کر انہیں کم اہم نہ سمجھنے لگے جائیں۔ ویسے بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ وہ رضیہ کو اس کی خوشی کی خاطر ہی جاب کرنے کی اجازت دے رہے ہیں....

''جانی، میں تو تجھے گھر بٹھا کر، رانی بنا کر کھلانا چاہتا ہوں مگر جب تو صبح سویرے بن ٹھن کر، سنور کر جاب پہ جاتی ہے تو مجھے بڑی پیاری لگتی ہے۔ بس تجھے یونہی ہنستا مسکراتا دیکھتا رہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میرا کہاں جی چاہتا ہے تجھے بوڑھوں کا گو موت صاف کرتے دیکھوں، تو انہیں کھلائے پلائے، اپنا اور ہمارا قیمتی وقت انہیں دے مگر بس تیری خوشی کا خیال آ جاتا ہے تو خود کو سمجھا لیتا ہوں۔''

''آپ کے لیے روٹی بنا کر چنگیر میں رکھ دی ہے۔ سالن فریج میں پڑا ہے گرم کر کے کھا لینا اور مجھے ٹائم پہ لینے آ جانا.....'' روزی مسکرا کر جواب دیتی۔

اسے اچھی طرح پتہ تھا شیخ صاحب کی باتوں میں کتنی صداقت ہے۔

"میری سرکار آپ کا یہ تابعدار آپ کا خادم، آپ کا ڈرائیور پورے وقت سے ایک بھی منٹ لیٹ کئے بغیر آپ کی بلڈنگ کے آگے کھڑا ہوگا، آپ فکر ہی نہ کریں۔"

وہ تابعداری سے جواب دیتے۔ انہوں نے بیوی کو جاب کرنے کی آزادی تو دے دی تھی مگر اسے ڈرائیونگ نہیں سکھائی تھی، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سونے کی چڑیا ان کے کھینچے ہوئے دائرے میں ہی اڑے، پھڑ پھڑا کر کہیں دور نہ نکل سکے۔ ڈرائیونگ سکھانے کا مطلب تھا گاڑی کانڈومینیم بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ کی حدود سے باہر اور مقررہ وقت سے آگے پیچھے بھی کہیں ہو سکتی تھی اور یہ انہیں کسی صورت بھی منظور نہ تھا۔

اب کے سمر سیزن میں مینجمنٹ نے اس کی اچھی کارکردگی دیکھ کر اسے ایک مستقل جاب کی آفر کر دی تھی۔ اسی سالہ بوڑھے یہودی جیسی Jesse سپیلبرگ کو روزی جیسی کیئر ٹیکر کی ہی ضرورت تھی۔ اس اولڈ پیپلز ہاؤسنگ کمپلیکس میں پاکستانی، انڈین اور دیگر کئی قومیتوں کی بہت سی کیئر ٹیکر ملازم تھیں مگر مستقل جاب کسی اچھے ریکارڈ والی کیئر ٹیکر کو ہی دی جاتی تھی۔ چند پاکستانی کیئر ٹیکر نے رضیہ کو ایسی مستقل جاب مل جانے پہ اوپر اوپر سے مبارکباد تو دے دی مگر دل ہی دل میں ان کا حسد سے برا حال ہو گیا۔ ایسی اچھی جاب نہ جانے ان کے نصیبوں میں کیوں نہیں آئی تھی۔

بوڑھے جیسی کی بیوی بہت سال پہلے گزر چکی تھی اور بچے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ بیٹا اپنے بال بچوں کے ساتھ فلاڈلفیا میں خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا اور بیٹی شیرل اپنے "لونلی ڈاگ" کیئر سنٹر کو پوری جانفشانی سے چلانے کے لیے دن رات ایک کر رہی تھی۔ بے گھر کتوں کی آبادکاری اور دیکھ بھال ہی اس کی زندگی کا مشن تھا۔ دونوں بچوں کو پتہ تھا کہ ان کے لاچار باپ کو روزی نے ایک نئی زندگی بخش دی ہے وہ مکمل خلوص اور محنت سے اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس کی کیئر میں کسی قسم کی بھی لاپرواہی شامل نہ ہوتی تھی۔ وہ مطمئن تھے اور اسی لیے اپنی نارمل زندگیاں گزارے جا رہے تھے کہ باپ کی طرف سے اب انہیں کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی۔

روزی اکثر لانڈری روم میں جیسی کے کپڑے دھوتے ہوئے اپنی ساتھی ورکرز سے کہتی۔

"دیکھو یہ لوگ ہمارے اپنے بزرگوں کی طرح ہیں۔ بے بس اور لاچار۔ ان کی جتنی بھی خدمت کریں کم ہے۔ اس کا اجر ہمیں اللہ تعالیٰ کے گھر سے ملے گا۔ یہ سمجھ لو اس پردیس میں یہی ہمارے ماں باپ اور بڑے ہیں۔"

جمیلہ اور عظمیٰ "آپ ٹھیک کہتی ہیں باجی" کہہ کر ہاں میں ہاں ملا دیتیں، مگر پانچ بچوں کی ماں، ٹیکسی ڈرائیور طیب حسین کی مطلقہ عابدہ کو اس کا یہ فلسفہ ایک آنکھ نہ بھاتا اور وہ جھنجھلا کر زور زور سے واشنگ مشین کے بٹن دبانے لگتی۔ اسے ان کمبخت بوڑھوں کی خدمت کرنا زہر لگتا تھا مگر وہ اپنے حالات سے مجبور تھی۔

"روزی ڈیئر، کہاں رہ جاتی ہو۔ جلدی سے کھانا کھلاؤ، مجھے بھوک لگی ہے۔"

جیسی نے روزی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی شور کرنا شروع کر دیا۔

"ابھی آئی۔ بس ایک منٹ، ذرا کوٹ اور سنو شوز اتار لوں۔" روزی نے اسے جواب دے کر شانت کیا اور خود جلدی جلدی جوتے اتار کر گھر کی چپل پہننے لگی۔ بوڑھا جیسی انتظار کرتے کرتے کھڑکی میں سے نظر آتے آسمان کو دیکھنے لگا۔ سرمئی آسمان سے لگاتار برف گر رہی تھی اور سورج کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ سب دن ایک سے تھے، ٹھنڈے اور منجمد، مگر اب روزی کے آ جانے سے ماحول میں زندگی کی تپش محسوس ہونے لگی تھی۔

روزی نے گھر میں داخل ہوتے وقت دروازے پر پیک شدہ کھانے کا لٹکتا ہوا لفافہ اتار لیا تھا جسے وہ کھول کر اب ٹرے میں سیٹ کرنے لگی تھی۔ "Meals on wheel" نامی ادارے کا نمائندہ صبح گیارہ بجے ہی بوڑھوں کی غذائی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے متوازن تازہ اور لذیذ کھانا دروازے پہ چھوڑ جایا کرتا تھا تاکہ کسی کو ان کے لیے خاص کھانے نہ تیار کرنے پڑیں۔ روزی نے گندم کی بریڈ، گوشت، سبزی، پھل، دودھ اور میٹھا، سب کچھ اچھی طرح سے ٹرے میں جما دیا اور کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس نے بستر کا لیور دبا کر سرہانہ اونچا کیا اور بوڑھے کے کمزور جسم کو اپنی پوری طاقت سے کھینچنے کے بعد پشت سے ٹکا کر بٹھا دیا اور کھانا کھلانے لگی۔ وہ کھانا کھلانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتی اور جیسی کو بتاتی تھی کہ "میں خدا کے نام سے تمہیں کھلانے کا آغاز کر رہی ہوں۔ تم بھی خدا کا نام دہراؤ۔" وہ ہوں ہاں کرتا اور سر ہلا دیتا تو وہ پیار سے اس کا بڑا سا گنجا، سرخ و سفید سر ہلا کر کہتی۔ "وے جیسی تیری ایسی کی تیسی" وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ایک بچے کی طرح مسکرانے لگتا اور تابعداری سے منہ کھول دیتا۔

اس سے پہلے جیسی کو اور بھی کئی کیئر ٹیکرز نے سنبھالا ہوا تھا، اس کو کھلایا پلایا، اس کی نجاستیں صاف کی تھیں مگر جس انہماک اور پیار سے روزی اس کی کیئر کرتی تھی وہ بے مثال

تھا۔ ایک مدت بعد جیسی کو لگا جیسے اس کی خالی زندگی پھر سے بھرنے لگی ہو۔ کوئی اپنا اس کی زندگی میں چلا آیا ہو۔ کسی اجنبی، انجان ملک کی غیر مذہب کی عورت نے اس کی زندگی میں اجالا بھر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت خوش رہنے لگ گیا تھا۔ وہ اب اپنے بچوں کے آنے کی راہ نہیں دیکھتا تھا۔ اس کے ویران گھر میں آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی تھی اور گھر، گھر لگنے لگ گیا تھا۔

روزی اسے کھلانے پلانے کے بعد گرم پانی میں سپنج بھگو کر اسے آرام آرام سے صاف کرتی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت سے، بوڑھے کے جسم میں زندگی کی تمازت آنے لگتی تو وہ شوخی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور آنکھ مار کر مسکرانے لگتا۔ ایسے میں روزی اسے پیار سے چپت لگاتی اور پنجابی میں ایک دو گالیاں دے کر ہنسا دیتی۔ بوڑھا ہنسنے لگتا تو اس کا بڑا سا، لمبا تر نگا وجود، بیڈ کی آہنی اطراف سے ٹکرا ٹکرا کر شور کرنے لگتا۔ دونوں کے درمیان اسی قسم کا ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔

شیخ صاحب دیکھ رہے تھے کہ وہ اس کی رضیہ پہ بہت انحصار کرنے لگ گیا ہے۔ اب اسے رضیہ کی ایک بھی چھٹی گوارا نہ ہوتی تھی۔ رات کو وہ گھر آ جاتی تو بوڑھا بے چین اور بے قرار رہتا۔ رات والی کیئر ٹیکر گو کہ بہت اچھی تھی مگر اس میں روزی جیسا اپنا پن نہ تھا اس لیے جیسی کو سنٹرل ہیٹنگ والے اپارٹمنٹ میں ہونے کے باوجود لگتا جیسے وہ کسی ٹھنڈی قبر میں پڑا ہوا ہو۔ ایک رات اس نے روزی سے گڑگڑا کر کہا۔ ”روزی تم رات کو بھی گھر نہ جایا کرو، یہیں رک جایا کرو۔ میں تمہیں ڈبل ریٹ دوں گا۔ پلیز ہم یہ فیور دو مجھے۔ میری ریٹائرمنٹ کا پیسہ اور کس کام آئے گا..... پلیز۔“

”جیسی ہنی تم جانتے ہو کہ میرا ایک ہزبینڈ اور دو بیٹے بھی ہیں۔ انہیں بھی میری ضرورت ہوتی ہے اور ابھی ایک بیٹا تو اتنا بڑا بھی نہیں ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر رات کیسے یہاں رہ سکتی ہوں؟ ” روزی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم چھوٹے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آیا کرو..... دوسرا بیڈ روم تو خالی ہی پڑا رہتا ہے نا۔“ اس نے التجائیہ انداز میں روزی سے درخواست کی۔

رضیہ نے گھر آ کر ڈرتے، ڈرتے شیخ طفیل سے ذکر کیا کہ بابا جیسی مجھے رات بھی وہیں رکنے کو کہہ رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ملکیت پسند شوہر اس بات سے بھڑک اٹھے گا اور کہے گا ”جانی اپنے گھر کے علاوہ تم کہیں اور رات گزارو یہ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں، میں تمہیں Miss کرتا ہوں۔“ جب تم مجھ سے دور ہوتی ہو“..... وغیرہ وغیرہ۔

حیرت انگیز طور پر شیخ صاحب نے بڑے غور اور تحمل سے پوری بات سنی اور پھر کہا۔
"ڈبل ریٹ دے گا بڈھا؟ بڑا دل نکال رہا ہے یہودی۔ جانی ایک بات میں بار بار سوچ رہا ہوں، تمہیں اس کا اپارٹمنٹ بہت پسند ہے، ہے نا؟"
"ہاں کیوں نہیں۔ ہماری اس تنگ و تاریک، سیلن زدہ کھنڈ سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے۔
روزی نے اپنے کاکروچوں بھرے پرانے خستہ اپارٹمنٹ پہ نظر ڈالی۔ نہ جانے کب ہم یہاں سے کہیں اور شفٹ ہوں گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"جانی تمہاری خوشی کو سامنے رکھتے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں تمہیں بابے کے گھر شفٹ ہو ہی جانے دوں۔ صاف ستھرا علاقہ ہے، ماڈرن اپارٹمنٹس والا روشن اپارٹمنٹ ہے۔ پھر سارے رہائشی بوڑھے بوڑھیاں تمہارے واقف ہیں۔ تم زیادہ خوش تو وہیں رہتی ہو نا؟"
اگلے ہی روز رضیہ اپنے چھوٹے بیٹے سہیل کو لے کر جیسی کے گھر شفٹ ہو گئی۔ کبھی کبھار اس کا شوہر اسے وہاں ملنے آ جاتا اور کبھی کبھار جیسی کی اجازت سے وہ گھر آتی اور سب کو اپنے من کی مراد ملتی رہتی۔ جیسی اب اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک پل بھی اس کے بغیر نہ رہتا۔ وہ فون بھی سننے جاتی تو بستر پر لیٹے لیٹے زور زور سے اسے پکارنے لگتا۔
روزی..... روزی۔" وہ دوڑی چلی آتی تو خوش ہو جاتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگتا۔ ایک شام اس نے جیسی سے خصوصی طور پر گھر جانے کی اجازت مانگی کیونکہ شہر میں رہنے والے اس کے بڑے بھائی اقبال حج سے لوٹے تھے اور اس نے انہیں کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ روزی نے کرسٹینا کو اپنی جگہ سٹینڈ بائی کیا اور خود گھر چلی گئی۔ حسب ہدایات کرسٹینا نے جیسی کو ہر دو گھنٹے بعد کروٹ بدلانا چاہی، مگر اتنے بڑے ڈیل ڈول والے مرد کو وہ سنبھال نہ سکی اور اس کا سر بیڈ کی سائیڈ سے ٹکرا دیا۔ خود وہ بے خبر ہو کر رات بھر گہری نیند سوتی رہی۔
صبح روزی آئی تو اسے یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ نہ تو کرسٹینا نے اسے اچھی طرح صاف کیا تھا اور نہ ہی رات کی دوائیاں ہی وقت پر دی تھیں، جیسی غصے اور تکلیف سے بڑبڑا رہا تھا۔ چند دنوں بعد جیسی کے بچے اس کی خیریت معلوم کرنے آئے تو انہیں انتظامیہ نے اس واقعے کی رپورٹ دی جس پر وہ بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے اپنے باپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اکیلا یا نامناسب کیئرر میں نہ چھوڑنے کی سختی سے تنبیہ کی۔" ہم اپنے باپ کی بہترین کیئر کے لیے ہر

قیمت دینے کو تیار ہیں۔"

انہوں نے انتظامیہ کو اطلاع دی۔

"رضیہ جانی میں اپنے، تمہارے اور بچوں کے مستقبل کے لیے کچھ پلاننگ کرنا چاہ رہا ہوں" ایک روز رضیہ کے دور اندیش شوہر نے بیوی کی جاب کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تجویز پیش کی جسے رضیہ نے اپنے شوہر کی عقل مندی سمجھ کر دھیان سے سنا اور پھر جیسی کے آگے دہرا دیا۔

"جیسی ڈیئر میں تو چاہتی ہوں ہر دم تمہارے پاس رہوں مگر میرا ظالم شوہر مجھے روکتا ہے اور تم سے جیلس ہوتا رہتا ہے بتاؤ میں کیا کروں؟" اس نے جیسی سے کہا۔

"یہودی کے پاس پیسہ بہت ہے۔ اس پیسے سے اگر ایک غریب ملک کی مستحق فیملی بھی فیض یاب ہو جائے تو کیا برا ہے!" روزی کے کانوں میں اس کے شوہر کے الفاظ گونجنے لگے۔

"میرا شوہر کہتا ہے اگر میں نے رات تمہارے ہاں گزاری تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا تو پھر میں کہاں جاؤں گی!" "اگر ہم شادی کر لیں تو ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا اور ہم ہر وقت اکٹھے رہ سکیں گے" روزی نے اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے دبا دیا۔

دانتوں سے خالی، پوپلے منہ والے شخص نے سر ابری منہ میں ادھر ادھر گھماتے ہوئے اس پیاری سی عورت کی بات سنی جسے اس کے میاں نے اس کی وجہ سے چھوڑ دینے کی دھمکی دی تھی، جس کے آ جانے سے اس کی زندگی انتہائی منظم، خوشگوار اور پر تحفظ محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر اس بے چاری کے ظالم شوہر نے اسے میرے پاس رہنے نہ دیا تو میری کیئر کون کرے گا۔ ایک سال سے اس نے مجھے ایک چھوٹے سے بچے کی طرح سنبھالا ہوا ہے۔ وہ فکر مند ہو گیا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "مائی ڈیئر، ڈونٹ وری میں تمہارا سہارا بنوں گا، میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

جیسی کے ہاں کہہ دینے کے بعد شیخ صاحب اور رضیہ نے کچھ عرصے بعد باہم رضا مندی سے الگ ہونا منظور کر لیا اور جیسی کے بچے مزید مطمئن ہو گئے کہ اب ان کے ڈیڈ کو ہر وقت کا ساتھ میسر آ گیا ہے اور وہ کبھی بھی تنہا نہ ہوں گے۔ ویسے بھی یہ ان کے ڈیڈ کا ذاتی معاملہ تھا انہیں بھلا دخل دینے کا کیا حق تھا؟

روزی ایک خوبصورت سے اپارٹمنٹ کی مالکہ ہونے پر اب بہت توانا محسوس کرنے لگی تھی۔ برسوں پرانے فرنیچر کو ادھر سے ادھر سیٹ کر کے دیکھتی رہتی تو سوچتی، پچھلی خاتون خانہ اس گھر میں نہ جانے کس طرح رہتی ہوگی کیا کرتی ہوگی؟ کیسے رہتے ہوں گے جیسی اور وہ؟ گھنٹوں دیوار پہ لگی جیسی کے دادا کی رومانیہ سے امریکہ ہجرت کے بعد کی ڈیڑھ سو سال پرانی تصویر دیکھتی تو سوچتی، مسز گولڈ شٹین نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ قدیم ترکی روی طرز کا چوغہ اور ٹوپی پہنے باوقار دکھتے، سنجیدہ سے خوبصورت شخص کو دیکھ کر روزی کو اپنے نانا جی یاد آ جاتے جن کے گھٹنے سے لگ کر اس نے بچپن میں درود شریف اور التحیات یاد کی تھی۔ اس کا جی چاہتا اس تصویر سے سوال کرے۔ "دادا جی آپ ڈیڑھ سو سال پہلے اپنا ملک چھوڑ کر اس ملک کیسے اور کیوں آئے تھے؟ آپ کے ساتھ کیا کیا ہوا تھا؟ کیا آپ نے کبھی سوچا تھا کہ آپ کی یہ تصویر اتنے برسوں بعد برانکس نیویارک کے ایک اپارٹمنٹ میں ٹنگی ہوئی اور ایک دور دراز کے ملک کی اجنبی عورت کی تحویل میں ہوگی۔ کیا آپ جانتے تھے کہ آپ کی تصویر ایک دن اکیلی رہ جائے گی۔"

ایک روز جیسی کو باہمی گفت وشنید کے بعد سمجھا بجھا کر روزی ایمبولینس میں ڈال کر عدالت لے گئی جہاں اسے قانونی طور پر اپنا اپارٹمنٹ اپنی موجودہ بیوی روزی گولڈ شٹین کے نام منتقل کرنا تھا۔ کمرہ عدالت میں وہیل چیئر پہ بیٹھے، اپنی باری کا انتظار کرتے، جیسی بار بار نیند کی آغوش میں چلا جاتا تو روزی اسے ٹھوکا دے کر اٹھاتی۔ جج کو کتنی ہی بار اس سے پوچھنا پڑا آیا وہ یہ کام ہوش و حواس میں کر رہا ہے؟ وہ کسی کے دباؤ میں تو نہیں ہے؟ جیسی نے یس، یس کا مختصر جواب دے کر قانونی تقاضے پورے کر دیئے اور روزی ایک عدد ملین ڈالر مالیت کے اپارٹمنٹ کی مالک بن گئی۔

رضیہ کے بچوں نے ماں کی زندگی میں آنے والی نئی نئی خوشیوں پہ اسے بھرپور مبارکباد اور تحفے دیئے۔ رضیہ نے بھی اپنی پوری فیملی کا عالی شان ڈنر کیا جس میں اس کے دونوں بھائی، بھابیاں اور ان کے بچے شامل ہوئے۔ ایک عرصے بعد فیملی گٹ ٹو گیدر ہوا تو بچوں کو باپ کی یاد آئی مگر پھر یہ سوچ کر کے چپ ہو رہے کہ ڈیڈ نے کبھی ماں کو آسانیاں مہیا نہ کی تھیں، ماں نے ہی ہمیشہ انہیں کما کر کھلایا اور ان کی ضرورتیں پوری کی تھیں۔ رضیہ کے بھائی کچھ چپ سے تھے "ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" روزی نے بھابی سے پوچھا۔

"کہاں ٹھیک ہے، بس یونہی کھوئے کھوئے، بجھے بجھے سے رہتے ہیں!" بھابی نے

پکوڑا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اللہ خیر کرے۔ بھابی، انہیں ڈاکٹرز کو دکھانا تھا" رضیہ نے بھائی کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دکھایا تھا" بھابی نے مختصر جواب دیا۔ اس نے کہا" دل کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کسی بات کا Stress ہے ان پر۔"

"Stress کیوں بھائی جان، خیریت تو ہے کیا کہہ رہی ہیں بھابی؟"

بھائی جان کا تو جیسے کسی نے فلیتہ اڑا کے رکھ دیا، بھیں بھیں کر کے رونے لگے۔ سب پریشان ہو گئے نہ جانے کیا بات تھی کچھ بولتے ہی نہ تھے۔ رضیہ انہیں کھینچ کر بیڈ روم میں لے گئی اور دروازہ بند کر کے پوچھنے لگی۔ "بھائی جان آپ کو اللہ کی قسم، بتائیں کیا بات ہے؟ کیا بھابی سے کوئی اختلاف ہوا ہے؟"

بھائی جان نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر؟"

"رضیہ تو نے ہماری اور ہمارے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے، شیخ طفیل سے طلاق لینا کیا کم برا تھا کہ تو نے دوسری شادی بھی کر لی اور وہ بھی ایک یہودی سے۔"

بھائی جان ہچکیوں کے درمیان دل کی بات کہہ گئے اور ٹشو پیپر سے اپنی بہتی ہوئی ناک پونچھنے لگے۔

"حد ہو گئی بھائی جان۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، میں نے سمجھا پتہ نہیں کون سی قیامت آ گئی ہے آپ کی زندگی میں۔"

"قیامت ہی تو ہے۔ سارے مسجد کے برادرز اور پاکستانی کمیونٹی والے مجھ پر ہنستے ہیں آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے اس شہر میں۔ تجھے تو کسی کا خیال ہی نہیں ہے۔ بس اپنے بارے میں ہی سوچتی رہتی ہے تو۔"

"واہ بھائی جان واہ۔ جب شیخ طفیل جیسے نکھٹو کے ساتھ تنگ دستی کے دن گزار رہی تھی تب تو آپ کو مجھ سے میری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اب جیسے ہی میرے حالات بہتر ہوئے ہیں، جو میں نے خود بہتر کئے ہیں تو آپ لوگ آ گئے ہیں اپنی غیرتیں اور عزتیں لے کر۔ اتنا ہی میرا خیال تھا تو ماہوار خرچ باندھ دیتے۔ میرے بچوں کے مستقبل کے لیے کچھ سوچتے، آپ بھی

لاکھوں ڈالر کماتے ہیں بھائی جان، کیا سوائے نصیحتوں اور تلقین کے، مجھے آپ نے کبھی کچھ دیا؟"

بھائی جان لاجواب ہو کر اٹھے اور بیوی بچوں کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔" ماموں جان نے اچھی خاصی فیملی پارٹی خراب کر کے رکھ دی۔" رضیہ کے بچوں نے ماں کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال کر اس کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

روزی کی انتھک محنت، محبت اور نگہداشت کے باوجود جیسی شادی کے صرف چھ ماہ تک ہی زندہ رہا شاید اس سے کسی کا ساتھ پانے کی، ایک عرصے بعد بھرے بھرے گھر میں رہنے کی خوشی برداشت نہیں ہوئی۔ موت کے آخری لمحوں میں اس کے سرہانے بیٹھی روزی سورۃ یٰسین پڑھ پڑھ کر پھونکتی اور کہتی" جیسی گاڈ کا نام لے، گاڈ کو یاد کر کہ تو نے اس کے ہی پاس جانا ہے" تو جیسی خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔

روزی نے اپنے شوہر کی یاد میں بڑی سی باوقار میموریل سروس کروائی جس میں جیسی کے اہل خانہ کو بطور خاص دعوت دی اور اہم سیٹوں پہ بٹھایا گیا۔ جیسی کے بچے ان کے باپ کے آخری لمحات کو اتنا خوشگوار بنانے اور حاضرین اس کے لیے اتنی میٹھی میٹھی باتیں کرنے پر بار بار روزی کا شکریہ ادا کرتے نظر آ رہے تھے۔ سٹی فلاور بلڈنگ کے دوسرے مکین بوڑھے اور بوڑھیاں جب بھی روزی سے ملتے اس سے اس کے یوں جلدی بیوہ ہو جانے پر اظہار افسوس کرتے اور بہادری سے زندگی گزارنے کا مشورہ دے کر اپنے اپنے اپارٹمنٹوں میں چلے جاتے۔ کبھی کبھار اس کا دروازہ کھٹکتا تو وہ دیکھتی جان کبھی ہاتھ میں کیک تھامے، کبھی رابرٹ پھول لئے تو کبھی مینڈی ہوم میڈ سلاد کا ڈبہ سجائے اس سے کافی پہ گپ شپ کرنے آ رہی ہے۔ ایک روز لفٹ میں سے اترتے ہوئے روزی کی ملاقات بلڈنگ کے نئے رہائشی جارج گرین پیس سے ہوگئی، پچھتر سالہ جارج نیویارک کا پرانا وکیل تھا جو اب ریٹائر ہونے کے بعد بھی کبھی کبھار ایک لاء فرم میں پرائیویٹ پریکٹس کر لیا کرتا تھا۔ لفٹ سے اتر کر سیاہ مہنگی گاڑی لیکسس Lexus میں داخل ہونے تک گورے چٹے ہینڈسم جارج اور روزی نے آپس میں اتنا ہنسی مذاق کر لیا تھا کہ ان کے دلوں میں فوراً ہی ڈنر پہ چلنے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔

بلڈنگ والے خوش تھے کہ لونلی روزی کو جارج کی خوشگوار کمپنی نصیب ہوگئی ہے اور نئے رہائشی جارج کو ایک اچھی دوست مل گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سٹی فلاور کے ماحول، طور طریقوں

اور ساتھی رہائشیوں سے جلد ہی مانوس ہو گیا تھا۔ جارج جیسی کی طرح بستر پر پڑا ہوا بوڑھا بے بس بیہودی نہیں تھا۔ وہ زندہ طبیعت بہتر جسمانی صحت کا مالک شخص تھا۔ شام ڈھلے جب وہ اپنی خوبصورت سی واکنگ سٹک تھامے ہولے ہولے قدم اٹھاتا اپنی شاہانہ گاڑی میں سے اتر کر بلڈنگ میں داخل ہوتا تو کئی بوڑھیاں اس کی باوقار شخصیت کو دیکھ کر اسے تعریفی کلمات سے نوازتیں۔

جارج بھی تنہا تھا۔ اس نے اپنی بستر پہ پڑی بیوی کی خود دس سال تک تیمارداری کی تھی اور بچے پال کر بڑے کر دیے تھے۔ اب وہ فارغ ہو کر ملک سے باہر تعطیلات گزار کر اپنا دل بہلاتا تھا۔ رضیہ نے تو نیویارک سے باہر کبھی قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ پاکستان بھی سالہا سال بعد ہی جانا ہوتا تھا اس لیے اس کا جارج کے بیرون ملک دوروں کو دیکھ کر جی للچانے لگا۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ بہاماز لے جاؤ نا ڈیئر!'' روزی نے جارج کے اگلے تفریحی دورے کے بارے میں سن کر اس سے لاڈ سے فرمائش کر دی۔

''مائی سویٹ روزی ہنی اس سے اچھی کیا بات ہو گی۔ تمہارا خوبصورت ساتھ مل گیا تو میری ویکیشن کا تو لطف ہی دوبالا ہو جائے گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اکیلے ملکوں ملکوں کی سیر کرنے میں وہ مزا نہیں جو کسی ہمدرد پرخلوص دوست کی سنگت میں ہو سکتا ہے۔''

اس کے بعد سے جارج اور روزی نے میکسیکو، ہوائی، کیلیفورنیا، ایریزونا کی بھی سیریں کیں۔ جارج کو خوشی تھی کہ ایک قدرے جوان صحت مند خوش مزاج عورت اس کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ وہ اس کا سامان پیک کرتی، اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے کا خیال رکھتی اور اسے اپنی خوشگوار کمپنی دیتی تھی۔ جارج اس کے ٹکٹ، ہوٹل، خورونوش، شاپنگ کا خرچ اٹھاتا اور یوں ضرورتوں کے تبادلے سے دونوں کی زندگیوں کے چند دن پہلے سے بہتر گزر جاتے۔ روزی بہت خوش تھی۔ جارج بہت سیدھا سادا ایماندار آدمی تھا۔ اسے کبھی کبھار لگتا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ کہاں اس کی اپنے نکھٹو سیالکوٹی، ڈینگیں مارنے والے شوہر کے ساتھ بتائی ہوئی ساکن اور بدبودار پانی جیسی زندگی اور کہاں یہ میلے اور سیر سپاٹے۔

روزی کے بڑے بیٹے کی شادی ہو گئی تو بہو کے آنے سے گھر کچھ تنگ تنگ سا لگنے لگا۔

''کیوں نہ یہ اپارٹمنٹ ان دونوں بچوں کو ہی دے دوں اور خود؟'' وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اب اسے اپنے اور چھوٹے بیٹے کے بارے میں کچھ سوچنا تھا۔ شیخ طفیل روتا پیٹتا پاکستان واپس چلا گیا

تھا اور وہاں جا کر رشتہ داروں کے آگے بیوی کی بے وفائیوں کا رونا رو کر ہمدردیاں سمیٹ رہا تھا مگر رضیہ کو اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کی نظر ایک روشن پر تحفظ، معاشی طور پر مستحکم، مستقبل کی طرف تھی۔ گئے دنوں کی یادوں سے اس نے آسانی سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ بے وجہ کی غیرت اور انا کا اس وقت اس کے لیے کوئی مصرف نہ تھا۔

جارج کے لیے روزی اتنی اہم ہو چکی تھی کہ اب وہ اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ روزی آتی، اس کا گھر صاف کرتی، کھانے پینے کی نگرانی کرتی، وقت پہ دوائیاں دیتی تو جارج خوشی سے نہال ہو جاتا۔ ''کیوں نہ اس پیاری سی پر خلوص عورت کو مستقلاً اپنے ساتھ رکھ لوں، اسے شریک حیات بنا کر باقی ماندہ زندگی کے لمحات آرام سے گزار دوں؟'' اس نے ایک روز سوچ کر روزی سے بات کی اور گھٹنوں پہ بیٹھ کر اس سے اس کا ہاتھ مانگنے لگا۔ روزی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے جارج کو اپنی حقیقی محبت کا یقین دلا کر اس کی شریک حیات بننے کی حامی بھر لی۔

روزی کے بچوں نے ماں کو ایک بار پھر وائٹ ڈریس میں پھولوں کا گلدستہ پکڑے دیکھا تو خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ ''مام نے ساری عمر محنت کی اور ہمارے لیے قربانیاں دی ہیں انہیں خوش ہونے کا پورا پورا حق ہے۔'' بچوں نے ماں کو نیک خواہشات اور تمناؤں سے نواز کر اس کا جی بڑا کر دیا۔

جارج کے اپارٹمنٹ میں گو کہ کافی اچھی اچھی چیزیں فرنیچر، ڈیکوریشن پیس تھے مگر اب کی بار روزی کا جی تھا کہ وہ اس گھر کو اپنے ہی انداز سے ترتیب دے اور سجائے بنائے۔ خدا نے اسے اتنا پیارا گھر دے دیا تھا جو اس کی پرانی ڈیسنٹ اپارٹمنٹ کے سامنے کسی محل سے کم نہ تھا۔ ایک روز اس کی پرانی کولیگ جمیلا سے ملنے آئی تو رضیہ نے اس کے سامنے اپنے شوہر سے اٹھلا کر فرمائش کی۔

''جارج ہنی، تمہاری نئی بیوی پرانے کچن میں خوش نہیں ہے مجھے سارا کچن نئے سرے سے ری ماڈل کروا کے دو۔''

''کیوں ہنی، اس کچن میں کیا خرابی ہے؟'' جارج نے بھولپن سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس مجھے نئے انداز کے کوکنگ رینج، مائیکرو اوون، ڈش واشر اور گاربج ڈسپوزل چاہئے۔'' روزی نے پیار سے جارج کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اوکے جیسی تمہاری خوشی سویٹ ہارٹ'' جارج نے اپنی سنک سے سہارا لے

کر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ رضیہ لپک کر آگے بڑھی اور اسے سہارا دیتے ہوئے مصنوعی غصے سے بڑبڑائی۔

"ابھی خود کیوں اٹھنے کی کوشش کرتے ہو؟ مجھے کہہ دیتے آخر میں کس لیے ہوں؟"

جارج کی آنکھوں میں تشکر اور پیار سے آنسو آ گئے۔

کتنا پیار کرتی تھی روزی اس سے۔ "سنو جیمی" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا، کیا تمہارے ملک کی سبھی لڑکیاں اتنی اچھی ہوتی ہیں؟ نہیں نہیں، میرا خیال ہے بہترین لڑکی میرے ہی حصے میں آ گئی ہے، ہے نا۔" جارج قہقہہ مار کر ہنسا۔

"شیور شیور جارج، روزی جیسی لڑکی تو واقعی پورے پاکستان میں نہیں ہے۔"

جمیلہ نے دانت پیستے ہوئے مسکرا کر جواب دیا، "حرامزادی" اس کے دل سے ایک آواز نکلی جسے اس نے بڑی مشکل سے دبا کر خاموش کیا۔

"دیکھو اب یہ کچن پہ پیسہ لگانا چاہتی ہے لیکن ٹھیک ہے یہ میری سویٹ ہارٹ ہے میں کماؤں اور یہ خرچے، یہی میری خوشی ہے۔" جارج ہنسنے لگا۔

"چلو جارج، گاڈ کو یاد کرنے کا ٹائم ہو گیا" روزی نے جارج کو کرسی پہ بٹھا دیا اور اسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور کلمہ شریف سکھانے لگی۔

جمیلہ حیرت زدہ ہو کر بوڑھے یہودی کو خوشی خوشی کلمے پڑھتے دیکھنے لگی اور پھر تھوڑی دیر میں اجازت لے کر رخصت ہو گئی کہ اسے جا کر اپارٹمنٹ نمبر 9 کی گریس کو نہلانا اور واک پہ لے جانا تھا۔ راستے بھر وہ سوچتی رہی، دس سال سے میں بھی اس بوڑھوں کی بستی میں کام کر رہی ہوں، مجھے تو کبھی اتنی عقل نہ آئی۔ میں بھی اپنا مستقبل بہتر بنا سکتی تھی۔ ویسے میں اتنی بڑی بڑی چھلانگیں لگا بھی کیسے سکتی ہوں۔ ایک شریف سا میاں اور پانچ بچے میرے قدموں کی زنجیر جو ہیں، روزی کی عقل مندی کی وہ پورے دل سے قائل ہو چکی تھی۔

جارج سے شادی کے بعد سے اقبال بھائی کا نہ تو کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی خیر خبر ملی تھی۔ ایک روز رضیہ جارج کو کھلا، پلا سلا کر چند گھنٹوں کے لیے بھائی اور ان کی فیملی سے ملنے کوئنز چلی گئی، پیلی پھولدار سکرٹ اور میچنگ میرون ٹائٹ پہنے جب رضیہ بھائی جان کے گھر پہنچی تو وہ اور اہل خانہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ بھائی کا اکلوتا بیٹا فیاض

مین ہٹن میں اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا اس لیے گھر پہ صرف بھائی بھابی اور ان کی دونوں بیٹیاں موجود تھیں۔ "آج کیسے ہماری یاد آ گئی؟" بھابی نے چائے کی پیالی پیش کرتے ہوئے رضیہ سے گلہ کیا۔

"اچھا؟" "آپ لوگوں نے کون سی کبھی میری خبر لی ہے کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی۔"

"Congrats on your wedding" پھوپھو" بھتیجیوں نے اسے گلے لگا کر مبارک باد دی اور پھر اوپر اپنے کمروں کی طرف چلی گئیں۔

"رضیہ تم نے پھر ہماری ناک کٹوا دی....." منہ پھلاتے ہوئے بھائی جان پھٹ پڑے۔ پھر سارے برانکس کی پاکستانی کمیونٹی باتیں بنا رہی ہے۔ اگر تمہیں شادی ہی کرنا تھی تو کسی اہل ایمان مسلمان سے کرلیتیں اسلام میں نکاح کو پسند کیا جاتا ہے ہم جانتے ہیں یہ حلال کام ہے.....ہم سمجھتے ہیں، مگر....."

"بھائی جان آپ جانتے تو ہیں شیخ صاحب نے مجھے کبھی ایک دھیلہ بھی کما کر نہیں دیا تھا، کتنے سالوں سے میں بوڑھوں کی ٹیک کیئر کر کے فیملی کو پال رہی ہوں تو کیا اب مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اپنے لیے کوئی آسانی تلاش کروں....." روزی پھر بولنے لگی۔

"لیکن جیسی سے شادی بھی تو تم نے اسی مقصد کے لیے کی تھی" بھائی جان گرجے.....

"تو بھائی جان ایک اپارٹمنٹ ہی تو ملا تھا وہ میں نے بڑے بیٹے اور اس کی بیوی کو دے دیا ہے.....آپ کو تو پتہ ہے.....اب کیا چھوٹے سہیل کے لیے کچھ نہ کروں آخر کو میں اس کی بھی ماں ہوں.....ابھی سہیل کے کالج کے لیے جارج نے ایک لاکھ ڈالر فیس جمع کروائی ہے.....پھر یہ والا گھر بھی تو سہیل کے لیے ہی ہوگا اور لیکن رضیہ تم جانتی ہو یہودی ہمارے دشمن ہیں کچھ بھی ہو....." "ہمیں بھولنا نہیں چاہیے۔" بھابی نے لقمہ دیا۔

"آخر فرق کیا ہے یہودیوں اور مسلمانوں میں؟ دونوں اہل کتاب ہیں، خدا کو مانتے ہیں اور جارج اتنا اچھا اتنا ایماندار مخلص آدمی ہے پاکستانیوں کی طرح بے ایمان اور جھوٹا نہیں۔ مجھے ایک اچھا آدمی مل گیا ہے کیا آپ لوگوں کو اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہے؟"

"ہاں مگر یہودی" اب کے بھائی جان کے آنسو نکل پڑے.....

"بھائی جان کبھی سینا گاگ جا کر یہودیوں کے Rabbi کا خطبہ سنیں، میں گئی تھی

جارج کے ساتھ، ایک روز۔ وہ کہہ رہا تھا، ہیرو کون ہوتا ہے، ہیرو وہ ہوتا ہے جو دشمن کو اپنا دوست بنا لے..... ان کی تعلیمات اسلام سے قطعاً مختلف نہیں ہیں بھائی جان۔'' رضیہ اپنی بات پہ ڈٹی رہی
''آپ تالمود پڑھ کر تو دیکھیں، ویسے بھی جارج کو تو میں نے مسلمان کرلیا ہے۔''

''ہائے اللہ یہ تو یہودن ہوگئی ہے'' بھابی نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

''وہ یہودی ہے یاد رکھو اپنا فائدہ ہی سوچا ہوگا اس نے۔''

بھائی جان بحث کرنے لگے۔

''تو اگر کسی کا بڑھاپا سنور جائے اور میری آئندہ زندگی کے لیے میرے پاس پیسہ آ جائے تو سودا برا کیسے ہوا؟ اس دنیا میں سودے بازی تو چلتی ہی ہے بھائی جان'' رضیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ آپ اتنے ڈالر کماتے ہیں بھائی جان کبھی آپ نے میرے اس تنگ و تاریک گھر کے بارے میں سوچا تھا جہاں میں ایک نکمے شوہر کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔'' رضیہ نے وہی پرانی بات دہرائی۔

''جھلئے میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ جارج کے بعد شیخ صاحب کہیں واپس تیرے پاس نہ آ جائیں اور آ کر تیری جائیداد پہ قبضہ نہ کرلیں۔''

بھائی نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''شیخ طفیل؟ توبہ کریں بھائی جان..... وہ میرے پیسے پہ ہرگز کوئی حق نہیں رکھتا..... آپ میری فکر نہ کریں، جارج کے جانے کے بعد میں یہ والا اپارٹمنٹ سیل بیٹے کو دے دوں گی''

''اور خود کیا کرو گی؟'' بھابی نے سوال کیا۔

''میری فکر نہ کریں، بلڈنگ مالدار بوڑھوں سے بھری ہوئی ہے اور آپ کو پتہ ہی ہے میرے اخلاق کے تو سب دیوانے ہیں۔ آپ کو میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' روزی ہنسنے لگی۔

''اچھا میں چلوں، جارج کا ڈنر ٹائم ہو رہا ہے'' روزی نے مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور اپنی خوبصورت پیلی سکرٹ کی کریزیں درست کرتی ہوئی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اندھیر

ملک صاحب کی اکڑی ہوئی کلف لگی سفید پگ کھل کر نیچے زمین پہ آ گری تھی۔
آنسوؤں سے تر بتر کرتا بھیگ کر سینے سے چپک رہا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ افسردگی کے عالم
میں سوچ رہے تھے۔ بے چارے ملک صاحب ملکانی زبیدہ کے بعد کیسے جئیں گے، کیا کریں گے؟
اب ان کی زندگی کے باقی ماندہ دن کیسے پورے ہوں گے؟

ملک صاحب اور ملکانی کی محبت مثالی تھی۔ سارے گاؤں اور رشتہ داروں کو پتہ تھا کہ
میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ ملک صاحب ملکانی زبیدہ کے بغیر نہ روٹی کھاتے
اور نہ بستر میں جاتے تھے۔ ملکانی بھی ہر بات میں ان کی رائے پوچھتیں اور ہر طرح سے ان کا خیال
رکھتی تھیں۔ کبھی کبھار ان کے بچے جس میں دو بیٹے، بہوئیں، ایک بیٹی، داماد اور کئی نواسے، پوتے،
پوتیاں تھیں انہیں لیلیٰ مجنوں کی جوڑی کہہ کر چھیڑتے تو دونوں شرما جاتے اور میٹھی میٹھی نظروں سے
ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگتے تھے۔

ملکانی کو کینسر جیسی موذی بیماری ایسی چمٹی کہ اس نے جان لے کر ہی انہیں چھوڑا۔ اب
ملک صاحب ڈانواں ڈول پھرتے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے کہ ان کا کسی بات میں جی نہیں
لگتا تھا۔ بچے چند ہی ہفتوں بعد اپنے اپنے کام دھندوں اور بکھیڑوں میں جٹ گئے اور ملک
صاحب ایک خاموش بت بنے دیواروں کو گھورتے رہ گئے۔ بچے باپ کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتے
اور انہیں تسلیاں دیتے مگر سب بے سود تھا۔ چند مہینے گزر جانے کے بعد ایک روز دونوں بیٹوں نے

انہیں پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ابا جی اب آپ دوبارہ نارمل ہونے کی کوشش کریں۔ اپنے پوتوں، نواسوں میں دل لگائیں، زمینوں کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ امی جی کی وفات اللہ کی رضا سے ہوئی تھی۔ ہم اس کی مرضی کے آگے آخر کیا کر سکتے ہیں؟''

''ہاں بیٹا کہتے تو تم ٹھیک ہو مگر اکیلا رہنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ کیا کروں میں؟ میری تنہائی کا تو بس ایک ہی علاج ہے۔'' ابا جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ابا جی آپ حج پر ہو آئیں'' چھوٹے بیٹے نے تجویز پیش کی۔

''دل خوش نہ ہو تو عبادت میں کہاں دل لگتا ہے۔'' ابا جی نے آئیڈیا مسترد کر دیا۔

''میرا خیال ہے مجھے شادی کر لینی چاہیے'' ابا جی نے بم پھاڑ دیا۔

''ہیں؟'' ایک پل کو تو دونوں بیٹوں کو لگا ان کے کانوں نے شاید کچھ غلط سنا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟

''شادی ابا جی؟ آپ اور اس عمر میں؟'' بڑا تقریباً چیخا۔

''او بھلیا اس عمر میں تو ساتھ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔'' ابا جی بولے۔

''مگر شادی..... کس سے؟ آپ کی عمر کی کوئی عورت..... کافی ڈھونڈنا پڑے گا۔'' چھوٹے نے تشویش بھری آواز میں کہا۔

''عمر شمر کیا ہوتی ہے۔ عورت تو بس عورت ہوتی ہے۔ ساتھی، غمگسار، شریک حیات۔ جیسے تمہاری ماں تھی۔'' ابا جی بولتے چلے گئے۔

''اچھا۔ دیکھنا پڑے گا.....'' بڑا بیٹا بولا۔

''تم لوگوں کو ڈھونڈنے کا کوئی تردد نہیں کرنا پڑے گا بھئی، لڑکی گھر میں ہے۔'' ابا جی نے انکشاف کیا۔

''لڑکی گھر میں؟ کون ابا جی'' چھوٹے نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''زلیخاں بھئی۔ اپنی زلیخاں۔ تمہاری ماں کی خدمت گار، اس کی عاشق، دیوانی، میں نے بڑا سوچا اور میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ کوئی ایسی ہونی چاہیے جس کا اور میرا دکھ سانجھا ہو۔ جتنا تمہاری ماں کو وہ چاہتی تھی اتنا تو کوئی سگی بیٹی بھی نہیں چاہ سکتی۔

''زلیخاں۔'' دونوں بھائی زیر لب بڑبڑائے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ زلیخاں نے ان کی ماں کو پوری طرح سنبھالا اور ہر طریقے سے ان کا خیال رکھا تھا۔ انہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی تھی مگر..... تھی تو وہ کمیوں کی اولاد۔ آخر کو ایک ملازمہ ہی تو تھی اور پھر جوان جہان اور اس کا یہ قصور تو کسی طور بھی قابل معافی سمجھا نہ جا سکتا تھا۔ انہیں یاد آنے لگا، امی جی کی وفات والے دن زلیخاں نے کیسے کیسے بین ڈالے تھے۔ سر میں راکھ ڈال کر کیسے کیسے سینہ کوٹا تھا، ہر دیکھنے والے کی آنکھ اشکبار اور دل غم سے لبریز ہو گیا تھا۔ ''کیا تم لوگ اس لیے چپ ہو کہ وہ کمی کمین ہے، غریب ہے؟ اوئے پترو ہمارے مذہب میں تو انسانوں سے مساوات کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔ میں تو ایک غریب لڑکی سے شادی کر کے ایک نیکی کمانا چاہتا ہوں۔'' ابا جی سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''بات غریبی کی نہیں ابا جی۔ کل کلاں کو اس کے ہاں اولاد بھی ہو سکتی ہے اور یہ بات تو ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جائیداد اور زمینوں میں سے ہم کسی کمی کمین کی اولاد کو بھی حصہ دیتے پھریں۔'' بڑے نے صاف صاف لفظوں میں دل میں چھپا خوف ظاہر کر دیا۔

ملک صاحب پل بھر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جوان بیٹے نے کافی وزنی دلیل پیش کی تھی۔ اس وقت ان کے بچے ان کے بڑے بڑے بن کر انہیں چھوٹوں جیسا محسوس کروا رہے تھے۔ ماحول یکدم منجمد سا ہو گیا تو ملک صاحب خاموشی سے اٹھ کر باہر چلے گئے اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

ملک صاحب مزید اداس اور کھوئے کھوئے نظر آنے لگے تو ایک روز سب بچوں نے ان سے فیصلہ کن میٹنگ کرنے کی ٹھانی۔ آخر وہ خالی خولی عام سے بوڑھے باپ نہیں تھے۔ کئی زرعی زمینوں، مربعوں، باغات اور گاؤں میں بکھری ہوئی جائیدادوں کے مالک ایک ملک تھے۔ ان کی خواہش اور خوشی کو مکمل طور پہ اور اتنی آسانی سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''ابا جی۔ ہم آپ سے سنجیدگی سے ایک بات کرنے آئے ہیں۔'' بڑے بیٹے نے پیار سے باپ کا شانہ تھپتھپایا۔

''ابا جی ہم آپ کے بچے ہیں۔ آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں، آپ کی اداسی پہ دل جلتا

ہے ہمارا۔" بڑی بہو نے آنکھوں سے جھوٹ موٹ کے آنسو پونچھنے کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کی شادی زلیخاں سے کرنے کو تیار ہیں مگر اس کے لیے آپ کو ہماری بھی ایک چھوٹی سی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔" چھوٹا بیٹا بھی بول پڑا۔

"وہ کیا؟" اباجی کو کچھ سمجھ میں نہ آئی۔

"شادی سے پہلے آپ کو اپنا آپریشن کروانا ہوگا اباجی۔" بڑے نے نظریں جھکا کر دھیمے مگر مضبوط لہجے میں حکم سنا دیا۔

اباجی خاموش ہو گئے اور دل میں سوچا۔ ویسے اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں نے اب کون سی اولادیں پیدا کرنا ہیں۔ ایک ساتھی ہی تو چاہیے زلیخاں کا..... بس کافی ہے میرے لئے۔ بچوں کے جذبات کا بھی تو آخر خیال رکھنا پڑے گا، کہیں ان کی حق تلفی ہی نہ ہو جائے۔

"مجھے منظور ہے" اباجی نے سر جھکا کر کہا۔

زلیخاں کے گھر جب نائن ملک صاحب کا رشتہ لے کر گئی تو پہلے پہل تو زلیخاں کے ماں باپ کو یقین ہی نہ آیا، وہ سمجھے ملک صاحب زلیخاں کو اپنی خدمتگاری کے لیے حویلی میں رکھنا چاہتے ہیں جس پر ظاہر ہے انہیں کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا تھا مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔

ملکانی زبیدہ کی زندگی میں بھی زلیخاں ہی ملک صاحب کے کپڑے لتے، کھانے پینے کا خیال رکھتی تھی تو اب اگر وہ اسے پھر سے بلوا لیتے تو اس میں ایسی کون سی عجیب بات ہو جاتی مگر یہ نئی بات سن کر تو حیرت اور خوشی سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور منہ سے چند لمحوں کے لیے کوئی بات ہی نہ نکل سکی۔

نائن نے ان کی پریشانی بھانپ لی۔" ملک صاحب نے کہا ہے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی ہے، بلکہ کہا ہے اس سے بھی پوچھ لیں۔" شگن کے پانچ کلو بوندی کے خستہ مزے دار، خوشبودار لڈو چھوڑ کر نائن تو چلی گئی مگر زلیخاں کے ماں باپ، بہن بھائی کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا ملک صاحب نے انہیں۔

"مگر اماں میں نے تو انہیں ہمیشہ باپو کی طرح سمجھا تھا۔"

زلیخاں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا وہ کوئی تیرا سگا باپ تھوڑا ہی تھا۔ نامحرم تھا اور اب تیرا محرم ہونا چاہتا ہے۔"

باپو نے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ویسے زلیخاں، ملک صاحب اتنے بڈھے لگتے بھی نہیں، ابھی تک کاٹھی مضبوط ہے اور سیدھا تک چلتے ہیں۔'' چھوٹی بہن نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور شرارت سے آنکھیں مٹکانے لگی۔

''تیرے ابے سے تو چھوٹے ہی ہوں گے، دو چار سال۔ تو یہ دیکھ لے دھیئے کہ تو ملکہ رانی بن جائے گی۔ حویلی کی مالکن ہوگی۔ راج کرے گی راج۔ تیرے سارے ٹبر کا مستقبل سنور جائے گا، ہمارے تو سمجھ کہ بھاگ ہی کھل جائیں گے۔''

اماں نے سمجھایا تو زلیخاں سوچ میں پڑ گئی۔ ملک صاحب ویسے اتنے برے تو نہیں تھے۔ ملکانی کی زندگی میں بھی اس سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ شکل صورت بھی اچھی تھی اور پھر حویلی کتنی اچھی جگہ تھی رہنے کے لیے۔ کہاں یہ چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا گھر اور کہاں وہ بڑے بڑے دالان، برآمدے اور راہداریاں۔ اونچی اونچی چھتوں والے کمرے جہاں ایئر کنڈیشنر لگاؤ تو کپکپی چھوٹ جاتی تھی۔ کئی بار تو ملکانی جی اس سے کمبل منگوا کر اپنے اوپر ڈلوایا کرتی تھیں۔

زلیخاں کے گھر والوں کے پاس ہاں نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ تو تھی نہیں اس لیے انہوں نے ایک دو دن میں ہی نیوتا بھجوا دیا کہ ملک صاحب کی خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔

نکاح ملک صاحب نے اپنی حویلی میں کروانا مناسب سمجھا۔ آخر کو تو اب زلیخاں کا نیا گھر وہی تھا، اس غریبی کی یادگار جھونپڑی میں جانے کی کیا ضرورت تھی جہاں گدڑی میں چھپا ایک انمول لعل کسی قدر شناس جوہری کے انتظار میں پڑا پڑا شاید ٹھیکری بن جاتا، ضائع ہو جاتا مگر ایسا ہوا نہیں۔ ملک صاحب اس کی قدر جان گئے تھے اور اب اسے اپنی زندگی کی زینت بنانا چاہتے تھے۔

پروگرام یہ بنا کہ ملک صاحب ہسپتال سے فارغ ہونے کے دو ہفتے بعد آنے والے مبارک جمعے کو اپنے بیٹوں اور چند معززین گاؤں کی موجودگی میں یہ نیک کام سرانجام دیں گے اور پھر گاؤں والوں کی دعوت کی سعادت حاصل کریں گے۔

زلیخاں بنت محمد بوٹا کمی، نئی اور چھوٹی ملکانی بن کر حویلی میں دلہن بن کر داخل ہو گئی اور گاؤں والوں کے دل پلاؤ زردے اور قورمے کی لذتوں کی خوشیوں سے ناچ اٹھے۔ زلیخاں کے آنے سے گھر میں تو رونق ہو ہی گئی تھی ملک صاحب کی زندگی میں بھی بہار آ گئی۔ وہ جب انہیں

محبت سے کھلاتی، پلاتی اور وہ اس سے عشق معشوقیاں کرتے تو ان کے پرانے ٹھنڈے خون میں جوشیلے ابال سے آنے لگ جاتے اور وہ خود کو پچیس تیس سال کا، اپنی بیوی کا ہم عمر نوجوان سمجھنے لگ جاتے۔

''مگر یہ تو بتائیں ملک صاحب، آپ کے دل میں میرے لیے، میرا مطلب ہے آخر آپ کو میرا خیال کیسے آ گیا؟ میں تو ملکانی صاحب کی نوکر تھی، ان کی جوتیوں کی خاک، کہاں آپ کہاں میں؟'' ایک دن ملک صاحب کو گود میں لٹا کر انگور کھلاتے ہوئے زلیخاں نے مدھ بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''دیکھ زلیخاں، میں نے تجھے کتنی بار کہا ہے، مجھے ملک صاحب نہیں بلکہ ریاض کہہ کر بلایا کر..... اب نہ کہا تو میں ناراض ہو جاؤں گا.....'' ریاض نے لاڈ سے منہ بسورا کر کروٹ لے کر ناراض ہونے کی اداکاری کی۔

''اچھا میرے سوہنے، میرے ریاض، کوشش کروں گی..... دراصل بچپن سے عادت پڑی ہوئی ہے نا آپ کو ملک صاحب کہنے کی تو..... بس جھجک جاتی ہوں۔ آہستہ آہستہ عادت چھوٹ جائے گی جی۔'' زلیخاں کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''ہاں تو میری بات کا جواب تو دیں نا.....''

زلیخاں نے ایک نیا انگور کا دانہ ان کے منہ میں ڈالنے کے لیے ان کے منہ کے پاس گچھا لہرایا.....

''سچی بتاؤں زلیخاں..... میرا ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ تجھے تو پتہ ہے زبیدہ اور میرا کتنا پیار تھا آپس میں، مگر جب تجھے زبیدہ کے جنازے پر دیکھا نا..... تو بس۔ کیسے بار بار میت پہ گر رہی تھی تو..... تجھے تو ہوش نہیں تھا مگر تیرا دوپٹہ بار بار سینے سے ڈھلک جاتا تھا، سیاہ بال کھل کر تیرا چہرہ چھپا لیتے تھے، گیلی آنکھوں میں اداسی کی پرچھائیاں لہراتی نظر آ رہی تھیں تو بس..... تجھے تو کچھ ہوش نہیں تھا مگر میں نے اسی لمحے تجھے دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ تجھے اپنا بنا لوں گا، تیرے زخمی دل پہ پھاہا رکھوں گا۔''

''وہ کیوں جی؟'' زلیخاں اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''اس لیے کہ تو اور میں ہمارا دونوں کا دکھ سانجھا تھا۔ ہم دونوں ہی تیری ملکانی سے اتنا پیار کرتے تھے تو میں نے سوچا کیوں نہ ہم دونوں ایک ہو جائیں ہمیشہ کے لیے۔ جب تو بلک بلک

کر رو رہی تھی تو اتنی پیاری لگ رہی تھی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ بس..... یوں جیسے کوئی کونج ڈار سے بچھڑ گئی ہو اور اپنوں کی یاد نے اسے بے حال کر دیا ہو۔"

"سچ ملک..... میرا مطلب ہے ریاض جی.....؟" زلیخاں اقرار محبت سن کر خوشی سے گلابی ہوگئی اور سوسو بل کھانے لگی۔

"سچ کہتا ہوں میری جندڑی، تیری ملکانی کی قسم اگر جھوٹ بولوں۔" ملک صاحب نے اسے اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور طمانیت سے لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

ملک صاحب کے بیٹے، بہوؤں اور بیٹی، داماد کا خیال تھا، جوان بیوی ملک صاحب سے کہاں سنبھالی جائے گی۔ سال، چھ ماہ میں ہی اباجی کا شوق پورا ہو جائے گا، کوئی اٹ کھڑکا ہوگا اور ملک صاحب اسے چلتا کر دیں گے مگر یہاں تو زلیخاں کے قدم مضبوط سے مضبوط تر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

وہ خوش مزاج تھی، ہر ایک کا خیال رکھتی تھی، ملک صاحب کی جی جان سے خدمت کرتی تھی تو کسی کو اس سے کیا شکایت ہو سکتی تھی؟ بچوں کو زلیخاں تو نہیں مگر اس کی جوانی بہت کھٹکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جوان جہان، خوبصورت سوتیلی ماں پر نظر رکھنا ان کی مجبوری بن چکا تھا۔

ملک صاحب بھی اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتے۔ ارد گرد یوں منڈلاتے رہتے جیسے شمع کے گرد پروانہ ہو۔ کام کے سلسلے میں دوسرے گاؤں جاتے تو اپنی بیوہ بہن سرداراں کو حویلی چھوڑ جاتے اور نوکروں، خادماؤں کو بھی ہدایت کر جاتے کہ چھوٹی ملکانی کا ہر طرح خیال رکھیں اور اسے کسی قسم کی شکایت نہ ہونے دیں۔

زلیخاں ملک صاحب کے ساتھ بہت خوش تھی۔ ہر طرح کا سکھ آرام اسے حاصل تھا مگر ایک حیرت اور حسرت تھی جس نے اب اس کے دل میں پنپنا اور طاقت پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب تک ماں کیوں نہیں بنی تھی؟ یہ سوال اسے اکثر پریشان کرنے لگا تھا۔ شادی کو دوسرا سال ہونے کو آیا تھا اور زلیخاں کے والدین کو بھی فکر ہونا شروع ہوگئی تھی کہ ان کی بیٹی کی گود ابھی تک خالی تھی۔ ان کا تو خیال تھا ننھا سا ملک یا ملکانی جھٹ سے آ جائے گی اور اپنے نانا، نانی کا حویلی میں رتبہ اور عزت بڑھ جائے گی۔ گاؤں میں لوگ ان کو سلام، دعا پیش کریں گے، ان کے حویلی میں جانے کے بہانے اور مواقع میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا مگر یہاں تو ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

ملک صاحب کے نواسے، نواسیاں، پوتے پوتیاں دیکھ کر زلیخاں کے دل میں بھی ماں بن کر کسی پھول کی پرورش کرنے کی خواہش زور پکڑنے لگی تھی۔ ایک دن اس کی ماں اسے کسی پیر سے دم کروانے کے لیے لینے آ گئی تو زلیخاں ہنسی خوشی اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔

ملک صاحب اتفاقاً گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے مگر زلیخاں نے ان سے پھر بھی موبائل فون پہ اجازت طلب کر لی اور اجازت ملنے پر خود ماں کے ساتھ پیر صاحب کے آستانے کو چل دی۔ پیر صاحب نے غور سے زلیخاں کی بات سنی اور آنکھیں بند کر کے کتنی ہی دیر کچھ بڑبڑاتے رہے۔

''اس کو بہت زیادہ خواہش ہے بابا۔ بس کچھ کرم کر دیں۔'' ماں نے التجا کی۔ ''ایک بچہ ہو جائے تو اس کا گھر مکمل ہو جائے گا پیر صاحب۔''

پیر صاحب نے دم کی ہوئی چینی کے ساتھ ساتھ زلیخاں کو ایک تعویز بھی دیا جو اسے ہر وقت گلے میں باندھے رکھنا تھا۔ زلیخاں کی ماں بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور رخصت کی اجازت چاہی۔ نذرانے کے ڈبے میں سو روپے کا لال نوٹ ڈالتے ہوئے زلیخاں کو لگا جیسے اس نے گیلی زمین میں کسی خوبصورت پھول کا بیج ڈال دیا ہو اور اب وہ بیج پھوٹ کر اس کی زندگی مہکانے کو بس آتا ہی ہوگا۔

دو ماہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ زلیخا کو لگا اللہ نے اس کی دل کی مراد سن لی ہے، دعائیں قبول ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے ماں کو بتایا کہ اس کے حساب سے کچھ دن اوپر ہو گئے ہیں۔ ماں نے باپ کو خوش خبری دی اور دونوں مصلے پر گر گئے۔ خدا ان کی بیٹی کی قسمت اپنے ہاتھ سے لکھے چلا جا رہا تھا۔ جب ماں نے ہر طرح سے زلیخاں سے باتیں پوچھ کر تسلی کر لی تو اس نے زلیخاں سے کہا کہ اب وہ ملک صاحب کو بھی یہ خوش خبری سنا ہی دے۔

جس وقت زلیخاں نے ملک صاحب کو یہ خبر سنائی وہ ٹی وی پہ سٹیج رقاصاؤں کی اشتہا انگیز رقص سی ڈی دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ لطف و انبساط کے رنگ ان کے چہرے پر پچکاریاں چھوڑ رہے تھے اور بدن تال کے ساتھ ہولے ہولے متحرک رہا تھا۔

''کیا، کیا کہہ رہی ہے تو زلیخاں؟ تو ہوش میں تو ہے؟''

ملک صاحب چنگھاڑے ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو کیوں نہیں سکتا جی؟'' زلیخاں نے سہم کر جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے جن دنوں کا تو یہ حساب بتا رہی ہے۔ اس حساب سے جو نیم بنتا ہے، اس وقت تو میں یہاں تھا ہی نہیں۔ پنڈ دادن خان گیا ہوا تھا میں۔'' وہ سٹپٹا کر بولے۔

''ہائے جی ریاض، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ توبہ توبہ....'' بات کی نزاکت سمجھ کر زلیخاں رونے لگی۔

خلاف توقع ملک صاحب نے اسے چپ بھی نہ کروایا بلکہ عجیب عجیب نظروں سے اس کا سرتا پا جائزہ لے کر پیر پٹختے کمرے سے باہر چلے گئے۔ زلیخاں نے دیوار پہ لگی اپنی اور ریاض کی فریم شدہ شادی کی تصویر دیکھی تو اس کی آنکھیں مزید ابلنے لگیں۔ اس کا تو خیال تھا ریاض جی، یہ خبر سن کر ناچ اٹھیں گے، اسے گود میں اٹھا کر آرام سے بستر پہ لٹا کر لاڈ کریں گے، ساری حویلی اور گاؤں میں لڈو بنوائیں گے مگر ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس میں ایسی کون سی بری بات تھی! اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''شاید ملک صاحب اپنی عمر کے خیال سے کچھ گھبرا گئے ہوں۔'' زلیخاں کی ماں نے صورتحال کے بارے میں سن کر اپنا تبصرہ کیا۔

''لیکن اتنی عمر بھی ابھی کہاں ہے۔ اور مرد بھی کبھی بوڑھا ہوا ہے؟'' باپو نے حقے کی نے منہ میں ڈال زور زور سے پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔ یہ ساری بات سن کر وہ بھی کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

زلیخاں گھر تو لوٹ آئی مگر ملک صاحب اس روز کے بعد گم صم سے ہو کر رہ گئے۔ عجیب عجیب نظروں سے خلاؤں، میں گھورتے رہتے۔ زلیخاں سے بات بھی نہ کرتے، ایک روز انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اپنی پریشانی سے آگاہ کر ہی دیا۔

''آپ خود سمجھدار ہیں ابا جی۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کا تو آپریشن ہو چکا ہے۔'' بڑے نے ٹھنڈے مگر طنزیہ لہجے میں ہمدردی جتائی۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا، ذات کی کمی اور پھر عمر کی چھوٹی، اوپر سے ہنس مکھ، شوخ اور طرار.....اس نے کوئی نہ کوئی چن تو چڑھانا ہی تھا ابا جی۔'' چھوٹے نے بھی موقع ملتے ہی اپنے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کر دی۔

''بڑے معصوم ہیں آپ ابا جی جوان بیوی، بیٹی کی طرح ہوتی ہے اس پر نظر تو رکھنی چاہیے تھی نا.....'' بڑی بہو بلقیس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ابا جی بھیگے بلے بنے، نظریں جھکائے، سب کے کوسنے سنتے رہے۔

گھر کی پنچایت نے جو فیصلہ دیا وہ زلیخاں، اس کے ماں باپ، بہن بھائی کے لیے کسی زلزلے سے کم نہ تھا۔ ملک صاحب نے کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ وہ ان دنوں گاؤں سے باہر تھے تو یہ کیسے ہو گیا؟ روتی پیٹتی، اپنی وفاؤں کی قسمیں کھاتی، ان کی محبت میں تڑپتی زلیخاں کو دیکھ کر کئی بار ان کا دل پسیجا اور قدم ڈگمگائے مگر اپنی اولاد کی وجہ سے وہ ثابت قدم رہے اور زلیخاں واپس ماں باپ کے گھر روانہ کر دی گئی۔

زلیخاں کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ کہاں وہ دن کہ وہ حویلی کی چھوٹی ملکانی بنی، اتراتی پھرتی تھی اور کہاں اب یہ شب و روز جب اس کو سب گاؤں والے بدکردار، چھوڑی ہوئی، ملعون عورت سمجھ کر رسوا کرتے رہتے تھے۔

اسے رہ رہ کر ریاض یاد آتے۔ وہ واقعی محبت کرنے والے اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ وہ اتنے فیاض، غریب پرور اور دریادل تھے.....وہ سوچتی مگر انہوں نے اسے بار آور ہوتے ہی قبول کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ واقعی اس پہ اعتماد نہیں کرتے تھے۔ سوچ سوچ کر اس کا کلیجہ کٹنے لگتا۔

ایک روز زلیخاں کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تو اس کی ماں اسے لے کر مقامی ہیلتھ سنٹر جا پہنچی۔

''اری رو رو کر ہلکان کیوں ہو رہی ہے۔ بچے کو بھی نقصان پہنچنے کا ڈر ہے.....ایسے نہ کر دھیئے۔'' ماں نے درد سے تڑپتی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بچہ؟ کون سا بچہ؟ ڈاکٹرنی نے اسے اچھی طرح آلات سے چیک کر کے کہا۔ اس کے پیٹ میں تو کوئی بچہ نہیں ہے۔''

''ہیں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ ڈاکٹرنی جی؟'' زلیخاں چیخی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں چھوٹی ملکانی جی.....میرا مطلب ہے زلیخاں بی بی۔ آپ کے اندر کوئی خرابی ہے، جس کی وجہ سے دنوں کا حساب گڑبڑ ہے یا پھر آپ کو جھوٹ موٹ کا حمل ہو گیا ہے۔ جن عورتوں کو بچے کی بہت زیادہ چاہ ہوتی ہے۔ ان کے جسم میں ایسی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جن سے لگتا ہے کہ وہ پیٹ سے ہیں، مگر ایسا ہوتا نہیں۔''

زلیخاں اور اس کی ماں ہکا بکا ہو کر ڈاکٹرنی کی بات سنتی گئیں مگر ان کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"آپ لوگوں کو سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس میں یہ دوائیاں لکھ دیتی ہوں۔ اس سے آپ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی اور دن بھی ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ فکر والی کوئی بات نہیں۔"

زلیخاں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ خوشی کا مقام تھا یا رنج کا؟

"بچہ نہ ہونے کا اسے دکھ تو ہو رہا تھا مگر اپنی پاکبازی ثابت ہو جانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ملک صاحب تو اسے تین بار طلاق دے چکے تھے اور اب وہ ملکانی سے واپس زلیخاں بن کر اپنے ماں باپ کے ہاں رہنے پہ مجبور تھی۔ حالات بڑے عجیب ہو گئے تھے۔

ماں نے اپنی دکھوں کی ماری بیٹی کو دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ کتنی پیاری تھی وہ۔ ہاتھوں میں سونے کا چوڑا، قیمتی کپڑے، موبائل فون، ملک صاحب نے اس سے کچھ بھی تو واپس نہیں لیا تھا، سوائے اپنے آپ کے۔ اب بھی وہ اسے ماہانہ خرچ دیتے تھے۔ ملکانی بننے کے بعد سے وہ اب ان سب گھر والوں سے کتنی مختلف اور برتر لگنے لگی تھی۔ یوں جیسے ان میں سے ہو ہی نہ بلکہ کسی اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔

"جھلیئے لوکے..... اب جو ہونا تھا ہو گیا..... پر یہ ہوا بڑا ظلم ہے ہماری کاکی کے ساتھ۔" باپو کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

"ریاض جی نے مجھے خواہ مخواہ ہی طلاق دے دی۔ بچہ نہ دیا تو اللہ جی میرے سر پہ سائیں تو رہنے دیتا، اس نے تو مجھ سے میری دنیا ہی چھین لی، جبکہ میرا قصور بھی کوئی نہ تھا۔" زلیخا اپنے آپ سے بڑبڑانے لگی۔ غم و غصے سے اس کا کلیجہ پھٹا چلا جا رہا تھا۔

"ٹھنڈے ہو کر ہمیں سوچنا ہے کہ اب زلیخاں کی زندگی کا ہو گیا کیا؟"

دونوں ماں باپ سر جوڑ کر آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔

اگلی صبح ملک صاحب اپنی بیٹھک میں زلیخاں کے ماں باپ کو بیٹھے، اپنا انتظار کرتے دیکھ کر کچھ حیران، کچھ خفا اور کچھ خفیف سے نظر آئے۔ ان کے بڑے بیٹے شفیع نے جو اسی دن گندم کی کٹائی سے فارغ ہو کر بڑا خوش خوش بینک کو جانے والا تھا، سرسری طور پر پوچھا۔

"کیسے آئے ہو تم لوگ؟ کوئی پیسے ویسے چاہئیں بیٹی کے لیے؟ ویسے اب تم لوگوں کو یہاں آنا تو نہیں چاہئے تھا۔"

"ملک صاحب جی ہم آپ کی جوتیوں کی خاک، آپ کے کمی کمین، آپ کے در پہ نہ آئیں گے تو کہاں جائیں گے جی؟" زلیخاں کے باپو نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"آپ کی زلیخاں آپ کے لیے بہت روتی ہے جی۔ میری معصوم دھی بڑی دکھی ہے۔" زلیخاں کی ماں نے بےبس میں چنگاری پھینکی۔ زلیخاں کی خوبصورت یاد کا تیر ہوا میں لہراتا ہوا آیا اور ملک صاحب کے کلیجے میں پیوست ہو گیا۔

"دکھی ہے وہ شیطانی؟ کتنا اچھی طرح رکھا تھا ابا جی نے اسے۔ ہم سب بھی کتنا پیار اور عزت دیتے تھے اسے۔ مگر سچ بات ہے نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا..... اس نے اپنی اصلیت دکھا ہی دی آخر۔" بیٹا بڑھ بڑھ کر بولنے لگا۔ اس کی بیوی بھی پاس آ کے کھڑی ہو گئی اور سارا معاملہ سمجھ گئی۔

"ایسا نہ کہیں چھوٹے ملک جی۔ وہ پاک صاف ہے جی۔ ملک صاحب آپ خود ڈاکٹرنی سے پوچھ لیں جی۔ کچھ بھی نہیں تھا اس کو۔ ہم نے پتہ کروا لیا ہے جی سارا۔"

"کیا؟" ملک صاحب ایک دم جیسے نیند سے چونکے۔

"وہ جی ڈاکٹرنی صاحبہ نے اچھی طرح دیکھ کر کہا ہے اسے جھوٹ موٹ کا حمل ہو گیا تھا۔ بس جی وہی تھا اسے۔"

"جھوٹ موٹ؟ یہ نئی ہی بات سنی ہے ہم نے۔" بہو ملکانی طنزیہ ہنسی ہنسی۔

"جو بھی ہے اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اسے کہو اپنی قسمت پہ صبر کرے اور کیا؟" ملک شفیع نے بات ختم کرنے کے انداز میں اٹھ کر اپنی چیزیں سنبھالنا شروع کر دیں۔

"صغریٰ ذرا بچوں کو تیار کر دے آج میں انہیں بھی زمینوں پہ لے جا رہا ہوں" اس نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

"سو بسم اللہ میں ابھی انہیں تیار کر کے بھیجتی ہوں۔ اچھا ہے بچوں کو ابھی سے پتہ اور عادت ہونی چاہئے کہ اپنی جائیدادیں کیا ہوتی ہیں اور انہیں کیسے سنبھالنا ہے انہوں نے آگے جا کر۔"

صغریٰ نے زلیخاں کے ماں باپ کے جانے کے بعد میاں کے قریب جا کر سرگوشی کی۔

ملک صاحب کی حالت کچھ عجیب سی ہو کے رہ گئی تھی۔ بار بار ہاتھ ملتے کہ اب انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ان سے جلد بازی میں ایسی غلطی ہو گئی جس پہ وہ جتنا بھی پچھتاتے کم تھا۔ ان کی تنہا زندگی کی ڈگمگاتی نیا کتنے سکون سے کنارے جا لگی تھی، مگر انہوں نے رسی کھول کے خود ہی اسے طوفان کے حوالے کر دیا تھا۔ احساس جرم کے زہریلے بچھو انہیں ڈنک مارتے تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنا کلیجہ مسلتے اور نصیبوں پہ آنسو بہانے لگتے۔ ''کاش میں نے عقل سے کام لیا ہوتا'' وہ سوچتے۔ انہوں نے ڈاکٹرنی کے پاس خود جا کر زلیخاں کی بابت اچھی طرح پوچھ گچھ کر لی تھی اسی لئے اب تو ان کا جینا محال ہو گیا تھا۔ بے چینی اور بے کلی نے انہیں تقریباً بیمار سا بنا دیا۔

انہیں زلیخاں سے حقیقی محبت تھی مگر اس محبت کو وہ خود کنوئیں میں دھکا دے چکے تھے۔ وہ محبت جو ڈوب کر پاتال میں بیٹھ نہیں رہی تھی بلکہ کسی ادھ موئے کمھلائے ہوئے کنول کی طرح سطح آب پہ تیرتی نظر آتی تھی۔

''آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ خدارا مجھے اس تکلیف سے نکلنے کے لئے کوئی تسبیح، کوئی وظیفہ ہی بتائیں۔'' ایک روز بعد از نماز عشاء وہ مولوی صدیق کے پاس بیٹھے بیٹھے رو پڑے۔ اس وقت لوگ گھروں کو جا چکے تھے اور مولوی صاحب مسجد کے صحن میں رکھے ٹی وی پہ کسی مذہبی پروگرام کے لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''مولوی صاحب مجھ سے غلطی ہو گئی جی۔ میں نے اپنی پاکباز بیوی پہ شک کر کے اپنی زندگی خود برباد کر لی اب میں کیا کروں؟''

''ملک صاحب اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کو ایک مکروہ فعل قرار دیا ہے۔ مردوں کو سوچ سمجھ سے کام لینا چاہئے۔ یہ زندگی کے معاملے ہوتے ہیں، کوئی گڈی گڈے کا کھیل نہیں۔''

''مولوی صاحب میں اس سے دوبارہ.....؟'' ملک صاحب دل کی بات زبان پہ لے آئے۔

''دوبارہ.....؟ ہوں'' مولوی صاحب کچھ دیر خاموش رہے.....دوبارہ کا مطلب پتہ ہی ہے ملک صاحب کہ آپ کو ان کا حلالہ کروانا ہو گا۔''

''حلالہ'' ملک صاحب کا منہ لٹک گیا۔ آنکھوں میں بھرے آنسو باہر چھلک آئے۔

''چلیں سوچتے ہیں، کوئی رستہ نکالتے ہیں۔'' مولوی صاحب نے ہنکارا بھرا۔

''اچھا؟'' ملک صاحب کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

''کچھ رقم لگے گی، بس یہ سوچ لیں۔''

''جتنی رقم چاہیں میں لگانے کو تیار ہوں مولوی صاحب بس یہ خیال رہے کہ نکاح ہوگا مگر رخصتی نہیں ہوگی..... سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ ملک صاحب نے بے چینی سے وضاحت کی۔

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔ ہم سب سمجھدار ہیں۔ بہنوں، بیٹیوں والے ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میں انشاءاللہ کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔''

ملک صاحب گرمجوشی سے مصافحہ کر کے اٹھے اور پر امید دل کے ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے۔ اگلی صبح وہ فوراً زلیخاں کے گھر جا پہنچے۔

''زلیخاں کہاں ہے؟'' ملک صاحب دھیمی آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔

''اندر'' زلیخاں کی ماں نے مختصر جواب دیا۔ ''آپ نے ملک صاحب جی میری شریف دھی پہ الزام لگا کر اچھا نہیں کیا جی بڑے دکھی ہیں ہم سب۔''

''او چل چپ کر رحمتے، مردوں سے ایسی غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں، کوئی بات نہیں وہ آئے تو ہیں۔ ہمارے مالک ہیں۔ اب کیا ہم انہیں ان کی غلط فہمی کی سزا ہی دیتے چلے جائیں گے۔'' باپو نے رحمتے کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''دراصل میں اس سے پھر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ملک صاحب نے اپنے آنے کا عندیہ بیان کیا اور لمبی سی سانس لی۔

''ملک صاحب جس دن سے وہ آپ کی حویلی سے آئی ہے جی، ہروقت روتی رہتی ہے مجھ سے تو جی دیکھا نہیں جاتا۔ وہ تو جی بس اپنے محلوں کے لیے ہی بنی تھی۔ یہاں بے چاری اب تنگ ہوتی ہے۔'' زلیخاں کے جوان، نکمے، بے کار بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

ملک صاحب شرمندگی سے زمین کے اندر دھنستے چلے جا رہے تھے۔ یکا یک وہ اٹھے جیسے ان کے جسم میں کوئی انجانی سی طاقت بھر گئی ہو، روبوٹ کی مانند چلتے چلتے اندر زلیخاں کے پاس جا پہنچے اور کچھ کہے سنے بغیر، روتی ہوئی زلیخاں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

''مجھے معاف کر دے میری جان'' ملک صاحب خود کو اس کے بھرے بھرے سینے میں

چھپا کر سکنے لگے۔

''اب میں تجھے کوئی شکایت نہ ہونے دوں گا۔ تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔ بس ایک بار مجھے معاف کر دے۔ ہم پھر ایک ہو جائیں گے دوبارہ۔''

باہر بیٹھے زلیخاں کے ماں باپ اور بھائی بہن کسی موہوم، جھلملاتی ہوئی امید سے اپنے تاریک صحن کو روشن ہوتے دیکھ کر دعائیں مانگ رہے تھے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لے رہے تھے۔ نمی نمی مسکراہٹ سے ان کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ شکر ہے مولی نے ان کی پھر سے سن لی تھی۔ خوش تھے کہ ایک بار پھر ایک بڑے آدمی سے رشتہ داری ہونے جا رہی تھی کیونکہ بڑے لوگوں سے رشتہ داری ہونا اچھا ہوتا ہے۔ بلکہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ خوش نصیبی سے دوستی بہت کچھ سنوار دیتی ہے زندگی میں۔

مولوی صاحب بڑی کوشش کر رہے تھے، مگر انہیں ملک صاحب کی زلیخاں سے حلالہ کرنے کے لئے کوئی اعتباری آدمی نہیں مل رہا تھا۔ ملک صاحب تحمل سے انتظار کر رہے تھے کیونکہ یہ بہت نازک معاملہ تھا۔ بات بنتے بنتے بگڑ بھی سکتی تھی۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ مولوی صاحب کی کوششیں البتہ جاری تھیں۔

ملک صاحب اور زلیخاں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت کی شمع پھر سے روشن ہو گئی تھی۔ بڑا مزا آ رہا تھا ان دونوں کو اس جدائی میں اور پھر چھپ چھپ کر ملنے میں۔ یوں لگتا جیسے وہ کوئی نوجوان جوڑا ہوں اور ظالم سماج ان کی راہ میں کھڑا انہیں ایک دوسرے سے دور رکھتا ہو۔ زلیخاں کہیں بازار جاتی تو ملک صاحب اچانک ساتھ والی دکان پر خریداری کرنے پہنچ جاتے۔

ملک صاحب کھیتوں پہ لگے ٹیوب ویل سے پانی کا اخراج چیک کرنے جاتے تو زلیخاں ساتھ والے کھیت میں اتفاق سے گنے توڑنے آ جاتی۔ بڑا مزا آ رہا تھا انہیں موبائل پہ میٹھی میٹھی باتوں اور اس زخمی رس بھری جدائی کے عذاب کا۔ مگر پھر عذاب برداشت کرنے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے اور ملک صاحب اب اس حد سے گزر جانے والے وقت کے ہاتھوں تنگ آنے لگے تھے۔

''مولوی صاحب کچھ کیا آپ نے؟'' ایک روز وہ بے بس ہو کر پھر مولوی صاحب کے پاس آن دھمکے۔

"آپ کے لیے تو ملک صاحب جان بھی حاضر ہے مگر کیا کروں کوئی اعتبار کا آدمی مجھے نظر نہیں آتا۔ اگر آپ حکم دیں تو میں ہی یہ فریضہ سرانجام دے دیتا ہوں۔ پرانا نمک خوار ہوں آپ کا۔ مجھ پر تو آپ آنکھ بند کر کے یقین کر سکتے ہیں نا؟"

ملک صاحب نے چونک کر مولوی صاحب کو دیکھا اور سر سے پاؤں تک پہلی بار ان کا بھرپور جائزہ لیا۔ "ہوں۔" خطرے کے کوئی خاص سامان نظر تو نہ آرہے تھے۔ نہ مولوی صاحب خوبصورت تھے نہ ہی جوان ویسے بھی جوان بچوں کی ایک فوج کے باپ تھے اس لیے ان کی طرف سے خطرے کا اندیشہ ہو نہ سکتا تھا مگر پھر بھی ملک صاحب کچھ کسمسائے۔

"کیا اس کے بغیر میں زلیخاں سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا؟"

"استغفراللہ کریں جی ملک صاحب۔ اللہ کا حکم ہے جی۔ کیوں اللہ کے غیض و غضب کو آواز دیتے ہیں۔ پہلے ہی اللہ نے آپ کو آزمائش میں ڈالا ہوا ہے۔ توبہ کر لیں جی۔ اللہ ہم سب کی خطائیں معاف کرے۔" مولوی صاحب نے انہیں صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی۔ طے یہ ہوا کہ مولوی صاحب نکاح کے بعد بغیر رخصتی کے زلیخاں ملکانی کو طلاق دے دیں گے اور پھر ایک لاکھ روپے نذرانے کے حقدار ٹھہریں گے۔ سب کو اپنی ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ پھر سب کچھ حسب پروگرام ہو گیا۔ نکاح کی رات زلیخاں کو مکمل پردے اور احتیاط کے ساتھ اس کے میکے گھر لے جا کر چھوڑ دیا گیا اور مولوی صاحب اپنی بیوی بچوں کو چند ہی دنوں میں آنے والی خوشحالی کا مژدہ سنانے ہنسی خوشی گھر کو لوٹ گئے۔ بیوی بچے خوش تھے کہ گھر کے سربراہ نے بالآخر گھر والوں کے لیے کچھ تو اچھا کیا۔ کم از کم کچھ عرصے کے لیے تو وہ اچھا کھا، پہن سکتے تھے، یہ بھی کم نہ تھا۔

عدت پوری کرنے کے بعد زلیخاں چھم چھم کرتی پھر سے حویلی میں داخل ہوئی تو ملک صاحب کو جیسے دوبارہ سے زندگی مل گئی اور بہوؤں، بیٹوں کے ماتھے پہ پڑی سلوٹیں مستقل ہو گئیں۔ زلیخاں نے سہاگن بنتے ہی پھر سے ماں بننے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے مگر اب کی بار اس نے اپنے دل کی ہوک کو باہر نہ آنے دیا۔ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگتی، گڑگڑاتی رہتی اور ماں کے ساتھ مزاروں کے چکر لگاتی رہتی۔

ملک صاحب جانتے تھے کہ زلیخاں کی آرزو کیا ہے، وہ دل میں کچھ دکھی، کچھ شرمندہ

بھی ہوتے کہ ان کی معصوم سادہ لوح بیوی کو اصل حقیقت کا کچھ پتہ نہ تھا مگر وہ کیا کرتے۔ مجبور تھے اس لیے خاموش رہتے اور زلیخاں کی پہلے سے بھی بڑھ کر ناز برداریاں کرنے لگتے۔

"باجی آپ مجھے ڈاکٹرنی صاحبہ کو دکھا دیں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب تک....." ایک روز اس نے بڑی بہو سے جو اس سے عمر میں کافی بڑی تھی، بڑی محبت اور بے بسی سے فرمائش کی۔

بڑی بہو نے ہوں ہاں کر کے سر ہلا دیا اور اپنے شوہر کو جا کر صورتحال بتا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں ملک صاحب کے کمرے میں پھر بچوں کی پنچایت، میٹنگ ہونے لگی۔

"ٹھیک ہے ابا جی ایک بار ہم سب کو غلط فہمی ہو گئی تھی مگر معاف کریں اب، بچی بات کڑوی تو لگے گی آپ کو..... کل کو آپ بوڑھے ہو جائیں گے اور چھوٹی بے بے بہت دیر تک جوان رہے گی۔"

بڑے بیٹے نے بات شروع کی۔

"کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو پھر ہم لوگ کیا کریں گے ابا جی....." چھوٹے نے بات آگے بڑھائی۔

"ابا جی آپ عورتوں کے ذہن کو نہیں جانتے۔ ایک عورت بچہ حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔" بہو نے زنانہ نفسیات کی پٹاری کھولی۔

ابا جی بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ ہونقوں کی طرح منہ کھولے ان کی باتیں سنتے رہے

"کل کے حالات کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔" بڑا پھر بولا۔

"آپ کی جائیدادوں کے صحیح وارث موجود ہیں تو پھر آپ کو شک وشبہ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب اور کسی وارث کی ضرورت تو نہیں ہے نا۔ دیکھ لیں کل کو کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔" چھوٹا بولا۔

ابا جی کو یہ باتیں کچھ اچھی لگ رہی تھیں اور کچھ بری مگر حقیقتیں دیانت داری سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں لہٰذا معصومیت سے بولے "تو پھر کیا ہو سکتا ہے اب؟"

"یہ آپ مجھ پہ چھوڑ دیں۔ چھوٹی بے بے کہہ رہی ہے نا کہ میں اسے ڈاکٹرنی کے لے جاؤں تو بس میں نے تو ڈاکٹرنی سے بات بھی کر لی ہے وہ اس کا کوئی پکا انتظام کر دے گی تا کہ بچہ

ہو ہی نہ سکے۔''

بہو نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

ابا جی نے سر ہلا کے اجازت دی تو ان کے بچوں کے چہروں پہ خوشیوں کے رنگ پچکاریاں چھوڑنے لگے اور محفل خاطر خواہ نتیجے پہ پہنچنے کی وجہ سے فوراً ہی برخواست ہوگئی۔

زلیخاں خوش ہو رہی تھی کہ آج بڑی بہو اسے اپنے ساتھ کلینک لائی تھی اور ڈاکٹرنی سے اندر تفصیل سے اس کے لیے بات چیت بھی کر رہی تھی۔ وہ تو سب گھر والوں، ملک صاحب کے بچوں سے بہت اچھی طرح پیش آتی ہی تھی مگر اب تو وہ لوگ بھی اس سے بہت اچھا سلوک کرنے لگے تھے اور اسے اس بات کی بہت خوشی ہو رہی تھی۔

''دیکھیں چھوٹی ملکانی جی، میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کروں گی۔ آپ کو سارا اندر سے اچھی طرح چیک کروں گی۔ آپ فکر نہ کریں، آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' ڈاکٹرنی نے پیار سے زلیخاں کے سرخ و سفید گال تھپتھپائے اور خود آپریشن کی تیاری کے لیے نرس کو ضروری ہدایات دینے میں مصروف ہوگئی۔

''میں بھی باہر والے کمرے میں بیٹھی رہوں گی۔ آپ کو ساتھ لے کر ہی گھر جاؤں گی فکر نہ کرنا۔'' بہو نے تسلی دے کر محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔

زلیخاں کو ہوش آیا تو کچھ درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے نقاہت سے سوال کیا۔ ''یہ درد کیوں ہو رہا ہے ڈاکٹرانی جی؟''

''ملکانی جی۔ آپ کے اندر ایک چھوٹا سا نقص تھا، وہ میں نے ہمیشہ کے لیے ٹھیک کر دیا ہے آپ اب گھر جا سکتی ہیں؟''

''اچھا؟ نقص تھا نا؟ تبھی تو..... لیکن اب سب کچھ ٹھیک کر دیا ہے نا آپ نے؟'' زلیخاں نے بھولپن سے پوچھا۔

''آپ کے من کی مراد بر آئے گی۔ اللہ بڑا کارساز ہے ملکانی جی۔'' ڈاکٹرانی نے ڈولتی ہوئی مریضہ کو بڑی بہو کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے سنبھل کر چلنے کی ہدایت کی اور خود اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بہت تھک گئی تھی وہ۔ اس نے کرسی پہ بیٹھ کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا، پھر کچھ خیال آنے پر چابی لگا کر میز میں لگا ایک خفیہ دراز کھولا۔ دراز میں کتنی رونقیں لگی ہوئی تھیں۔

ایک پھولا ہوا لفافہ اجلی اجلی روشنیاں بکھیر رہا تھا۔انہوں نے لفافے کو ہاتھ میں تھام لیا اور آنکھیں بند کر کے ہولے ہولے اُسے کسی محبوب کے بدن کی طرح چھو چھو کر محسوس کرنا شروع کر دیا۔فرحت وانبساط سے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

ملک صاحب کی اولادوں نے مطمئن ہو کر اپنی زمینوں اور جائیدادوں کے معمولات میں حسب سابق اپنے آپ کو گم کر لیا اور ملک صاحب اور زلیخاں ایک بار پھر ہنسی خوشی زندگی گزارنے میں مصروف ہو گئے۔

سال گزرتے گئے۔زلیخاں مزاروں،پیروں کے آستانوں پہ چکر لگاتی رہی کہ اسے اللہ کے ہاں سے دیر کا خدشہ تو تھا،اندھیر کی توقع نہیں تھی۔

▼▲▼▲▼▲▼

کل اور آج

رابعہ پارک میں ٹریک کا ابھی پہلا ہی چکر مکمل کر رہی تھی کہ اس نے گیٹ کے پاس ایک رکشہ رکتا دیکھا۔ اترنے والی لڑکی پڑھی لکھی اور مہذب دکھتی تھی۔ وہ اور لوگوں کی طرح واکنگ ٹریک پہ چلنے کے بجائے ایک بنچ پر بیٹھ گئی یوں جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ رابعہ مسکرائی..... گویا محبت اب بھی ہوتی ہے..... پارکوں میں آج بھی ملاقاتیں ہوتی ہیں.....اچھا ہے محبت نہ ہو تو زندگی میں مزا ہی کیا ہے.....اسے اپنا تیس سال پرانا وقت یاد آ گیا۔ وہ بھی کبھی کسی سے ملنے پارک جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا آیا کرتا تھا۔ خاص طور پہ وہ دن اسے کیسے بھول سکتا ہے جب وہ دونوں بانسوں کے سبز سبز جھنڈ میں چھپے بیٹھے تھے۔ رابعہ نے پیلا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس پہ بہت کھل رہا تھا یکدم ایک چیونٹی رابعہ کی گردن پہ چڑھی اور نیچے اس کے گریبان تک سفر کرتی محسوس ہوئی۔ وہ ایکدم چیخ اٹھا....."اس چیونٹی کی جرات دیکھو..... ہٹاؤ اسے میں جیلس ہو رہا ہوں"..... رابعہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"کاش میں اک چیونٹی ہوتا....." وہ حسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "تو میں تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کرتی حضور....." رابعہ نے چیونٹی کو پکڑا اور مسل کر گردن سے نیچے اتار پھینکا۔ دونوں ہنستے چلے گئے.....یکدم رابعہ اداس ہو گئی.....نہ جانے کہاں ہو گا وہ؟.....کبھی مجھے یاد بھی کرتا ہو گا یا نہیں.....واک کرتے کرتے اس کے قدم سست پڑ گئے اور ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

بنچ پر بیٹھی لڑکی تھوڑی دیر بعد گھڑی دیکھتی رہی اور رابعہ کی بے چینی عروج پکڑتی گئی۔
''کہاں رہ گیا کم بخت..... کتنا انتظار کرواتے ہیں یہ آنے والے۔'' پارک کا پانچواں چکر لگاتے ہوئے رابعہ کی آنکھیں مسلسل لڑکی پہ مرکوز رہیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے صاف دیکھ لیا تھا کہ اب لڑکی کی آنکھوں کی منتظر چمک غائب ہو چکی تھی۔ رابعہ کا دل چاہا پاس جا کر اسے دلاسہ دے، پچکارے مگر کیسے کرتی؟ نہ جان نہ پہچان۔ دونوں اجنبی اور ایک دوسرے کے لیے انجان۔ قریباً پون گھنٹے بعد لڑکی اٹھی اور گیٹ سے باہر جانے لگی۔ ''نہیں آیا، بے حس کہیں کا۔ اس معصوم کو چکر دے گیا۔ توبہ یہ مرد کبھی نہیں بدلیں گے۔'' اس نے دل ہی دل میں اس نہ آنے والے کو ہزاروں کوسنے دے ڈالے۔ ''ہونہہ دنیا بدل گئی مگر محبت میں کچھ بھی نہیں بدلا۔'' رابعہ نے لڑکی کو ایک رکشے میں سوار ہوتے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی واک کا فائنل چکر کاٹنے میں مصروف ہو گئی۔

▼▲▼▲▼▲▼

میں کون!

فائیو سٹار ہوٹل میں منعقدہ کانفرنس کے شرکاء گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ موضوع تھا ہی اتنا دلچسپ کہ اس پر جتنی بھی بحث کی جاتی کم تھی۔ بڑے بڑے عالم دین، دانشور، ماہر نفسیات، ماہر تعلیم سر جوڑے بیٹھے تھے کہ ''انسان کا باطن کیسے معلوم ہو۔'' کوئی کہہ رہا تھا انسان کے معاشرتی پس منظر سے اس بات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کسی کا خیال تھا فرد کی مذہبی اٹھان دیکھنے سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک سپیکر کا خیال تھا کہ صرف Lie Detector test (جھوٹ پکڑنے والے آلے) سے ہی قابل اعتماد نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایک اصرار کر رہا تھا کہ خوف انسان کے اندر سے حقیقت باہر کھینچ لاتا ہے، مگر کہیں بھی کسی بھی نکتے پر اتفاق رائے نہیں ہو رہا تھا۔ پروفیسر تونسوی اور مولانا حاشر بھی آپس میں اس مسئلہ پر بار بار الجھ رہے تھے۔

لنچ کا انتظام ایک پر فضا ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچے اور ایک پر تکلف ظہرانے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ دوران طعام بھی آپس میں اسی موضوع پہ تبادلہ خیال جاری رہا۔

لنچ کے بعد آخری سیشن تھا جسے اٹینڈ کرنے کے لیے سب دوبارہ ہوٹل کی جانب چل دیے۔ اس سیمینار میں ملک کی کریم مدعو تھی اس لیے سکیورٹی کے انتظامات کافی سخت تھے۔ مین گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ایک آہنی رکاوٹ آپ کی گاڑی کو روکتی تھی۔ سکیورٹی گارڈز لپک کر آگے بڑھتے، گاڑی کو اوپر نیچے، اندر باہر ہر طرح سے چیک کرتے تب کہیں

اندر جانے کا اذن ملتا۔

پروفیسر حاشر اور مولانا تونسوی کی گاڑی آہنی ڈنڈے کے پاس آئی تو خلاف توقع گارڈ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بغیر رکے آگے بڑھ جانے کو کہا۔ وہ اندر چلے تو گئے مگر پروفیسر حاشر کی اصول پرستی نے انہیں کچھ حیران سا کر دیا اور وہ گارڈ سے اتر کر پوچھنے لگے
''بھئی تم نے ہماری گاڑی کو بلا چیکنگ کیوں اندر جانے دیا.... کیا پتہ ہمارے پاس کچھ قابل اعتراض چیز موجود ہو.....''

گارڈ نے پل بھر کو پروفیسر صاحب کو دیکھا اور پھر نیچے نظریں کیے مسکرا کر اعتماد سے بولا:
''صاحب جی ہمیں تو چہرہ دیکھ کر ہی بندے کے اندر کا پتہ چل جاتا ہے.....آپ جائیں جی.....کوئی بات نہیں۔

▼▲▼▲▼▲▼

اچھے دن

سننے میں آیا کہ عروس البلاد کی تقدیر بدل گئی ہے۔ دن پہلے جیسے نہیں رہے۔ امن، چین، سکھ، شانتی کا دور دورہ ہے۔ فکر فاقہ ختم ہو گیا ہے۔

پیادہ صدیوں، قرنوں کا سفر کرتا، فاصلے چاٹتا، دنیا میں پھلانگتا، ایک گھر سے دوسرے گھر گھومتا سوچتا تھا۔ شام ہو رہی ہے، کیوں نہ شہر کی سیر کو نکلوں اور خود اپنی آنکھوں سے اس بدلی ہوئی صورتحال کا جائزہ لوں۔ کیا خبر واقعی اچھے دن آ چکے ہوں؟

وہ ڈیفنس کی اک کشادہ سڑک خیابان مجاہد سے سمندر کو جانے والی سڑک پہ ہو لیا کہ سمندر اور فنا ہی بالآخر ہر ذی روح کی منزل تھے۔ ایک کے بعد ایک کوٹھی آتی اور پیادہ اس کے سامنے سے سیٹی بجاتا، ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ پوری سڑک پہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نفس موجود نہیں ہے۔ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟ اتنی ویرانی کیوں ہے؟ شہر کی آبادی کو کون سی بلا کھا گئی ہے؟

پل بھر کو وہ ٹھٹکا، گھروں کے اندر سے آنے والی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ مکین اندر موجود ہیں مگر گھر کے باہر کے ماحول میں سراسیمگی اور ایک غیر مرئی سا احساس خوف زدہ کئے دے رہا تھا۔ اسے لگا وہ کسی سائنسی فکشن فلم یا انتظار حسین کے افسانے کا کردار ہے جو پوری بستی میں اکیلا رہ گیا ہے۔ وہ سوچنے لگا یہ محلوں میں بیٹھ رہنے والے کیا اب سمندر کے رخساروں کو چھو کر آنے والی ہوا سے ہم آغوش ہونے کی خواہش سے آزاد ہو چکے ہیں؟

سنسان سڑک پہ ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد اور نہ کوئی نظارۂ دلنشیں۔ اس نے دیکھا شام اتر رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیلی نیلی وردیوں والے بندوق بردار محافظ۔ ایک بڑی سی نیلی وین ہر ایک کوٹھی کے آگے رکتی، اپنا کارندہ اتارتی اور چل دیتی۔ وہ پیادے کو دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور طنزیہ انداز میں مسکراتے جیسے کہہ رہے ہوں "یہ کون پاگل ہے آج کے زمانے میں جو اکیلا سڑک پہ چل رہا ہے۔" پیادے پہ اچانک یہ راز کھلا کہ اب اس شہر میں صرف خوف کا بسیرا ہے۔ بستی میں بس یہی رہتا ہے۔ وہ ڈھلتے سورج کے نارنجی تھال کی طرف سرپٹ بھاگنے لگا۔ سمندر نے شور مچا کر اپنی آغوش وا کر دی۔ بگلے چیخ چیخ کر کہنے لگے "مور کھ یہ شہر ہول ہے۔ جہاں شہری محبوس اور تحفظ عنقا ہے۔ لوٹ جا ان ایام کی طرف جہاں سے گزر کر تو یہاں تک پہنچا ہے۔ اب انسان خوف کے اسیر ہیں۔ انہیں سانس نہیں آتا ہے۔"

پیادہ تھک کر سمندر کنارے بنی فصیل پہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا یہ کیسا شہر ہے جہاں چور خود مختار اور عوام بے اختیار ہیں۔ دولتمندوں کی دولت کی رکھوالی کو بینک لاکر پھن پھیلائے بیٹھے ہیں۔ پہرے کے بغیر کوئی چین کی نیند سو نہیں سکتا۔ اس نے آج کا تازہ اخبار کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ خبر تھی کہ ملک ترقی کی راہ پہ گامزن ہو چکا ہے۔ ٹیلی کام کے شعبے میں اتنی زیادہ پیشرفت ہوئی ہے کہ اب ہر شہری کے پاس موبائل فون آ گیا ہے۔ فراوانی کا سہانا موسم ہے۔ پٹرول ذرا مہنگا ہے مگر کچھ پاگل لوگ اسے اپنے اوپر انڈیل کر ضائع کر دیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ماچس اب بھی سستی ہے۔ آگے اخبار میں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

نہ میں یوں

میں اور میری ہمسائی آصفہ اکٹھی بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ ایئر کنڈیشنڈ یخ بستہ کمرہ ایک دم سے یوں گرم ہونا شروع ہو گیا جیسے یاد دلا رہا ہو کہ مت بھولو کہ اصلی گرمی بھی کہیں آس پاس ہی منڈلا رہی ہے۔ ذرا اس کا بھی مزا چکھ کر دیکھو۔

"چلو بازار سے سودا ہی لے آئیں۔" میں نے آصفہ سے کہا اور چند ہی منٹوں میں ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو کر گوشت سبزی، درزی والے بازار کی طرف چل دیں۔ ابھی ہم شروع کی دکانوں تک ہی پہنچی تھیں کہ ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر رک گئیں۔

"کیا ہوا؟" ہم نے اردگرد کھڑے لوگوں سے سوال کیا اور خود لوگوں کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے اوپر کو دیکھنے لگیں۔ ایک میدان نما جگہ میں بجلی کا ایک اونچا تکون ٹاور کھڑا تھا جس کی جانب سب نظریں جمائے ہوئے تھے۔

اس طرف دیکھتے ہی میرا خون رگوں میں جمنا شروع ہو گیا اور پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ وہاں ایک شخص بجلی کے کھمبے میں یوں پھنسا نظر آ رہا تھا جیسے مکڑی کے جال میں کوئی پتنگا ہو۔

"چچ چچ..... یہ کیا ہوا؟" آصفہ نے سوال کیا۔

"وہ جی کرنٹ لگ گیا ہے..... لائن مین ہے اوپر کام کر رہا تھا۔"

آوازیں کانوں میں پڑنے لگیں۔

ہائے ہائے..... میرے دل سے ہوک سی نکلی۔ افسوس یہ بے چارے بھی کبھی اپنی جاب

میں جان تک گنوا دیتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

''آپی آپ تو اس طرف نہ ہی دیکھیں، آپ کی حساس طبیعت کا مجھے اچھی طرح پتہ ہے پھر رات بھر سو نہ سکیں گی گولیاں پھانکیں گی.....''

آصفہ نے مجھے پیار بھری ڈانٹ پلائی مگر میں اس وقت اتنی آزردہ تھی کہ اس کی اس بات پر مسکرا بھی نہ سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے واپڈا کی ایک لمبی سیڑھی والی گاڑی نیچے آ کر کھڑی ہوگئی اور ایک دوسرا لائن مین اپنے ساتھی کے تن مردہ کی طرف تیزی سے محتاط قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ بے چارہ صبح سویرے گھر سے نہا دھو کر تیار ہو کر کام پہ نکلا ہوگا۔ بیوی نے اسے رات کے سالن کے ساتھ پراٹھا بنا کر دیا ہوگا۔ رخصت کرتے وقت سوچا بھی نہ ہوگا کہ ایک دو گھنٹے بعد وہ اتنی اونچائی پر جا پہنچے گا کہ وہ اس کی گرد تک کو نہ پا سکے گی۔ پتہ نہیں اس کے بچے سکول جانے سے پہلے اسے ملے بھی ہوں گے یا نہیں۔ بجلی کے تار پہ چڑھتے سے اس نے کیا سوچا ہوگا؟ اب تو وہ ایک بے بس کا کروچ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ سوچوں کی بھنبھناہٹ سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ لاش جب گھر پہنچے گی تو اس کے گھر والے کتنے حیران ہو کر اس کے چہرے کو دیکھیں گے کیسے کیسے بین کو مس گے اپنے بال نوچیں گے.....اف.....

کچھ بھی ہو واپڈا والے اس کے گھر جا کر تعزیت کے ساتھ مالی امداد تو ضرور کریں گے۔ کل کے اخبار میں خبر آئے گی اور ساتھ ہی تصویر چھپی ہوگی جس کے نیچے لکھا ہوگا.....ایک واپڈا کے مہان افسر بیوہ کو چیک دے رہے ہیں اور یتیم بچوں کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے ہیں.....ہونہہ یہ بے حس سرکاری افسر، بڑے بڑے اہلکار.....انہیں تو صرف اپنے نام کی پروجیکشن سے دلچسپی ہے اور کچھ نہیں کسی انسان کی جان کے ضیاع کا بھلا انہیں کیا احساس؟ بے بسی تو اس قوم کی نس نس میں سرایت کر چکی ہے.....تو پہ بس اللہ ہی غریبوں کا والی وارث ہے ورنہ سٹیٹ تو بالکل فیل ہو چکی ہے.....ویسے بطور اس معاشرے کے فرد، میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ میں اپنے حصے کی ذمہ داری اٹھاؤں اور اس غریب کے بال بچوں کی حتی الوسع مدد کروں۔ آخر ہم سب اپنے اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ ہیں۔ میں سوچتی چلی گئی۔

''آصفہ کیوں نہ میں اور تم اس بجلی والے کے گھر جا کر اس کی بیوی بچوں کو کچھ دے دلا ہی آئیں؟'' میں نے اپنی ہمسائی سے مشورہ کیا ''تو چلیں آج اور ابھی چلتے ہیں، نیک کام میں دیر کیا'' آصفہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''نہیں آج نہیں آج تو وہاں کہرام مچا ہوگا۔ایک دو دن میں آرام سے جاتے ہیں،
جانے والا تو چلا ہی گیا ہے رش کم ہو جائے گا تو سکون سے بات ہو سکے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے گھر کا تو ہمیں پتہ ہی نہیں؟'' آصفہ نے اہم نکتہ اٹھایا'' بھئی واپڈا کے دفتر جا کے پتہ کرلیں گے اب تکلیف تو ہمیں اٹھانا ہی ہوگی نا''..... میں نے اسے قائل کرلیا اور ہم دونوں پھر اوپر دیکھنے لگیں۔تھوڑی ہی دیر میں بجلی والے کے بے جان جسم کو رسیوں میں باندھ کر ہولے ہولے نیچے اتار لیا گیا، تماشہ دیکھنے والوں میں ایکسائٹمنٹ کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ہم دونوں نے وہاں سے چل دینے میں ہی عافیت جانی اور بے دلی سے سودا خریدنے میں مصروف ہو گئیں۔تمام دن طبیعت مکدر رہی۔بار بار وہی صبح والا نظارہ آنکھوں میں گھوم جاتا۔

یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اگلے روز اخبار میں نہ تو اس کی کوئی خبر شائع ہوئی اور نہ ہی تصویر نظر آئی۔ایک بجلی والا مر گیا مگر اہم خبر نہ بن سکا۔

ایک دو دن تک مجھے خیال آیا کہ ہم نے تو اس کے گھر جانا تھا مگر واپڈا کے دفتر کے چکر لگانے کے خوف سے ہم نے اسے اگلے ہفتے پہ ٹال دیا اور یوں ایک کے بعد ایک دن گزرتا چلا گیا۔ہم دونوں ٹھہریں انتہا کی مصروف،کبھی بینک میں بل جمع کروانا ہے کبھی گاڑی کو ورکشاپ لے جانا ہے.....
بس بھاگ دوڑ اور مصروفیت ہی زندگی ہو کے رہ گئی ہے آج کل۔پھر یہ سوچ کر بھی مطمئن ہو جاتی ہوں کہ واپڈا والوں نے اس کے گھر والوں کو کچھ نہ کچھ تو معاوضہ ضرور دیا ہوگا، آخر اتنا بڑا قومی ادارہ ایسی غفلت کا تو متحمل نہیں ہو سکتا۔یہ ان کی ذمہ داری ہے بلکہ ساری قوم کی ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے کا خیال رکھیں ہاتھ سے ہاتھ ملا کر زنجیر بن جائیں۔اتحاد اور اعتماد سے اس ملک کو بہتر بنائیں۔

آج اس حادثے کو گزرے کئی ماہ گزر چکے ہیں۔آصفہ ٹھیک کہتی تھی میں اپنی حساس طبعی کی وجہ سے واقعی اس افسوسناک دن کو بھلا نہیں سکی ہوں۔اپنی روزمرہ خریداری کے لیے جب بھی بازار جاتی ہوں، چاروناچار آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔وہ بجلی والا مجھے وہیں ٹنگا نظر آتا ہے۔دل میں اک تیر سا جا لگتا ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔میں نظریں بچا کر جلدی جلدی گاڑی وہاں سے بھگا لے جاتی ہوں کہ ایک بے جان پتنگا مکڑی کے جال میں پھنسا مجھے تک رہا ہوتا ہے.....اور پوچھتا ہے تمہیں فرصت کب ملے گی؟

خواب میں گم

مرزا حسام الدین صاحب کے گھرانے کے طور طریقوں سے دوست احباب، رشتہ دار سبھی مرعوب تھے۔ کیا رکھ رکھاؤ، کیا تہذیب، کیا اصول پرستی تھی ان کی زندگی میں۔ کیا قاعدہ قرینہ تھا ان کے رہن سہن میں۔ خوش قسمت آدمی تھے۔ اچھی بیوی، فرمانبردار بچے، مناسب آمدن، خوبصورت گھر اور کیا چاہئے ہوتا ہے انسان کو..... انہوں نے اپنے بچوں کو ہمیشہ اچھی اقدار، سوچ سمجھ اور نیک آدرشوں کا درس دیا تھا۔ وہ کہتے "سچائی، محنت اور محبت سے زندگی جیو تو ہر منزل آسان ہو جاتی ہے۔ راستے خود بخود سامنے بچھتے چلے جاتے ہیں، مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ دیانت ہی دھرم، ایمان اور مقصد حیات ہوتی ہے، سچائی پر رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ یہی حقیقی مذہب ہوتا ہے۔

ان کی اولاد نیک تھی، باپ کے کہنے کا پاس رکھتی تھی۔ اسی لئے کافی حد تک صراط مستقیم پہ رواں زندگیاں گزار رہی تھی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا۔ مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی جوان ہو گئی۔ گلشن نے ان کی زندگیاں اتھل پتھل کر کے رکھ دیں۔ خوش نما، نرم و نازک، خوش رنگ پھولوں کے گلدستے میں ایک پھول نوکیلے کانچ کا نکل آیا جس کی بناوٹ رنگ اور وجود سب سے علیحدہ تھا۔ اسے انگلی سے چھوؤ تو چبھتا تھا، بے احتیاطی سے پکڑو تو ٹوٹتا تھا۔ یہ کیسی لڑکی پیدا ہو گئی تھی ان کے خاندان میں؟ سب گھر والے حیرت میں گم تھے، اتنی مختلف، اتنی متضاد طبیعت کہ ان سے سنبھالے نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔ اس کے بارے میں آسانی سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کیا

تھی! شوقین، جرأت مند، شوخ، بے پرواہ، خود غرض یا کچھ اور! اسے کسی قسم کی کوئی جھجک یا ڈر خوف نہیں تھا۔ جو جی چاہتا کر گزرتی اور اس پر قطعاً شرمندہ نہ ہوتی۔ اس کی ایسی ہی عادات کی وجہ سے پیٹھ پیچھے کئی رشتہ دار تو اسے لفنگی تک کہہ دیتے مگر مرزا صاحب کی شرافت اور خلوص قلب کو دیکھ کر ان کے سامنے خاموش رہتے اور ان کی بدنصیبی پر کف افسوس ملنے لگ جاتے۔

مرزا صاحب اسے پاس بٹھا کر پیار سے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے، نصیحتیں کرتے۔ بتاتے کہ تم ایک کنول ہو، کیچڑ سے خود کو بچائے رکھنا تمہارا فرض ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی کہ زندگی گزارنے کا اس نے ایک اپنا ہی بلیو پرنٹ تیار کر رکھا تھا جس پر وہ کوئی سمجھوتہ نہ کرنا چاہتی تھی۔

کالج پہنچتے پہنچتے وہ خاصی آزاد خیال ہو چکی تھی۔ دوستوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ وقت گزارنا، باہر کھانے کھانا، گھر والوں کو نچے دے کر غائب ہو جانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ اکثر سہیلیوں کا کہہ کر بوائے فرینڈوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتی دیکھی جاتی اور پوچھنے پر چھپانے کے بجائے صاف کہہ دیتی کہ "ہاں وہ میرے دوست ہیں، مجھے ان کے ساتھ باہر پھرنا اچھا لگتا ہے۔" ماں باپ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگ جاتے۔ امی سیدھی سادھی گھریلو عورت تھیں۔ بے بس ہو کر خاموش ہو جاتیں مگر مرزا صاحب اسے پھر سمجھانے بیٹھ جاتے۔ کہتے "بیٹا یہ ہماری روایات میں شامل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا کہ لڑکیاں مردوں سے آزادانہ میل جول رکھیں۔" گلشن بھی انہیں پیار سے ہی سمجھا کر کہتی "ابو زمانہ بہت آگے جا رہا ہے۔ اپنی قدامت پسند سوچوں کو کچھ تبدیل کریں۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ میری اپنی سوچ اور اپنے اصول ہیں۔ میں آپ کے گزرے ہوئے کل میں نہیں، اپنے آج میں جینا چاہتی ہوں۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے مت روکیں۔" ایسی باتیں سن کر اس کے دو بھائی اور شادی شدہ بڑی بہن بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگ جاتے۔ وہ آرام سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتی اور اپنے شام کے پروگرام بنانے لگ جاتی۔ مرزا صاحب کوئی مار پیٹ کرنے والے، زبردستی کرنے والے باپ تو تھے نہیں لہٰذا بھیگی بلی بن کر دبک جاتے اور سوچتے "یا اللہ میں نے تو کوئی خاص گناہ بھی نہیں کیے تو یہ کیسی سزا دے رہا ہے مجھ کو؟"

ایک بار کسی ہمسائے نے گلشن کے رات کے وقت چپکے سے کھسک جانے پر مرزا

صاحب سے شکایت کر دی۔

''عقل کرو بیٹی آخر لڑکیوں کی کوئی عزت ہوتی ہے۔'' امی نے رعب جمانے کی کوشش کی۔

''عزت، ہوں..... دراصل ابھی میرے پاس عزت وزت کے لئے ٹائم نہیں ہے۔ یونیورسٹی آف ورجینیا میں میرا سمسٹر شروع ہونے والا ہے اور مجھے اس کے حساب سے ایک ماہ کے اندر اندر وہاں پہنچنا ہے۔ بہت کام کرنے ہیں وہاں پہنچ کر۔ گھر ڈھونڈنا، جاب اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ؟'' گلشن بولتی چلی گئی۔

''کیا مطلب؟'' منجھلے بھائی سے رہا نہیں گیا۔

''میں نے وہاں داخلہ لے لیا ہے بھائی، ویزا بھی آ گیا ہے۔ بس اب تو روانگی کے انتظامات کرنے ہیں۔'' گلشن نے آرام سے جواب دیا۔ بڑے بھیا خاموش رہے۔ انہیں پتہ تھا گلشن کو پڑھائی وڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ مارجن پہ ہی پاس ہوتی رہی تھی۔ یہ سب ہرنی کے بن میں آزاد پھرنے کے بہانے تھے۔ پرندے کے نئی ہواؤں، نئی فضاؤں میں طاقت پرواز آزمانے کے فسانے تھے اور بس۔ کتنی خودسر ہو گئی تھی یہ لڑکی۔ بھیا خوفزدہ ہو گئے۔

''وہاں جا کر کوئی نیا چاند چڑھائے گی یہ۔'' چھوٹے بھیا بول پڑے حالانکہ وہ اس کی لغزشوں پر اکثر خاموش رہتے تھے۔ صبر کے گھونٹ پیتے پیتے انہیں بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔

''ہم تمہیں اکیلی کیسے امریکہ جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔'' ابو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کھانا میز پر پڑا کا پڑا رہ گیا۔

''اجازت دیں نہ دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھیں ابو، امی، بھائی، آپی، آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں۔ کیا میں کچھ زیادہ مانگ رہی ہوں؟ یہ میری زندگی ہے اور اس پر صرف اور صرف میرا حق ہی ہونا چاہئے۔ آئی ایم گوئنگ ٹو یو ایس اے۔ And that's it.'' گلشن سب کو ہکا بکا چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

''افسوس۔ یہ لڑکی تو ہاتھ سے نکل گئی ہے۔'' امی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"یہ سب تمہارے ہی لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔" مرزا صاحب گرجے۔ "ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا لڑکی کو کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔"

"یہ سب آپ دونوں کی ہی لاپرواہیوں اور چشم پوشیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ شروع سے ہی کھینچ کر رکھتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔" منجھلے بھیا غم و غصے سے پھنکارے۔

"خوش قسمت ہے امریکہ چلی جائے گی۔ اچھا ہے زندگی آزادی اور اپنی مرضی سے گزارے گی۔" آپی کے دل میں خواہش اور رشک کا جوار بھاٹا اٹھا اور انہیں شرابور کر کے رہ گیا۔ مگر آپی خاموش رہی۔ جوار بھاٹے کا شور صرف وہی سن سکی تھی۔

"آپ لوگوں نے اتنے سال مجھے پالا پوسا، برداشت کیا۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔" گلشن نے ایئرپورٹ پہ اپنے گھر والوں سے الوداعی کلمات کہے اور ہنستے ہنستے جہاز پر سوار ہونے کے لئے چل دی۔ کتنی عجیب تھی یہ لڑکی۔ اسے کیا کہتے اور کیا کرتے اس کا۔ وہ اسے ایک بھرے ہوئے دل کے ساتھ رخصت کر کے گھر آ گئے مگر ہر بندہ دل میں کچھ کچھ مطمئن بھی تھا۔ اب وہ ان کے سامنے نہیں تھی آنکھ سے اوجھل تھی۔ اچھا برا جو بھی کرے گی کم از کم انہیں اس کا پتہ تو نہیں چل سکے گا۔ امریکہ آزاد لوگوں کا آزاد ملک ہے، وہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا لہٰذا گلشن جیسی لڑکی کا وہاں رہنا ہی ٹھیک تھا۔ اب انہیں کم از کم رشتہ داروں، ہمسایوں، دوستوں کے طعنے اور طنزیں تو برداشت نہیں کرنا پڑیں گی۔

"یا اللہ اس لڑکی کو نیک ہدایت دے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔" امی جان مصلے پہ جھک کر دعائیں مانگنے لگیں اور مرزا صاحب دوبارہ اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کے ساتھ اعتماد سے ملنے ملانے کے خیال سے خوش ہونے لگے۔ یہ وہ اعتماد تھا جو ان کی بیٹی کی عادات و مشغولیات کی وجہ سے کچھ عرصے سے کمزور پڑ گیا تھا۔

گلشن ورجینیا سٹیٹ کے ایک باوقار کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی میں مصروف ہو گئی اور ایک مناسب جاب سے اپنے اخراجات پورے کرنے لگی تو اس کے گھر والے اس سے کچھ بے نیاز سے ہو گئے۔ وہ انہیں فون کر کے بتاتی رہتی کہ وہ وہاں خوش اور سیٹ ہے۔ رہائش کے لئے اس نے اپنے ساتھ ایک روم میٹ کو رکھ لیا تھا جس کی وجہ سے ان دونوں کو کرائے میں سہولت ہو گئی ہے اور تنہائی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا سال گزرتے ہی جب گلشن نے انہیں اپنی گریجویشن پر امریکہ آنے کی دعوت دی تو دونوں ماں باپ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ان کی سر پھری بیٹی کو آخر ماں باپ کی یاد آ ہی گئی تھی جو وہ انہیں بلا رہی تھی۔ ویزا لگتے ہی مرزا صاحب اور ان کی بیگم نے امریکہ کی ٹکٹ کٹائی اور بیٹی سے ملنے اس کے نئے ملک کو روانہ ہو گئے۔

امریکہ پہنچ کر پہلا دن تو تھکاوٹ اترنے میں ہی گزر گیا مگر ذرا ہوش آئی تو ابو جان نے گھر اور بیٹی کے طرز حیات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ گھر بہت سلیقے اور قرینے سے رکھا نظر آ رہا تھا۔ گلشن زیادہ خود اعتماد، خوش اور مطمئن لگ رہی تھی مگر یہ دیکھ کر انہیں کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اسی کی توقع کر رہے تھے۔

''اب گریجویشن تو ہو گئی تمہاری، بس ہمارے ساتھ ہی واپس چلی چلو۔'' اماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''واپس!'' گلشن چونک کر بولی جیسے کسی خواب سے یکدم جاگ گئی ہو۔

''میں وہاں جا کر کیا کروں گی اب؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

''کرنا کیا ہے، بس اب تمہاری شادی کرنا ہے اور کیا؟'' ماں مسکرائی۔

''تمہاری امی نے تو تمہارے لئے ایک دو جگہ رشتے بھی دیکھ رکھے ہیں۔'' ابا جان نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے راز فاش کیا۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں تمہاری امی۔''

''میرے رشتے اور آپ لوگ دیکھ رہے ہیں! کمال ہے، یعنی شادی میری اور پسند آپ کی؟ یہ کیا بات ہوئی؟'' گلشن نے سر کو جھٹک کر نا قابل یقین انداز میں جواب دیا۔

''بیٹا تم امریکہ میں ضرور ہو مگر مت بھولو کہ تمہارا تعلق اس تہذیب سے ہے جہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم تمہارے لئے کوئی اچھا فیصلہ ہی کریں گے نا۔'' ابا جان جز بز ہو کر بولے۔

''مجھے نہیں کرنا شادی وادی۔ بس مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں آپ۔''

''اب تو تمہیں گھر داری کا بھی شوق ہو گیا ہے، میں نے دیکھ لیا ہے۔'' امی مستقل بیٹی کو گرہستن بنانے پہ ڈٹی رہیں۔

"یہ سب کچھ؟" گلشن کھلکھلا کر ہنسی۔ "یہ تو صرف ایک عدد محنتی، نیک، سگھڑ روم میٹ کی وجہ سے ہے۔ میرا اس میں کوئی کمال نہیں۔ آپ تو مجھے جانتے ہیں۔ اب میں اتنی بھی نہیں بدلی۔" گلشن ہنستی چلی گئی۔

"کہاں ہے تمہاری روم میٹ؟ نظر نہیں آ رہی؟" ابا جان نے تجسس سے پوچھا۔

"اسے کچھ دنوں کے لئے دوسرے شہر جانا پڑا ہے۔ آ ہی جائے گی۔" گلشن نے جواب دیا۔ عین کھانے کے وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ گلشن اٹھی۔ دروازے میں لگے پیپ ہول میں سے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم آنٹی، انکل، کیسے ہیں آپ! سفر کیسا گزرا آپ کا؟ بھئی تم ٹھیک سے ان کی خاطر داری کر رہی ہو نا؟" آنے والے نوجوان خوبرو شخص نے مسکرا کر سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

"آپ؟" مرزا صاحب نے سوالیہ نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔

"یعنی تم نے ابھی تک میرا ان سے ذکر ہی نہیں کیا۔ کمال ہے یار۔" وہ مصنوعی غصے سے بولا۔

"ابھی وقت ہی کہاں ملا ہے مجھے۔ امی، ابو یہ احمر ہیں۔ میرے بہت ہی عزیز دوست جنہوں نے امریکہ میں میرے رہنے کے انتظامات کئے، مجھے گائیڈ کیا اور ہر طرح سے میری مدد کی۔"

"اچھا؟ اوہ۔" کہہ کر امی اور ابو خاموش ہو گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ احمر بہت دوستانہ مزاج کا خوش طبع شخص تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے انہیں اپنی خوش گپیوں، امریکہ کے قصے کہانیاں سنا سنا کر ہنسانا شروع کر دیا۔ سچ بات تو یہ تھی وہ احمر کی کمپنی سے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔

"اچھا لڑکا ہے احمر۔" امی نے رات کو سوتے وقت ابا جان سے کہا جس کے جواب میں وہ ایک ہوں کہہ کر چپ ہو گئے۔

صبح اٹھ کر ابا جان نے سوچا کیوں نہ الماری میں اپنے کچھ کپڑے، چیزیں وغیرہ رکھ دیں۔ پہلے سے ٹھنسی ہوئی الماری میں ایک طرف پڑے بڑے سے پلاسٹک بیگ کو ہٹاتے ہوئے ان کی نظر اس میں احتیاط سے پیک شدہ مردانہ کپڑوں پہ پڑنے سے نہ رہ سکی۔ مرزا صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیگ کو اندر سے ٹٹولنا شروع کر دیا اور چند لمحوں میں ایک فریم شدہ تصویر ڈھونڈ لی جو کپڑوں میں چھپائی گئی تھی۔ احمر اور گلشن کسی خوش جوڑے کی طرح ساتھ ساتھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے آنکھ کے اشارے سے بیوی کو پاس بلایا اور اپنی نئی دریافت کی طرف توجہ

دلائی۔ "بس بہت ہوگئی۔ اس لڑکی نے تو حد ہی کر دی ہے یہاں آ کر..... کتنا صبر آزمائے گی ہمارا؟"

مرزا صاحب نے بیوی کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھا جس کے جواب میں بیگم نے آسمان کی طرف دیکھ کر خدا سے دعا مانگنے کو ہاتھ پھیلا دیئے۔

مرزا صاحب سے رہا نہ گیا اور گلشن کو ناشتے کی میز پر ہی کھری کھری سنانا شروع کر دیں۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی ڈانٹ سنتی رہی۔ "ہمارا معاشرہ اور ہمارا مذہب اس طرح کی بے ہودہ بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ لڑکی لڑکا شادی کے بغیر..... اس طرح اکٹھے رہیں۔"

وہ گرجے۔ "لیکن ابو آپ نے ہی تو مجھے ہمیشہ یہ سبق دیا ہے کہ مذہب سچائی اور دیانت کا دوسرا نام ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں اور احمر اکٹھے رہتے ہیں لیکن آپ کو گوارا نہیں ہو رہا کیونکہ آپ ایک منافقت کے مارے ہوئے معاشرے سے آئے ہیں اور سچائی کے بدلے جھوٹ کی حمایت کر رہے ہیں۔ سوری ابو..... یہ معاشرہ ایمانداری کا معاشرہ ہے یہاں کوئی کسی سے جھوٹ نہیں بولتا اور اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ پھر بھی آئی ایم سوری..... میں نے ہمیشہ آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔"

گلشن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو ماں باپ کا پھر سے دل پسیج گیا۔ کیا کرتے وہ اپنی اس الٹی سوچ کی بیٹی کا.....

شام کو پھر حسب معمول احمر آ گیا اور چہک چہک کر ان سے باتیں کرنے لگا۔ گلشن نے محسوس کیا کہ اس کے ماں باپ کا کچھ موڈ خراب ہے۔

"کیا بات ہے انکل آنٹی، لگتا ہے ابھی آپ کی سفر کی تھکن نہیں اتری۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" احمر نے بھی ان کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ..... گلشن کا روم میٹ کون ہے؟" مرزا صاحب نے گلا صاف کر کے اپنی بات کہہ دی۔

"اوہ، آئی سی۔" احمر نے ٹھنڈی سانس بھر کے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"سوری انکل۔ میں جانتا ہوں آپ کو سچ جان کر تکلیف تو ہوئی ہوگی مگر..... دیکھیں انکل..... ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں اور خوش ہیں۔"

"امریکہ میں تو بہت لوگ Living Together کرتے ہیں۔" گلشن نے بھی منہ کر زبان کھولی۔ "آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔"

"لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ آپ دونوں بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

مرزا صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بچ مانیں انکل..... آنٹی، میں تو کب سے اس کے پیچھے پڑا ہوں کہ شادی کر لیتے ہیں..... جب اکٹھے ہی رہنا ہے تو..... مگر..... اسے سمجھائیں انکل۔" احمر ملتجیانہ انداز سے بولا۔

"شادی؟ ہاں یہ تو بہت اچھی بات ہے بلکہ مناسب ترین بات ہے بیٹا۔" گلشن کی امی کے مردہ وجود میں جیسے یکدم جان پڑ گئی۔

"میرا تو سچ پوچھیں فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر یہ احمر جو ہے نا..... بڑا روایتی آدمی ہے اندر سے۔ لگتا ہے مجھے اس کی ضد کے آگے ہاں کرنا ہی پڑے گی۔" گلشن مسکرائی اور چائے کے مگ میں چینی ڈالنے لگی۔

"میں اسے سمجھاتا ہوں کہ جب ہم لوگ ہر طرح سے ایک دوسرے سے کمیٹڈ ہیں تو پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" احمر بولتا چلا گیا۔

"لیکن شادی ایسے کیسے ہو سکتی ہے؟ نہ تیاری، نہ کپڑے، نہ رشتہ دار؟" امی جان دھیمے لہجے میں بولیں۔

"اوہ تمہیں کپڑوں، رشتہ داروں کی پڑی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں ایسے کیسے یہ شادی ہو سکتی ہے؟" مرزا صاحب فرط جذبات سے کھڑے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا؟" احمر حیرانگی سے بولا۔

"میں نے تو سوچا تھا آپ میری شادی کی خبر سے خوش ہوں گے، میری فکر سے آزاد ہو کر پرسکون ہو جائیں گے..... کیا ہوا ابا جان؟" گلشن بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"احمر تم نے ہم سے ہماری بیٹی کا ہاتھ تو مانگا ہی نہیں، ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا، ہم رسم و رواج، رکھ رکھاؤ، روایات والے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں ہر بات اصول اور طریقے سے ہوتی ہے۔" مرزا صاحب کی آواز غصے سے کانپنے لگی۔

"ہاتھ؟" احمر نے حیرانگی سے یوں ان کی طرف دیکھا جیسے انہوں نے کسی غیر اور نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں ان سے کچھ کہہ دیا ہو۔

▼▲▼▲▼▲▼

کالا پربت

نبیل یونیورسٹی چلا تو آیا تھا مگر بوجھل دل سے۔ نہ جانے کیوں؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا دل خوامخواہ اداس کیوں ہو رہا ہے، یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مگر کیا؟ سب کچھ ٹھیک تو تھا۔ صبح نو بجے سے کچھ قبل جب اسے زلزلے کے ایک زوردار جھٹکے نے جگایا تھا تو وہ زیادہ خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ لاہور میں ہلکے ہلکے جھٹکے تو کبھی کبھار آ ہی جاتے ہیں۔ یہ جھٹکا کچھ لمبا ضرور تھا مگر لاہور کے جی داروں کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ریشم بھی ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ وہ کہتی "جب سے تم پڑھنے کے لیے لاہور گئے ہو کافی ڈھیٹ اور لاپرواہ ہو گئے ہو۔ پہلے کی طرح میرا خیال نہیں رکھتے۔ یہ لاہور والے کیا ایسے ہی بے نیاز ہوتے ہیں؟ کیا ان پہ کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟"

اس بات کے جواب میں پہلے تو وہ زور زور سے ہنستا کھلکھلاتا پھر جھوٹ موٹ پنجابی فلموں کے لاپرواہ قسم کے ہیرو بننے کی اداکاری کرتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دینے لگ جاتا تو وہ بھی مذاق اڑاتے ہنسنے لگ جاتی اور وہ مسحور ہو کر اسے دیکھنے لگتا۔ اسے لگتا جیسے وادی کی بہتی ندیوں سے اچانک کوئی نیا چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ ایسا چشمہ جس میں خوابوں کی چاندی گھلی ہوئی ہو اور پانی کی جگہ موتی بہتے ہوں، مچھلیوں کی جگہ جل پریاں رہتی ہوں۔

کلاس سے آ کر نبیل نے خبریں دیکھنے کے لئے ٹی وی لگا لیا۔ خبریں ایسی تھیں کہ دیکھ کر اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ صبح کو معمولی سا محسوس ہونے والا زلزلہ ملک میں شمالی علاقہ

جات میں اتنی بڑی آفت بن کر نازل ہوا تھا اور اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

''یا میرے خدا'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور جلدی جلدی گھر فون ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ کسی کا بھی فون مل نہیں رہا تھا۔ امی، ابو، بہن بھائی، چچا کا خاندان اور پھر ریشم، کوئی اپنا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ آخر سب کہاں چلے گئے تھے؟ نبیل کو پریشانی ہونے لگی۔ ٹی وی پر خبریں سن سن کر اسے ڈر لگنے لگا۔ نیوز کاسٹر بتائے چلے جا رہے تھے کہ بالاکوٹ، مظفرآباد اور ملحقہ علاقوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور شدید جانی نقصان کا بھی اندیشہ ہے۔ نبیل کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ زلزلے کے وقت تو ریشم اپنے سکول پڑھانے کے لئے جا چکی ہو گی۔

نبیل اسلام آباد جانے والی بس میں بیٹھا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ مستقلاً کاٹتا چلا جا رہا تھا اور کسی کا خوبصورت چہرہ پورے چاند کی طرح اس کے خیالوں میں دمک رہا تھا۔ ریشم اور وہ چچازاد اور بچپن سے ایک دوسرے کی منگ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی تھے۔ دونوں نے مستقبل کے حوالے سے خوبصورت خواب دیکھ رکھے تھے جن کے پورے ہونے کا وقت اب زیادہ دور نہیں تھا۔

بچپن میں وہ دونوں ہم جولیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے پہاڑوں اور وادیوں میں دور نکل جاتے۔ کھیل میں بہت مزا آتا کیونکہ چھپنے کے لئے جگہیں بہت تھیں اور وادی کی گود بہت وسیع۔ نبیل اکثر اوقات سب سے پہلے ہی دوستوں کو ڈھونڈ نکالتا اور جیت جاتا۔ دوست حیران ہو جاتے کہ وہ انہیں اتنی مشکل جگہوں سے کیسے ڈھونڈ لیتا تھا۔ وہ ہنستا اور سب ہارنے والوں کو خوب چھیڑتا۔ وہ ڈھونڈ نکالنے میں اتنا ماہر تھا کہ قدموں کی چاپ، پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی سرگوشیوں سے ہی کھوج نکال لیتا کہ اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ سینہ پھلا کر کہتا ''دراصل میرے قبضے میں کوہ قاف کی ایک پری ہے۔ ایک بار وہ مجھے ایک پہاڑی پر بیٹھی روتی ہوئی ملی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو کہنے لگی ''میں گھر سے نکلی تھی سودا سلف لینے، پھر واپسی کا راستہ بھول گئی۔ کاش مجھے کوئی پرستان پہنچا دے۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس کی مدد کی تو وہ ہنسی خوشی اپنے گھر جا پہنچی۔ انعام کے طور پر اس نے مجھے یہ سوپر کان دیئے۔''

''سوپر کان؟'' ریشم اور ساتھی دوست حیرانگی سے پوچھتے۔ ''ہاں بھئی جیسے سوپر مین کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں تو اتنی آسانی سے تم سب کی باتیں، سرگوشیاں سن لیتا ہوں۔'' وہ منہ

بنا بنا کر بولتا جاتا اور ریشم اس کے کان مروڑ کر انہیں گھما گھما کر ٹیسٹ کرنے لگتی۔

وہ بس میں بار بار فون ملائے جا رہا تھا کہ اچانک نہ جانے کیسے اس کے بھائی صغیر نے اپنا فون اٹھالیا۔

''صغیر! شکر ہے خدا کا تم نے فون تو اٹھایا، کہاں ہو تم؟ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟'' نبیل نے بے صبری سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔

''کوئی بھی خیریت سے نہیں ہے بھائی جان۔ سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں بچا۔'' صغیر نے ہچکیوں کے درمیان تیز تیز انداز میں جواب دیا۔

''میں تو اتفاقاً باہر گیا ہوا تھا۔ ساتھ والے گاؤں، اس لئے میری بچت ہو گئی ورنہ.....''

صغیر نے بات ادھوری چھوڑ دی اور خود سسکیاں لینے لگا۔

نبیل کو لگا اس کے کلیجے میں جیسے کسی نے خنجر بھونک دیا ہو۔

''اور ریشم؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''سب سکولوں کی چھتیں گر چکی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ان کا۔'' شکیل نے ہچکیوں کے درمیان جواب دیا اور پھر فون کٹ گیا۔

شکیل کو ایسا لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لئے بڑی احتیاط سے قدم جماتا اوپر کو جا رہا ہو اور رسی یکدم ہاتھ سے چھٹ گئی ہو۔ وہ پاتال میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔

کیا وہ اب کبھی ریشم کو، اپنی زندگی کو، دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا؟ اس سوال نے اس کے ذہن میں دھماکے کرنے شروع کر دیے اور آنسو اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے لگے۔

''اے خدا مہربانی کر۔ اے میرے رب، میرے عزیزوں، میرے پیاروں کی خیر ہو۔'' اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔

نبیل جب بسیں بدلتا، جاگتا، سوتا منزلیں طے کرتا بالاکوٹ پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ اس کے گھر جانے کا کوئی بھی راستہ سلامت نہ رہا تھا۔ مددگار ٹیموں کے دستوں نے خیمے گاڑ لیے تھے اور ان میں روشنیاں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر کہاں تھا؟ دوسرے گھر کہاں تھے؟ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ ٹوٹی ہوئی، گری ہوئی عمارتوں، دل چیر دینے والے سناٹوں کا شہر تھا اور بس۔ ہر طرف ملبے کے تودے، بچ جانے والوں کے پریشان چہرے اور خوفزدہ آنکھیں تھیں جو وقفے

وقفے سے آنے والے بعد کے جھٹکوں سے مزید سہم جاتی تھیں۔ بھائی اسے اپنے ماں باپ کے گھر کے آگے بت بنا کھڑا مل گیا۔ نبیل کو دیکھتے ہی وہ رو دیا اور اس کے ساتھ مل کر ملبہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اینٹ، سیمنٹ، سریا، انسانوں کے نرم و نازک گوشت پوست سے بنے زندہ جسموں کو زندگی کی قید سے آزاد کر چکا تھا۔ وہ دونوں بت بن کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

کیا یہ وہی گلپوش حسین وادی تھی جہاں زندگی ایک شہزادی کی مانند ناچتی مسکراتی، خوش رنگ پھول چنتی، سر پہ خوشبوؤں کے تاج سجاتی، باؤلی ندیا کی طرح ہر دم اٹھلاتی نظر آتی تھی؟ شریر جھرنے ہنستے گاتے دور نکل جایا کرتے تھے اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی تھی؟ پھر کیا ہوا کہ شہزادی کا راج پاٹ ایک پل میں ہی الٹ گیا اور موت وادی کی رانی بن بیٹھی۔ کالا چوغہ پہنے بد ہیبت موت اپنے کارندوں کو حکم دیتی کہ سب کچھ مٹا دو، روند ڈالو، مار ڈالو، ختم کر دو۔ زندگی کا ہر نشان مٹا دو، تباہ کر دو، سب کچھ برباد کر دو۔

''اے خدا ہمیں معاف کر دے۔'' نبیل سسکنے لگا۔ صغیر نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ وہ سوچتا چلا گیا اسے خیال آیا شاید انسان بہت جلدی میں رہتے ہیں۔ جلدی ہی جلدی۔ سرعت ہی سرعت۔ شاید وہ ہر وقت کسی خود فریبی میں رہتے ہیں، اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ بادشاہوں کی طرح طاقت کے زعم کا کلف لگائے اکڑے اکڑے پھر رہے تھے کہ اس سب سے برتر طاقت نے ایک ہلکے سے ٹھوکے سے ہلا کر کچھ یاد کروانے کی کوشش کی اور پھر یاد دلایا کہ کوئی خالق و مالک بھی ہے۔ جس کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ جان و مال، زمین و آسمان، پوری کائنات۔

اس نے یاد دلایا کہ ایک خدا بھی ہے جسے انسان اکثر کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں اور نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ اسی کی ڈانٹ تھی، اسی کا حکم تھا کہ ''میں ہی ہوں فنا اور بقا۔ میں ہی ہوں سب سے بڑی حقیقت، باقی سب کچھ مایا ہے۔ کیا خدا نے برا منا لیا تھا۔''

جو اس کے غصے سے بستیاں اجڑ گئیں۔ راستے بند ہو گئے، خوشبوؤں کے سانس گھٹ گئے اور خدا یاد آیا جو اول و آخر ہے۔ سب سے اہم رشتہ دار ہے۔

نبیل کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ دیوانہ وار ریشم کے سکول کی جانب بھاگنے لگا جو وہاں سے اتنا دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔ عمارت کے

درو دیوار منہدم ہو چکے تھے اور چاروں طرف ملبے کے سوا کچھ نظر نہیں آ تا تھا۔ سکول کہاں وہاں اب ویرانی اور وحشت تھی، خوف اور دہشت تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔

''تم کیا لینے آئے ہو یہاں؟ کچھ بھی تو نہیں بچا؟'' جڑ سے اکھڑے ایک اداس درخت نے اس سے سرگوشی کی۔ بجیل نے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور زمین سے باہر نکلی ہوئی جڑوں کو پیار سے چھونے لگا۔

ریشم اس وقت کہاں ہوگی؟ اس نے کرب سے سوچا۔ درخت کی جڑوں کو چھو کر اسے لگا جیسے اس نے ریشم کے آنچل کو چھو لیا ہو۔ ''ریشم ریشم۔'' وہ منہ ہی منہ میں اس کا نام جاپنے لگا۔ کچھ زخمی مائیں اور باپ اپنے اپنے بچوں کو ملبے سے ڈھونڈ نکالنے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ زور زور سے پکار رہے تھے۔ کس قدر روزنی ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے وہ نازک پھول۔ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ وہیں سیمنٹ کی ایک سل کے اوپر لیٹ گیا مگر پھر یکدم کسی خیال کے آتے ہی اچانک وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا پتہ اس سل کے نیچے کوئی زندہ ہو؟ کیا پتہ ریشم ہی ہو۔ میں کم از کم اپنے وجود کا بوجھ تو اس پہ نہ پھینکوں! اسے مزید مشکل میں نہ ڈالوں۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور گھاس میں لیٹ گیا جہاں سے آسمان پہ کھلے چمکدار ستاروں کی تازہ فصل صاف دکھائی دے رہی تھی۔

یہ چاند اور تارے آج اتنے روشن اور دمکتے کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کیا انہیں خبر نہیں کہ زمین پہ قیامت آ چکی ہے؟ وقت تھم چکا ہے اور موت اپنا کالا چوغہ پہنے ہر طرف دندناتی پھر رہی ہے؟ چاند ستاروں کی چمک دمک اس وقت اسے بہت بے معنی اور بے جا محسوس ہونے لگی۔ اس نے کچھ خفا ہو کر ان سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر کے پھر سے اس ناقابل یقین سانحے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جس نے ایک ہی جھپٹے میں اس سے اس کے اتنے پیارے لوگ چھین لیے تھے۔

''سو جاؤ۔'' ایک ننھے معصوم ستارے نے اس سے سرگوشی کی تو وہ پوری طاقت سے چیخ اٹھا۔ ''نہیں'' ''میں بھلا کیسے سو سکتا ہوں؟ مجھے چین کیسے آ سکتا ہے جبکہ میرے پیارے زمین کے اندر دبے ہوئے ہیں۔'' ''ریشم۔ ریشم بھی تو نیچے ہی ہوگی۔ مجھے ان کی مدد کرنا ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہے۔'' وہ سوچتے سوچتے یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

سکول کی عمارت آخری مغل فرمانروا کی تقدیر کی طرح سرنگوں تھی۔ ہر طرف حسرت و یاس کا سماں تھا۔ موت اپنے بال کھولے، دانت نکوسے وحشت بھری دھمالیں ڈال رہی تھی۔ سکول کے طالب علموں کے متعدد بستے، پنسلیں، ربڑ، شاپنر، کاغذ ادھر ادھر بکھرے نظر آرہے تھے۔ کئی تو ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جنہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور سلامت تھے۔ کئی ناشتہ دان الٹے پڑے تھے جن میں ان کی ماؤں نے انہیں آدھی چھٹی کے وقت کھانے کو کچھ نہ کچھ دیا ہوا تھا۔ لفافوں میں بند پراٹھے، کباب، انڈے، بسکٹ، توس مکھن اور نہ جانے کیا کیا۔

چند خوفزدہ اور بھوکی بلیاں اور کتے کھانے کی خوشبو سونگھ کر ان لفافوں کی طرف بڑھے اور الٹنے پلٹنے لگ گئے۔ یہ دیکھ کر نبیل کے دل میں اچانک ایک نیا اور خوفناک خیال آیا۔ کیا خبر کل کو زلزلے کے مارے ہوئے مردہ اور نیم مردہ زخمی لوگوں کو بھی یہ کتے بلے سونگھنے لگیں اور.....اور..... یہ بھیانک خیال اسے ڈرانے لگا اور اس نے اٹھ کر پتھر اٹھا کر کتوں، بلیوں کو بھگانے کی کوشش میں الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے۔

ایک شاپر بیگ سے جھانکتا ہوا ناشتہ دیکھ کر وہ خود کو ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ بستے پہ بچے کا نام ''عبدالقیوم'' لکھا ہوا تھا جسے پڑھتے ہی اس کے کلیجے میں پھانس سی چبھی اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ عبدالقیوم کی ماں نے لنچ ٹائم کے لئے اپنے پیارے لاڈلے بیٹے کو کھانے کے لئے پراٹھے، انڈے کے ساتھ ساتھ آم کے مربے سے ایک میٹھی قاش بھی دی تھی جس میں سے الائچی کی میٹھی میٹھی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ نبیل کو اسی لمحے اپنی امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پراٹھے یاد آ گئے۔ اسے لگا جیسے وہ اس وقت نبیل نہیں، چوتھی جماعت میں پڑھنے والا چھوٹا سا عبدالقیوم ہو اور یہ ناشتہ اس کی اپنی امی نے اس کے لئے بھیجا ہو۔ اسے یکدم معدے میں گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی تو یاد آیا کہ اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ مائیں کتنی اچھی اور کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ عبدالقیوم کے حصے کا مزے دار پراٹھا اور انڈہ کھاتے ہوئے اسے یہی خیال آ رہا تھا۔ بڑے زلزلے کے بعد بھی جھٹکے رہے تھے۔ وہ گھبرا کر تھوڑی دیر بعد غور سے ادھر ادھر دیکھتا اور ساکت ہو کر پوری توجہ سے ملبے کی طرف نظر دوڑاتا کہ کیا پتہ زمین کہیں سے دوبارہ شق ہو گئی ہو اور ریشم باہر نکل آئی ہو۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ گھاس پہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے زمین میں سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں آرہی ہوں۔ اس نے کچھ دیر تک انہیں سنا اور پھر یقین کر لینے کے بعد اپنے کان دوبارہ ملبے پہ لگا کر غور سے سننے لگا۔ یہ کیا؟ اس نے حیرانی سے سوچا۔ آوازیں واقعی زمین کے نیچے سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو بچے آپس میں بات کر رہے ہوں۔ نہ جانے زمین کی کس تہہ میں چھپے ہوئے تھے وہ۔

''کون ہے؟'' کون بول رہا ہے؟'' نبیل پوری طاقت سے چیخا، لیکن شاید اوپر سے آواز نیچے کو نہیں جا رہی تھی کیونکہ اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ یونہی خاموشی چھائی رہی۔

''کہیں یہ میرا وہم نہ ہو۔''

اس نے اپنے کان پھر زمین پر لگا دیئے۔ کیا واقعی کوئی زندہ تھا؟ یا کیا خرابے میں کچھ لوگ نیچے دبے سانس لے رہے ہوں؟ اس کا تو مطلب ہے شاید ریشم بھی..... ''اس امید نے اس کے وجود میں دیئے سے روشن کر دیئے اور وہ ریسکیو ورکرز کی تلاش میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ شہر میں کدالیں کم تھیں اور کھدائی کا کام بہت زیادہ۔ ابھی تک بہت زیادہ امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ بھی نہ سکی تھیں اس لئے نبیل کے بے حد اصرار اور منت سماجت کرنے کے باوجود اسے مدد حاصل کرنے میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ مشکل کھدائی ہاتھوں سے نہیں بلکہ مشینوں، کرینوں سے ہونے والی تھی اور ایسی کسی چیز کا وہاں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ بعد میں ٹی وی پہ خبریں دیکھنے کے بعد علم ہوا کہ ہیوی ڈیوٹی کرینیں اور امدادی مشینیں تو حکمرانوں کے شہر میں گر جانے والی ایک کروڑ پتیوں کی رہائشی بلڈنگ کا ملبہ اٹھانے کا کام کر رہی تھیں، وہ بھلا چھوٹے گاؤں اور گراؤں کو کیسے بھجوائی جا سکتی تھیں۔

دو دن کی مستقل محنت، منت سماجت، اصرار کے بعد نبیل کے کہنے پر امدادی کارکنوں نے واقعی دو بچوں کو نیم مردہ حالت میں ملبے کی قبر سے باہر نکال لیا۔ فرطِ مسرت سے نبیل کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ اس روز کے بعد سے نبیل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حوصلہ نہیں ہارے گا۔ وہ ہر رات خاموشی سے ملبے کی ڈھیریوں پہ کان لگا دیتا اور آوازیں سننے کی کوشش کرتا۔ جہاں سے بھی اسے کسی سرسراہٹ، کسی سرگوشی کا گمان ہوتا وہ وہاں چاک سے نشان لگا دیتا اور صبح ہوتے ہی ورکرز کو

مجبور کرتا کہ وہ وہاں کھدائی کریں۔ بڑی مشکلوں سے وہ اس کی بات مانتے۔ کبھی کبھار تو وہاں سے کچھ بھی نہ نکلتا اور کبھی کبھار کوئی ایک آدھ بچہ کچھ سانسوں والا بچہ واقعی نکل آتا تو سب خوش ہو جاتے۔ ٹی وی والے رپورٹروں نے اسے "سرگوشیاں سننے والا" شخص قرار دے کر اس کے بارے میں ایک دلچسپ سی سٹوری بھی تیار کر لی تھی جسے وہ بار بار ٹی وی پر دکھا کر لوگوں کو حیران کر رہے تھے۔ کئی اخبار والے اس سے انٹرویو لینے کے لئے اس سے ملنے کی کوشش کر رہے تھے مگر نبیل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ اسے کسی طرح سے ریشم کا پتہ مل جائے، کسی طرح وہ ریشم تک پہنچ سکے اور بس۔ اسے ڈھنگ سے سوئے ہوئے تقریباً چار راتیں ہو چکی تھیں۔ نیند کے جھونکے آتے تو وہ ان سے لڑتا اور چند ہی لمحوں بعد بیدار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔

وادی میں انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کا تعفن پھیل چکا تھا مگر نبیل وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ "اتنے دن ہو گئے بھائی جان، اب ہمیں امید نہیں رکھنا چاہئے۔" ایک روز اس کے چھوٹے بھائی صغیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر نبیل کی خاموشی نے اُسے بتا دیا کہ نبیل ابھی حوصلہ ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اب بھی کسی معجزے کی توقع اور کسی ان ہونی کا انتظار تھا۔

"اگر ایک فیصد بھی کسی کے زندہ بچ جانے کے چانس ہوں تو ہمیں انہیں یہ چانس تو دینا چاہئے نا۔ میں ریشم کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا صغیر۔" اس نے متوحش آنکھوں سے بھائی کو دیکھا تو وہ چپ ہو گیا اور بھائی کی ذہنی صحت اور دل کے سکون کے لئے دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔

وہ زلزلے کا پانچواں روز تھا۔ دوپہر، شام میں ڈھل رہی تھی جب سکول کے ملبے پہ بے سبب، بے مقصد گھومتے پھرتے، پل بھر کو رکتے، سانس لیتے چلتے ہوئے نبیل تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ صبح سے اس نے کسی کی کوئی آہ، ہچکی، پکار کچھ بھی نہ سنا تھا۔ بس ایک اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی جس کی آواز سے پوری وادی گونج رہی تھی۔ اسے ریشم بے طرح یاد آ رہی تھی۔ "کاش پریوں کی کہانیوں کی طرح زمین کے کسی کونے کھدرے سے ریشم کی اوڑھنی کا کوئی حصہ ہی دکھائی دے جائے۔ کوہ قاف کی وادی کی ایک خوبصورت پری راستہ بھول کر کہیں پاتال میں جا چھپی تھی اور وہ اس کی مدد کرنے کو بے چین تھا۔ اسے راستہ دکھانا چاہتا تھا مگر شاید وہ کہیں بہت دور چلی گئی تھی جو ابھی تک اسے اس کا کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ریشم تو اس وادی کی بیٹی تھی تو شاید دھرتی

ماں اسے پرسکون نیند دینے کے لئے اپنی آغوش میں لوریاں دے رہی ہو۔شاید،شاید۔

''نہیں نہیں۔'' اس نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا اور عمارت کے ملبے کے اردگرد دیوانہ وار چکر لگانے شروع کر دیئے اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ملبے کو کھنگالتے پھرولتے اس کے ہاتھوں میں کلاس روم کے باہر لگی ہوئی ایک تختی آ گئی جس پر جماعت چہارم بی لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔''یا خدا۔ نبیل کا سر گھوم گیا۔ یہ تو ریشم کا کلاس روم تھا۔ اس نے فوراً گھٹنوں کے بل جھک کر ملبے کی کئی تہوں کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ اٹھتا، کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا۔''ریشم ریشم'' اس نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے آوازیں دینا شروع کر دیں، اسے لگا جواباً کہیں دور سے کسی نیچی جگہ سے جیسے ہلکی سی چہچہاہٹ کی آواز آ رہی ہو۔'' کہیں یہ میرا وہم تو نہیں۔'' اس نے زور زور سے اپنے اردگرد پڑی لوہے کی چیزوں کو سیمنٹ کی سلوں پر مارنا شروع کر دیا اور پھر جواب سننے کے لئے کان زمین سے لگا دیئے۔ جواب میں واقعی ہلکی سی آواز آ رہی تھی جو ہوا کی سرگوشی سے زیادہ محسوس نہ ہوتی تھی۔ نبیل دیوانوں کی طرح زمین کھودنے لگا۔ اس کے ناخن زخمی ہو رہے تھے۔ کہنیاں چھل رہی تھیں مگر اس پہ تو جیسے کوئی جنون سوار تھا۔ ریشم زندہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ رواں رواں پکار رہا تھا۔ اسے زمین کھودتے دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی اپنے پھاوڑے اٹھائے اس کی مدد کو آ گئے اور گھنٹے بھر کی جان توڑ کوششوں کے بعد ایک نوجوان لڑکی اور ایک بچے کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ نبیل کو خدا پہ بے اختیار پیار آ گیا اور وہ زمین پہ جھک کر سجدے دینے لگا۔ ریشم اور بچہ نیم مردہ، مرجھائے ہوئے پھولوں، ٹوٹی پھوٹی ڈالیوں کی طرح سٹریچروں پہ ڈال کر فوراً ہسپتال لے جائے گئے اور ٹی وی والوں نے ایک بار پھر نبیل کے بارے میں نئی رپورٹ تیار کرنا شروع کر دی کہ کیسے ایک شخص نے تہہ زمین سے آوازیں بلکہ سرگوشیاں سن کر قیمتی جانیں بچالی ہیں۔

''ریشم۔ میری جان، میری زندگی میں جانتا تھا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی تھیں میری دنیا میں واپس لوٹ آنے کا شکریہ'' اس نے کئی دن ملبے کے نیچے دبی رہنے والی اپنی خوبصورت محبت کے کانوں میں سرگوشیاں کر کے رس انڈیلا اور اس کا زخمی ہاتھ دھیرے سے چھو کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جواب میں ریشم نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرا کر دھیرے سے بند کر لیں۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا ان آنکھوں میں۔ نبیل کا خون

سیروں کے حساب سے بڑھ گیا۔ اسے اپنی خوش بختی پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ ماں، باپ، بہن بھائیوں کے بعد اب صغیر اور ریشم ہی اس کی کل کائنات تھے۔ اس لئے وہ دل و جان سے ان کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ کئی زخمیوں کی طرح ریشم کو بھی اسلام آباد کے ایک بڑے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا جہاں اس کی دن رات نگہداشت ہونے لگی۔ ہسپتال میں کمرے کم تھے اور مریض زیادہ اس لئے بہت سے زخمیوں کو برآمدوں اور گھاس کے قطعوں پر ہی لٹانا پڑ رہا تھا مگر ایسے وقت میں تو زندہ بچ جانا ہی بہت تھا۔ ہر طرف نفسانفسی اور افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی اپنے کھوئے ہوئے رشتہ داروں کی آس میں دروازوں کی طرف دیکھتا تھا اور جلد سے جلد ٹھیک ہو کر وہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مگر اب تو واپس جانے کے لئے ان کے پاس گھر بھی نہیں تھے۔ نہ جانے کہاں جانا تھا ان کو؟ انہیں پتہ نہیں تھا۔

ریشم کے جسم پر چوٹیں تو بہت آئی تھیں مگر ہڈیاں بچی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ پندرہ بیس دنوں میں ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر جا سکتی ہے۔ گھر اسے بھی پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ نبیل نے ابھی اس بارے میں کچھ سوچا نہ تھا۔ سوچا تھا تو بس یہی کہ ریشم کیسے جلد اچھی ہو جائے۔ اسے مزید کوئی تکلیف نہ پہنچے، سکون ملے، آرام نصیب ہو اور ہمیشہ چین سے رہے۔

رات بھر وہ مریضوں کے کراہنے کی آوازیں سنتا تھا۔ اپنے پیارے ماں، باپ، بہن بھائی کا تصور اسے ستانے لگتا تو نیند اس سے کہیں دور چلی جاتی۔ وہ جلتی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر سکون پانے کی کوشش کرتا مگر اسے کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ ریشم کی ہلکی سی ''سی'' اور ''اف'' پر لپک کر اس کے کمرے میں جا پہنچتا اور اسے دیکھ کر تسلی کر لینے کے بعد باہر آ کر پھر سے لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ دن میں بھی نبیل اس کے قریب ہی منڈلاتا رہتا۔ کبھی اسے اس کی پسند کا برگر اور بوتل لا دیتا تو کبھی چاکلیٹوں کے پیکٹ اور پھول۔ اس کا بالکل بچوں کی طرح خیال رکھتا۔ اس کی اتنی توجہ اور محبت کی وجہ سے ریشم ذہنی طور پر توانا محسوس کرنے لگی تھی اور اس کی جسمانی صحت بھی روز بروز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

''اب میں بہت بہتر ہوں نبیل، تم رات کو ہوسٹل جا کر آرام سے سو لیا کرو، خوامخواہ یہاں بے آرام ہوتے ہو۔'' ایک رات ریشم نے اسے پیار سے کمرے سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اکیلی چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں ریشم۔ اب ہم دونوں کا اس دنیا میں ایک

دوسرے کے بغیر آخر ہے ہی کون؟'' نبیل نے اسے ہولے سے تھپک کر تسلی دی۔

''تمہارا نیند سے برا حال ہو جاتا ہے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پہلے بھی تم کتنا کچھ برداشت کر چکے ہو۔ پلیز جا کر سو جاؤ تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

''تم سے دور جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا کروں؟'' نبیل مسخری کرتے ہوئے الٹے سیدھے منہ بنانے لگا۔

''دیکھو یہاں ہسپتال میں اتنے لوگ ہیں میرا خیال رکھنے والے۔ ڈاکٹرز، نرسیں، سوشل ورکرز، والنٹیئر، پھر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں بھی اب سونا چاہتی ہوں۔ اوکے گڈ نائٹ۔'' ریشم نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا تو وہ بادل ناخواستہ اٹھا اور اس کا ماتھا چوم کر باہر کو چلا آیا جہاں اس کا زمینی بستر حسب معمول اس کا منتظر تھا۔ آج واقعی اسے بھی بہت زور کی نیند آ رہی تھی۔ اس لئے تکیہ پہ سر رکھتے ہی وہ بے خبر ہو کر سو گیا اور ہسپتال کے کاریڈور میں جلنے والی بتیاں سٹاف نے قدرے دھیمی کر دیں۔

گہری نیند میں ڈوبی ریشم کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کے زخمی بدن میں درد سا اٹھ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کوئی اس کے بالکل قریب کھڑا اس کے بدن کو ٹٹول رہا ہے۔ ''یہ کیا؟'' وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پیچھے کو ہٹی اتنی پیچھے کہ اسے لگا وہ بستر سے نیچے ہی گر جائے گی مگر کسی نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ایک انجانے سے خوف سے ریشم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں جیسے گھٹ سی گئی، باہر نہ آئی۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا، شاید بجلی چلی گئی تھی۔ گہرے اندھیرے کے باوجود ریشم نے ڈاکٹر احسن کو اس کی بڑی بڑی مونچھوں کی چبھن اور کلون کی مخصوص مہک کی وجہ سے پہچان لیا۔ زخم لگانے والا یہ مسیحا تو دن میں کئی بار اسے وحشت بھری تعریفی نظروں سے گھور کر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا حال چال پوچھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ ریشم سے یہ سوال کرتی نظر آتیں ''اے خوبصورت پری تو ہسپتال کے اس بے رنگ دکھ بھرے وارڈ میں کیسے؟ تجھے تو کسی عالیشان محل کے مخملیں بستر پہ ہونا چاہئے تھا۔'' ریشم کی قوت مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ شاید یہ اس ٹیکے کا بھی نتیجہ تھا جو خوفناک جن نے اس کے بازو میں اچانک ٹھونک کر اسے بے بس سا کر دیا تھا۔

''نبیل ، ہیلپ ، ہیلپ ، بچاؤ۔'' ریشم کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں۔ ''بچاؤ نبیل'' اس کے لبوں پہ سسکی ابھری جس نے چند ہی لمحوں میں اس کے لبوں پہ دم توڑ دیا۔

ریشم کو ہوش آیا تو صبح کا اجالا کمرے میں پھیل چکا تھا۔ نرس سفید براق لباس میں اس کے پاس کھڑی اس کا بلڈ پریشر لینے کی کوشش کر رہی تھی اور نبیل ناشتہ کے لئے چائے کا گرم کپ ہاتھ میں تھامے دو سنکے ہوئے سلائس اور مکھن جیم کی چھوٹی سی طشت لئے اس کے قریب کھڑا پیار سے اس کو تکے جا رہا تھا۔

''آج بہت سوئیں تم؟'' نبیل نے خوش دلی سے کہا۔

''رات تم کہاں چلے گئے تھے نبیل۔ میں اتنا چیخی، تم اندر کیوں نہیں آئے؟'' ریشم نبیل پر برسنے لگی۔

''اوہو بھئی۔ ٹیک اٹ ایزی یار، اتنا غصہ کیوں؟ بارہ بجے تک تو میں تمہارے پاس ہی تھا یاد نہیں؟ پھر جب لائٹ چلی گئی تو میں باہر آ گیا۔'' نبیل نے چائے کا گرم مگ اس کے آگے کر دیا۔

''ڈر گئی ہوں گی۔ اتنے بڑے زلزلے سے گزری ہیں نارمل ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا نہ۔'' نرس نے نبیل کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا اور خود اپنا سامان اٹھا کر دوسرے مریضوں کی طرف چل دی۔

''آہستہ آہستہ سب ڈر دور ہو جائے گا..... تم فکر نہ کرو'' نبیل نرمی سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

''مگر تم میری چیخیں سن کر اندر کیوں نہیں آئے نبیل؟ تم تو پتھروں سے، سیمنٹ کی سلوں سے میری سرگوشیاں سن لیتے تھے..... تم نے میری آوازیں نہیں سنیں کیا؟''

This is not fair.

ریشم مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے پلنگ کی آہنی اطراف پہ مارنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے دورہ سا پڑ گیا۔

وہ دیوانگی سے اپنے بال نوچنے لگی اور آگے بڑھ کر نبیل کا گریبان پکڑ لیا۔

''سوری یار مجھے کیا پتہ تھا تم اتنا ڈر جاؤ گی، لیکن تم ہی نے تو مجھے کل رات دھکے دے کر

سونے کے لئے بھیجا تھا۔ تو بس میں سو گیا، غلطی ہو گئی جان..... اب کبھی نہیں سوؤں گا۔'' اس نے لاڈ سے اپنے کان پکڑ لئے اور مسخری کرنے لگا۔

ریشم کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا جو اس نے فوراً ہی پونچھ ڈالا۔

''تمہیں سب کچھ یاد آ گیا ہوگا نا..... آئی انڈرسٹینڈ۔'' نبیل سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں..... زلزلہ.....'' ریشم آہستہ سے بولی۔ ''زلزلہ آیا تھا''

''اچھا چھوڑو یہ یادواس باتیں اور اب اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور ہم اپنے گھر چلیں..... میں نے کچھ پلاننگ کی ہے۔'' نبیل نے محبت سے اس کے منہ میں ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہا۔ ریشم کے دل میں پھانس سی چبھی۔

''گھر؟'' پری نے حیرت سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور لمحہ بھر کے لئے کھوسی گئی۔ اسے لگا اس کی روح اچانک بہت میلی ہو گئی ہو اور وہ اب ساری دنیا میں تنہا رہ جانے والا واحد انسان ہو۔

پری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پرستان جانے والی سڑک کو دیکھا۔ گھر کتنا دور اور اس تک پہنچنا کتنا مشکل تھا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ بھول بھلیوں کا ایک وسیع جنگل اس کے سامنے بچھا تھا۔ دشوار گزار راستوں میں گہری کھائیاں اور اندھی گھاٹیاں تھیں۔ ایک متعفن دلدل میں اس کے ٹوٹے ہوئے پر گرے ہوئے تھے جن میں چبھے کانچ کے ٹکڑوں سے سرخ لہو قطرہ قطرہ رس رہا تھا اور ایک بہت بڑا پر ہیبت کالا پربت اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

کولمبس کا سفینہ

مہمانوں کے آنے سے پہلے فضیلہ نے اپنے بیک یارڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نفاست سے کاٹی ہوئی ہری ہری گھاس، ٹراپیکل پھولوں والے سرامک کے نمائشی گملے، لان کے ایک طرف نیلے نگینے کی طرح چمکتا ہوا بڑا سا سوئمنگ پول اور اس میں تیرتے صاف پانی سے اٹھتی کلورین کی مہک، اطراف میں بچھی پکنک ٹیبلو پر ہر طرح کا سامان خورد و نوش۔

''بڑی گرینڈ پارٹی لگ رہی ہے۔ فیزی!'' فضیلہ کے شوہر طارق احمد نے پارٹی کی تیاریاں دیکھ کر اپنی بیوی کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

''بس دیکھ لیں تاری، آپ کو تو پتہ ہی ہے آپ کی بیٹر ہاف کی پارٹیاں کتنی سپیشل ہوتی ہیں۔ مہینوں اپ سٹیٹ نیو یارک کی پاکستانی کیمونٹی میں چرچے ہوتے رہیں گے ہمارے۔'' فضیلہ اترا کر بولی اور قریب جا کر میزوں کو چیک کرنے لگی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ ہر میز پر سفید میز پوش بچھا تھا جس پر بڑی اعلیٰ کوالٹی کی ایسی خوبصورت ڈسپوز ایبل پلیٹیں اور گلاس رکھے تھے جو دور سے بالکل اصلی چائنا کے لگتے تھے۔ باربی کیو انگیٹھیاں پہلے ہی جلا دی گئی تھیں جن پر سنکتے ہوئے سیخ کباب، چکن پیس اور یو ایس ڈی اے گریڈ ون کے بیف سٹیک کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

''یار فیزی! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔'' طارق زور زور سے ہنسنے لگا۔

"پلیز تاری، ابھی سے ٹپسی ہونے لگے تو آگے جا کر کیا ہوگا۔ ابھی تو پوری شام پڑی ہے....." فیزی نے خود سے چپکتے ہوئے طارق کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کا ڈرنک چھین لیا اور خود پی گئی۔

"یو آر اے ڈیول" طارق نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا اور دونوں ہنس پڑے۔ ان کی نظریں اپنے ملین ڈالر ہاؤس پر پڑیں اور مسرت و اطمینان سے بھر گئیں۔ اللہ نے انہیں کتنا نوازا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور آپس میں محبت۔ ایک ہونہار، فرمانبردار پیارا سا بیٹا اور اس کی آئندہ زندگی کے خوشگوار خواب۔ اور انہیں کیا چاہئے تھا؟ آج وہ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے بیٹے عمران نے اپنے ہائی سکول سے آنرز سٹوڈنٹ اعزاز کے ساتھ گریجویشن کیا تھا اور سپورٹس میں بھی ڈسٹنکشن (Distinction) حاصل کی تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ ساری کیمونٹی والے عمران کو کامیابی کی راہوں پر گامزن ہونے پر اپنی نیک تمناؤں سے نوازیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوں، ہنسیں بولیں، ہلا گلا کریں کیونکہ زندگی کی کامیابیوں کو اپنے دوستوں سے شیئر کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

عمران کو کاؤنٹی کے سکولوں کے مابین مقابلوں میں بھیجا جاتا تھا، جہاں سے وہ ہمیشہ ٹرافیاں جیت کر لاتا اور اپنے سکول اور ٹاؤن کا نام روشن کرتا۔ مقامی اخبارات میں اس سے متعلق خبریں اور تصاویر چھپتیں اور سب سے شاباش ملتی۔ طارق اور فضیلہ کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ بیٹے کو سو سو دعائیں دیتے۔

امریکہ میں ہر طرح سے کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود فضیلہ اور طارق احمد کے دلوں میں وطن کی محبت زندہ تھی۔ وہ باقاعدگی سے پاکستان جاتے اور کئی اداروں اور این جی اوز کو غریبوں کی مدد کرنے کے لیے موٹے موٹے چیک دیتے رہتے۔ طارق اپنے بیٹے عمران کو پاکستان کے بارے میں بتاتے اور یاد دلاتے کہ وہ بنیادی طور پر ایک پاکستانی امریکن بچہ ہے، اسے اپنی اصلیت، شناخت اور حقیقت کو نہیں بھولنا چاہئے۔

"جو لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، ان کی آئندہ نسلیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں بیٹا۔" وہ کبھی کبھار عمران کو ایک کہانی سناتے اور کہتے "سنو عمران! امریکہ دریافت کرنے کے بعد جب کولمبس اپنا سفینہ لے کر وطن واپس لوٹا تو اس کے عملے میں شامل ایک قیدی عورت دوڑ کر ساحل پر

اتری اور بے تابانہ اپنی جنم بھومی کو بوسے دینے لگی۔ وطن کی محبت ایسا ہی طاقتور جذبہ ہوتا ہے بیٹا۔ وہ عورت میری آئیڈیل ہے اور میرے خیالوں میں بستی ہے۔ ہمیں اپنی اصل کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے عمران بیٹا۔"

عمران اپنے ڈیڈی کی باتیں سن کر مسکراتا اور انہیں ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کرتا۔

طارق کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر پریوں کے ملبوس جیسے رنگوں والے خوبصورت Hybrid Tea Roses اگاتے اور پھر انہیں کرسٹل کے گلدان میں سجا کر سراہتے رہتے۔ فیئری سے کہتے: "دیکھو ڈیئر یہ گلاب کس قدر نازک، حسین اور دلکش ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہے۔ ان کی نسبت میرے وطن پاک کے سادہ دیسی لال گلاب کی خوشبو یاد کرو..... کیسی مسحور کر دینے والی ہوتی ہے..... ایسا کیوں ہے فیئری، خدا نے یہاں کے گلابوں میں خوشبو کیوں نہیں ڈالی؟"

فیئری ایسی باتیں سن کر کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی: "آپ نہیں سدھریں گے You are an incurable romantic"۔

عمران ہائی سکول کے بعد کالج میں ایسے کورسز لینا چاہتا تھا جو اسے ایروناٹک فیلڈ میں لے جانے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ اسے بچپن سے ہی خلا باز بننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والدین اس کے اس عزم میں اسے مکمل طور پر سپورٹ کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ ان کے پورے خاندان میں، جن میں امریکہ میں بسنے والے کئی بہن بھائی اور کزن رشتہ دار شامل تھے، کسی کے بچے نے بھی کبھی اس طرف جانے کی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

"میں تو اس دن کے انتظار میں جی رہا ہوں کہ میرا بیٹا کسی بڑے ناسا مشن میں جائے اور کامیاب لوٹے۔ ایک آدھ ستارہ تو ہماری گود میں لا کر ڈال ہی دے گا نا۔" طارق سوچتے اور پھر سارے گھر میں گنگناتے پھرتے، "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں....." "محبت مجھے ان جوانوں سے ہے، ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند"..... عمران اپنے والد سے ان اشعار کا مطلب پوچھ کر مسکراتا اور ان کا یہ خواب پورا کرنے کا وعدہ کرتا۔

تھوڑی ہی دیر میں مہمان آنا شروع ہو گئے اور ہیلو ہائے، السلام علیکم کی ملی جلی آوازیں رنگین غباروں کی طرح فضا میں تیرنے لگیں۔ کیمونٹی کی معتبر شخصیات، قونصلیٹ کا عملہ، دوست

احباب سب ایک دوسرے سے ہیلو ہائے کر رہے تھے اور حال احوال پوچھ رہے تھے۔ طارق احمد تیس سال سے یو ایس اے میں ایک کامیاب کارپٹ ایکسپورٹر کے طور پر اپنی ساکھ قائم کر چکے تھے اور آج ان کے اکلوتے بیٹے کی گریجویشن پارٹی تھی۔ ایسا ہنگامہ تو ہونا ہی تھا۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' فیری کے گلے سے نکلنے والی نرم کومل آواز والی خاتون بولی۔

''روزی تم؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بھئی؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' فضیلہ مکمل طور پر برقع پوش خاتون کو دیکھ کر حیرت سے کہنے لگی۔ ''کم آن روزی، ہمیں بتا دیا ہوتا تو ہم بھی فینسی ڈریس پہن کر آ جاتے۔''

فضیلہ اور روزی کی مشترکہ دوست رشمی ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔

''فار گاڈز سیک پلیز تم دونوں خدا کا خوف کرو..... یہ فینسی ڈریس نہیں ہے۔ اب میں ہمیشہ اسی لباس میں رہتی ہوں۔ Now I am a born again Muslim یو نو، اللہ تعالیٰ نے ہم عورتوں کے لیے یہی ڈریس کوڈ تجویز کیا ہے تو ہمیں اسی طرح رہنا چاہئے اور اب پلیز مجھے آئندہ سے روزی نہیں، رضیہ کہہ کر بلایا کرو۔''

''اوہ آئی ایم سوری.....'' رشمی کچھ بجھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ فضیلہ بھی اپنی پرانی سہیلی کی اس بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر پل بھر کو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی روزی ہے جسے لاس اینجلس کی لائٹ آف دی پارٹی کہا جاتا تھا۔ اس کی ڈرنکنگ، ڈانسنگ، اور مردوں سے بے تکلفی کی داستانیں ویسٹ کوٹ سے نکل کر ایسٹ کوسٹ تک پھیل چکی تھیں۔ روزی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شرطاً کر جس مرد کو چاہے اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔

''اچھا میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ آؤں۔ وقت نکلتا جا رہا ہے۔ ایکسکیوزمی۔'' رضیہ اپنی سہیلیوں کو حیران پریشان چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

''کتنا چینج آ گیا ہے اس میں۔'' رشمی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ نائن الیون تو ہماری جان کو ہی آ گیا ہے۔ جسے دیکھو اسلامک فنڈامنٹلسٹ بنتا جا رہا ہے یہاں۔ کیا ہوگا اس قوم کا آخر!''

''سب نے برقعے، حجاب اور عبائیں پہن لی ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔''

دونوں سہیلیوں نے روزی کی کایا پلٹ ہو جانے پر اپنے اپنے تبصرے شروع کر دیے۔

سوئمنگ پول کے اردگرد پارٹی زوروں پر چل رہی تھی۔ ڈیک سے موسیقی فل بلاسٹ پر لگی ہوئی تھی اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ عمران کے ہم جماعتوں میں گورے، کالے، میکسیکن، چینی، ہسپانوی، ہر نسل کے بچے شامل تھے۔ خوش باش، کھاتے پیتے، مسکراتے بچوں کو دیکھ کر ان کے ماں باپ بھی خوش تھے کہ سب اتنا گڈ ٹائم انجوائے کر رہے ہیں۔ کوئی پول میں نہا رہا تھا تو کوئی کسی کو پول میں گرا رہا تھا۔ کوئی میز پر تھرک رہا تھا تو کوئی تصویریں کھنچواتا ہوا پھڑک رہا تھا۔ عمران اپنے دوستوں کو آلو کے چپس اور سافٹ ڈرنکس پکڑاتا جا رہا تھا اور خوش تھا کہ وعدے کے مطابق اس کے تقریباً سبھی کلاس فیلوز پارٹی میں شریک ہونے کے لیے آ گئے تھے۔

ماشاءاللہ بڑا پیارا نکل آیا ہے عمران بیٹا۔" ایک آنٹی نے پاس آ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیوں نہ ہو، آخر بیٹا کس کا ہے۔" طارق احمد فخریہ انداز میں ہنس کر کہنے لگے۔

"ہاں ہاں جب کسی بات کا کریڈٹ لینا ہو تو یہ آپ کا بیٹا بن جاتا ہے اور جب اس سے کوئی شکایت ہو تو یہ صرف میرا بیٹا ہوتا ہے۔" فضیلہ مصنوعی غصے سے بولی تو طارق نے اپنی منہ بسورتی بیوی کے منہ میں آئس کریم کا چمچ ڈال دیا اور سب ہنسنے لگے۔

پارٹی اتنی زبردست تھی کہ کمیونٹی میں ہفتوں اس کا چرچا ہوتا رہا۔ دور دور کی ریاستوں سے ان دوستوں نے جو بوجوہ شریک نہیں ہو سکے تھے، مبارکباد کے فون کیے اور پارٹی مس کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے مگر تحفے بھجوانے میں کسی نے کنجوسی نہیں کی۔ عمران کے لیے چیزوں کا انبار لگتا چلا گیا اور فضیلہ اور طارق انہیں سمیٹتے تھکتے حالانکہ عمران کے پاس پہلے ہی بھلا کس چیز کی کمی تھی۔

گریجویشن کے بعد ایک لمبی موسم گرما کی تعطیل تھی اور پھر ستمبر میں کالج میں داخلہ ہونا تھا مگر کچھ عرصے سے طارق اور فضیلہ محسوس کر رہے تھے کہ سمسٹر قریب آتے آتے عمران اپنے داخلے میں کوئی خاص دلچسپی کا اظہار کرتا نظر نہیں آ رہا۔ اس کی بھلا کیا وجہ تھی؟ عمران جیسا تعلیم پسند بیٹا نہ کالج کے پلانز بنا رہا تھا اور نہ ان سے کچھ زیادہ ڈسکس کر رہا تھا۔

"عمران بیٹا! تم نے اپنے کاغذات مکمل کر کے یونیورسٹی کو بھجوا دیے ہیں نا؟" ایک روز طارق نے اسے ناشتے کی میز پر گھیر لیا۔

"ابھی نہیں ڈیڈ، میں آج کل ذرا کچھ مصروف ہوں۔" عمران مزید کچھ کہے سنے بغیر اچانک کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک روز ڈیڈ نے اسے پھر جا لیا۔

"دیکھو بیٹا! اگر تم نے واقعی خلا باز بننا ہے تو گھر بیٹھے تو نہیں بنو گے۔ اس کے لیے کالج تو جانا ہی ہوگا۔ پری کورسز کے بغیر ناسا پروگرام میں کیسے داخل ہو گے، سمجھ آ رہی ہے یا نہیں؟" طارق کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

فضیلہ نے شوہر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کہ اتنا غصہ نہ دکھائیں۔

"بیٹا ڈیڈ کیا کہہ رہے ہیں، کچھ سنا تم نے یا نہیں؟" ماں نے پیار سے بیٹے کے آگے چکن کا پیس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"مام، ڈیڈ! میں آپ دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" عمران کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی چھا گئی۔ "دراصل میں فی الحال آگے نہیں پڑھنا چاہتا۔" کمرے میں ایک بم سا پھٹا اور در و دیوار لرزنے لگے۔

"کیا کہا؟ واٹ نان سنس۔ کیوں نہیں پڑھنا چاہتے۔ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ یہ کیا امریکن بچوں والی بات ہے۔ ہائی سکول نہ کالج ختم کیا۔ کوئی Odd job کر لی، گیس سٹیشن پر گیس بھری۔ Hourly wages پر کام کیا، پھر Quit کیا۔ نہ کوئی تعلیم نہ تربیت، نہ کوئی مستقبل کا منصوبہ۔" طارق غصے سے چیخنے لگے۔

"بیٹا ہم امریکنوں جیسی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ہم ایشین لوگ ہیں، ہم لوگوں کے زندگی میں Goals ہوتے ہیں، پلانز ہوتے ہیں، ہم اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" فضیلہ تحمل سے بات کرنے لگی۔

"آپ لوگ ایشین ہیں، میں نہیں، میں امریکن ہوں کیونکہ میں اسی سرزمین میں پیدا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اپنی طرح سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔" عمران پورے اعتماد سے ماں باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ہائے اللہ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ باہر گھوم پھر کر آوارہ گردی؟ امریکن بچوں کی طرح، شراب، ڈرگز، بدکاری، ان لوگوں کا تو نہ ماں ہے نہ باپ، مگر تم ہمارے بیٹے ہو۔ ہم تمہیں

یوں بگڑنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔" فضیلہ بھی چیخنے لگی۔

"میں آوارہ گردی نہیں کروں گا مام" عمران نے اسے پیار سے چھوا۔

"تو کیا کرو گے گھر بیٹھ کر؟" طارق نے فضیلہ کی طرف دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ "مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ صاحبزادے کے ارادے کیا ہیں؟"

"میں شادی کروں گا، مام ڈیڈ۔" عمران بڑے اطمینان سے بولا۔

"شادی؟ یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ ابھی شادی کا کیا ذکر۔ ابھی تو تم بچے ہو۔ بیٹا عقل کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ شادی بھی وقت آنے پر ہو جائے گی۔ یہ وقت تمہاری تعلیم کا ہے۔" فضیلہ نے پیار سے کہا۔

"کون ہے وہ؟ ڈاکٹر عنایت کی بیٹی نادیہ تو نہیں؟" فضیلہ نوٹ کر رہی تھی کہ کچھ دنوں سے اس کے کافی فون آ رہے ہیں۔

"نو مام، وہ تو صرف میری دوست ہے۔" عمران کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔

"تو پھر؟ ہائے کہیں کوئی امریکن لڑکی تو نہیں؟" فضیلہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

"کیا پاکستانی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے امریکہ میں؟" فضیلہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"ملوا دوں گا آپ لوگوں سے اسے..... آج ہی شاید..... مام ڈیڈ! آئی ایم سوری، آپ کو دکھ ہوا، لیکن بس میں اب کیا بتاؤں۔ مینڈی اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت پیار ہے ہمیں ایک دوسرے سے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ۔" عمران ماں باپ کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ سوچنے لگے، جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرا تھا تو کیا وہاں کے باسی بھی اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے راکھ کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو گئے تھے؟"

کیا ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے فیزی۔" طارق نے بچوں کی طرح روتے روتے فضیلہ کی گود میں سر دے دیا اور وہ خاموشی سے اسے تھپکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اگلے چند دن کچھ عجیب سی خاموشی میں کٹے۔ عمران صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ نہ جانے کہاں رہتا تھا وہ؟ ماں باپ سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے؟ فضیلہ اٹھتے بیٹھتے اس امریکن چڑیل کو کوسنے اور بددعائیں دیتی رہتی جس نے اس کے معصوم بیٹے پر جادو کر دیا تھا۔

''فیری، ٹیک اٹ ایزی۔ کیا پتہ وہ اچھی لڑکی ہو۔ شاید وہ ہماری بیٹی ہی بن جائے۔ آخر ہماری کوئی بیٹی بھی تو نہیں ہے..... شاید اس میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ آخر ہم اپنا اکلوتا بیٹا کھونا تو نہیں چاہتے نا۔'' طارق بیوی کو سمجھاتے رہے۔

''ہیلو مام ڈیڈ!'' عمران نے ایک شام گھر میں گھستے ہی انہیں پیار سے مخاطب کیا اور پھر کسی کو دروازے کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ کر آواز دی..... ''مینڈی، اندر آ جاؤ..... ڈونٹ بی شائی۔'' چند لمحے مکمل خاموشی رہی، پھر عمران اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ فضیلہ اور طارق کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کالی لمبی تڑنگی لڑکی کو انہوں نے عمران کی گریجویشن پارٹی میں دیکھ تو رکھا تھا لیکن شاید زیادہ قریب سے نہیں کیونکہ موٹے موٹے ہونٹوں، بڑی بڑی آنکھوں اور پیٹ کے نمایاں ابھار والی آبنوسی لڑکی کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ فضیلہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس نے کرسی تھام کر لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

''کیا تم؟'' فضیلہ نے مینڈی کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے سوال بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔

''یس۔ چار مہینے ہونے والے ہیں۔'' مینڈی نے اپنے پیٹ کی طرف فخر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مینڈی کے جانے کے بعد گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ ڈیڈ چیخ رہے تھے۔ مام زار زار رو رہی تھی اور عمران گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ تمہاری ہر فرمائش پوری کی..... پھر تم ہمارے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتے ہو؟''

''ڈیڈ سمجھنے کی کوشش کریں..... ہم نے جان بوجھ کر تو بے بی پلان نہیں کیا تھا۔ بس ہو گیا۔ یو نو It Happeas..... '' عمران نے کندھے اچکائے۔

''بے شرم لڑکے یہ ہمارا کلچر نہیں ہے۔'' ماں تڑپ کر بولی۔

''مام یہ اس ملک کا کلچر ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ میں امریکن ہوں، یہاں کا

رہنے والا ہوں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم ایشین بچوں پر اس سوسائٹی میں کتنے پریشرز ہوتے ہیں۔ جوان ہونے کے بعد ہم اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ کیسے ہو جائیں۔ اگر ہم کسی کے ساتھ ڈیٹنگ نہ کریں تو ہمیں ابنارمل یا ''گے'' سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر اپنے فرینڈز کی طرح امریکن لائف گزاریں تو آپ لوگوں کی ویلیوز خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ہم لوگ اس سوسائٹی میں رہ کر مس فٹ نہیں ہونا چاہتے۔ یہ ہمارے سروائیول کا مسئلہ ہے۔ سمجھنے کی کوشش کریں آپ لوگ۔ ہمیں یہاں رہنا ہے، ہمیشہ اور مستقلاً۔ مت روکیں ہمیں۔'' عمران کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ایک غلام زادی اب ہماری بہو بنے گی۔'' فضیلہ نے دانت پیسے۔

امریکی آسائشوں اور معاشی آسودگیوں کے غلام، تیسری دنیا کے تارک وطن، بے بسی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور لہریں اونچی سے اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

فضیلہ کو اپنی ایک پرانی امریکن ہمسائی یاد آ گئی جس نے اپنے بیٹوں کے لیے گھر میں پلے بوائے میگزین لگوا رکھا تھا۔ ''تم اپنے بیٹوں کو خود ہی کیوں بگاڑ رہی ہو؟'' ایک بار فضیلہ نے اس سے سوال کیا تو اس کے جواب نے فضیلہ کو حیران کر دیا ''میں نے یہ اس لیے لگوایا ہے کہ کہیں میرے بیٹے لڑکیوں کی جگہ لڑکوں میں دلچسپی نہ لینے لگیں۔''

طارق اور فضیلہ کی پاکستانی کیمونٹی کے لوگ حیران تھے کہ اتنی پیاری فیملی کو کس کی نظر کھا گئی۔ ابھی سب کچھ اچھا بھلا تو تھا۔ چند ماہ پہلے ہی تو اتنی عالیشان گریجویشن پارٹی دی تھی انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اور اب یہ اچانک شادی کا دعوت نامہ!..... فضیلہ نے رو رو کر پہلے ہی سب دوستوں کو بتا دیا تھا کہ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور اب وہ اسے باعزت طریقے سے نبھانا چاہتے ہیں۔ راز تو شادی کے دن کھل ہی جاتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے سوچا چھپانے سے کیا فائدہ۔ خواہ مخواہ باتیں بنیں گی، قیاس آرائیاں کی جائیں گی۔ ''شیطان کا کیا ہے کسی بھی وقت کسی کے بچے کو بھی بہکا سکتا ہے۔'' ان کے بچے کو بھی بس شیطان نے بہکا دیا تھا۔

ساری کیمونٹی میں ایک شادی پارٹی ہونے کے خیال سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خواتین اپنے نئے نئے پاکستان سے منگوائے ہوئے جوڑے پہننے کے خیال سے جھوم اٹھیں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں مہندی کے فنکشن پر ناچنے گانے کے خیال سے پروگرام سیٹ کرنے لگے۔

فضیلہ اور طارق نے سوچا اب سر پر پڑ ہی گئی ہے تو کیوں نہ اسے خوبصورتی سے ہی نبھائیں۔ انہوں نے دولہا دلہن کے لیے نئے سرے سے بیڈ روم کو ری ماڈل کیا اور لاہور سے دلہن کے لیے ڈیزائنر عروسی جوڑے آرڈر کر دیے۔ طارق کی بہن زبیدہ نے کپڑے تو بھجوائے تھے مگر چونکہ اسے دلہن کی اصلی صورت حال نہیں بتائی جا سکتی تھی لہٰذا لہنگا شلوار ٹخنوں سے اونچی اور قمیض کمر سے تنگ رہی۔

شادی والے دن آبنوسی رنگت والی دلہنیا کو لال جوڑے میں لاکھ سجایا مگر وہ کسی بھی طرح پاکستانی دلہن نہ لگ سکی۔ کرتے کی سلائیاں سائیڈ سے نکال دی گئیں مگر پھر بھی اس کا پیٹ گیند کی طرح باہر کو ابلتا دکھائی دیتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے سیاہ بالوں کے چھتے پر دوپٹہ ٹکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بالوں کو ہر طرف سے لاکھ کلپ لگائے گئے تب جا کر کہیں سر پر دوپٹہ ٹھہرا اور ساس کی جان میں جان آئی۔

''تم ایک بہت بڑی نیکی کا کام کر رہی ہو فضیلہ بہن۔ اللہ تمہیں اس کا بہت اجر دیگا۔'' چہرہ چھپائے ہوئے رضیہ عرف سابقہ روزی نے فضیلہ کو گلے لگا کر پیار کیا تو فضیلہ آنے والی زندگی میں ملنے والی دودھ اور شہد کی نہروں کے کنارے بیٹھ کر ستانے کے خیال سے مسکرا دی۔

دونوں سہیلیاں دلہن کو سرخ دوپٹہ اڑھا کر دھیرے دھیرے باہر لائیں تو مینڈی کی باسکٹ بال پلیئر سہیلیوں نے مسکرا کر تالیاں بجائیں اور آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اور لہنگا اٹھا اٹھا کر اس پر ہونے والا کام دیکھنے لگیں۔ انہیں مینڈی کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"Give me a joint" مینڈی نے اپنی ایک دوست لنڈا کو قریب پاتے ہی اس سے ایک سگریٹ لیا اور زور زور سے کش لینے لگی۔

"you look stressed" لنڈا نے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو مینڈی نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

''بہت تھک گئی ہے مینڈی'' عمران نے اسے دور سے دیکھا تو اس کے قریب جا پہنچا اور مینڈی کی فرینڈز سے اپنی شیروانی آؤٹ فٹ پر داد سمیٹنے لگا۔ مینڈی نے اپنے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی "Baby look, your dad is looking so handsome"

عمران بہت خوش تھا۔ آخر اس کے ماں باپ اس کی خوشی کے لیے راضی ہو ہی گئے اور

اب تو ان سب کی گھی بندھی روٹین لائف میں ایک خوشگوار تبدیلی بھی آنے والی تھی۔ گھر کے آنگن میں ایک نئے پھول کی مہک پھیلنے والی تھی۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے پیارے ماں باپ کے منہ چوم لیے۔

مینڈی کو پہلے مسلمان کر کے منزہ بنایا گیا۔ اسلامی نام رکھنے کا ایک اہم مرحلہ طے ہو گیا۔ جوان جہان کالی داڑھی اور شرارتی نظروں والے امام صاحب دلہن کے پیٹ کو مستقل گھورتے رہے مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

''فیزی یہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے.....ایک غیر مسلم کو مسلمان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی بہت جزا دیں گے۔'' رضیہ نے پھر سے فیزی کے کان میں سرگوشی کی تو فضیلہ پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

بہو کے آ جانے سے فیملی کے روز و شب میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ منزہ بیٹی اور عمران بیٹے کے باہر آنے جانے کے اپنے اوقات اور طور طریقے تھے۔ فضیلہ کئی بار سوچتی کہ بیٹے کی شادی صحیح وقت پر اور کسی پاکستانی لڑکی سے کی ہوتی تو وہ بہو کے کتنے چاؤ پورے کرتی۔ مگر یہاں تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ بہو سے کیسے پیش آئے۔ منزہ کھلاڑی لڑکی تھی، اس لیے جسمانی فٹنس کا پورا خیال رکھتی تھی۔ چند ہی ماہ بعد اسے کسی باسکٹ میچ میں شرکت کرنا تھی جسے وہ کسی قیمت پر بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر وقت ورزش کرتی نظر آتی تھی۔

فضیلہ اسے پاکستانی کام والے زرق برق جوڑے پہنا کر فرینڈز کے گھروں میں دعوتوں پر لے جاتی تو وہ بہت انجوائے کرتی۔

اتنی محبت کرنے والا شوہر اور خدمتگار ساس ملی تھی۔ وہ تو ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تو خیال تھا وہ اپنے بچے کو سنگل پیرنٹ بن کر پالے گی یا اپنی ماں کی مدد طلب کرے گی جو خود بھی ہمیشہ ہی تنہا رہی تھی مگر یہاں تو سب کچھ اتنا مختلف اور اچھا تھا کہ لائف ونڈرفل ہو گئی تھی۔ اب نہ اسے گھر کے کرائے کی فکر تھی نہ کمانے کی ٹینشن، بے بی کے لیے بھی سب انتظامات خود بخود ہوتے چلے جا رہے تھے۔

فضیلہ کو ایک فکر دن رات کھائے جا رہی تھی کہ اگر بچہ ماں پر چلا گیا تو پھر کیا ہوگا۔ وہ دن رات جائے نماز پر بیٹھی خدا سے التجائیں کرتی کہ ''اے اللہ پاک! میرے پوتے کو ماں جیسے

موٹے بھدے نین نقش اور کالے چھتے جیسے پھولے بال نہ دینا۔ یا اللہ! بچہ پاکستانی لگے، حبشی نہ لگے ورنہ ہم تمام عمر دنیا کے آگے وضاحتیں پیش کرتے پھریں گے..... یا اللہ! ہمارے حال پر رحم کرنا۔ بچہ بے شک عمران جیسا نمکین ہو مگر اسے نقش پاکستانی دینا۔" فضیلہ نے بہو کے کمرے میں جابجا خوبصورت پاکستانی بچوں کی تصویریں سجادی تھیں تاکہ وہ ہر وقت انہیں دیکھتی رہے اور ویسا ہی بچہ پیدا کرے۔

عمران بڑے شوق سے اپنی بیوی کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جاتا اور اس کی صحت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا۔ ہر ماڈرن امریکی جوڑے کی طرح ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچے کی پیدائش کے مرحلے میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ثابت ہوں۔ اس لیے انہوں نے ان کلاسوں میں بھی جانا شروع کر دیا تھا جہاں مرحلہ پیدائش کے دوران حاملہ ماؤں کو تنفس کے ذریعے آسان برتھ کی تربیت دی جاتی تھی۔

"مام ڈیڈ، جب میں پیدا ہو رہا تھا تو آپ لوگ بھی بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہوں گے۔ ہیں نا؟"

عمران نے اپنی بیوی کے لیے بنائی گئی لذیذ چنجیری اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "کتنا مزے کا ہے یہ!" مینڈی بولی۔

"ہاں بیٹا! لیکن اب یہ بھی سوچو کہ تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے..... خلا باز بننا ہے۔" ڈیڈ نے اس کا وعدہ اور فرض یاد دلایا۔

"کروں گا، کروں گا..... سب کچھ کروں گا۔ آپ کے سب خواب پورے ہوں گے۔ آخر آپ میرے اتنے پیارے مام ڈیڈ ہیں۔ آپ کی سپورٹ نہ ہوتی تو میں زندگی کے اس حسین لمحے میں کتنا اکیلا رہ جاتا۔ تھینک یو....."

منزہ بھی فرط مسرت سے ساس سے لپٹ کر بولی "یو آر دا بیسٹ۔"

فضیلہ کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ ہائے کاش یہاں کوئی پاکستانی لڑکی ہوتی۔ خوبصورت، نازک اندام، پتلے پتلے نین نقش والی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

"مام کتنی اچھی بات ہے کہ منزہ اتنی خوش ہے..... ہم سب کو اسے خوش ہی رکھنا چاہیے۔ آپ لوگ بھی خوش ہیں نا کہ یہ بچہ اس دنیا میں آ رہا ہے؟"

طارق اور فضیلہ بیٹے کی معصومیت پر مسکرا دیے" ہاں بیٹا! ہم خوش اور بہت خوش ہیں۔ ہماری تنہائیاں دور ہو جائیں گی، گھر میں رونق ہو جائے گی، بڑا مزا آئے گا۔" طارق بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔

"میں نے تو اسلامی ناموں کی کتاب سے نام بھی چننے شروع کر دیے ہیں۔" فضیلہ نے اترا کر کہا..... "رحمان کیسا رہے گا؟"

"اچھا ہے، سویٹ ہے، لیکن ہم اسے Raymond رجسٹر کروائیں گے۔ مام ڈیڈ کے لیے رحمان رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟" منزہ خوش ہو کر بولی۔

"گریٹ آئیڈیا نی! اس طرح اسے کوئی مسلم دہشت گرد نہیں سمجھے گا۔" عمران نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

یوں تو بہو کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی جا رہی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیسے ایک روز غسل خانے میں اس کا پاؤں پھسل گیا اور اُسے وقت سے پہلے ہی دردیں شروع ہو گئیں۔ سب اسے لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے اور فوراً داخل کروا دیا۔ عمران اندر جا کر بیوی کو لاماز کی ورزشیں کروانے لگا اور فضیلہ نے تسبیح پکڑ کر خدا سے بچے کے صحتمند اور خوبصورت ہونے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ طارق بھی نروس ہو کر ہسپتال کے کاری ڈور میں گھومنے لگے اور خدا سے یہ مرحلہ بخیریت طے ہونے کی دعا کرنے لگے۔

کئی گھنٹوں کی سخت لیبر کے بعد یکا یک عمران بھاگا بھاگا باہر دوڑا آیا۔ "مام ڈیڈ! آ جائیں بے بی از ہیئر"

"اچھا؟ کیا ہوا ہے" طارق نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم نے دیکھا اسے؟"

فضیلہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"نرس نے بس یہ بتایا ہے کہ لڑکی ہے..... بہت پیاری ہے..... چلیں چل کر دیکھتے ہیں۔" عمران کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

"اوہو تو اب رحمان کا نام بدلنا ہوگا..... کیا رکھوں گی؟" فضیلہ نے جلدی جلدی سوچا

"چلو رحمان نہ سہی، رحیما ہی سہی، ٹھیک عمران!"

''آپ کی جو مرضی، مام..... یہ آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔'' عمران بولا۔

ذہن میں بہت ساری سوچیں جنم لینے لگیں۔ کاش لڑکی کا نام بھی پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تینوں بے چینی سے منزہ کے پاس چلے آئے۔ فضیلہ نے بہو کے ماتھے پر بوسہ دے کر بسم اللہ پڑھی اور چھوٹی پلنگیا میں لیٹی بے بی کو پیار سے اٹھالیا۔

''ریما جانی آنکھیں کھول دو.....'' عمران، فضیلہ اور طارق نے سوئے ہوئے ننھے فرشتے کو دیکھا اور اس پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

''میرے اللہ! اس قدر خوبصورت بچی!'' سب حیران ہو کر وہیں بت کے بت رہ گئے۔ لچھے دار سنہرے بالوں، گوری گلابی رنگت اور نیلی سمندر آنکھوں والی حسین باربی گڑیا گود میں آتے ہی بھوک کے مارے اوں اوں کرنے لگی۔ فضیلہ کو تو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ اس نے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا کر نفرت سے یوں منہ پھیر لیا جیسے اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی بدصورت بچی نہ دیکھی ہو۔

▼▲▼▲▼▲▼
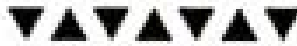
پرندے

میں نے آخری مریض دیکھ کر ایک لمبی انگڑائی لی اور لاڈ سے اپنی بیوی نصرت کی طرف دیکھ کر کہا "مابدولت ڈاکٹر صاحب بہت تھک گئے ہیں بس اب کلینک بند کر دیا جائے۔"

"جو حکم عالی جاہ!" نصرت مسکرا کر اٹھی اور استقبالیہ کمرے کی طرف چل دی۔ ہم دونوں میاں بیوی شام کو مل جل کر کلینک چلایا کرتے تھے۔ وہ مریضوں کو بٹھاتی، نام لکھتی، پیپر ورک کرتی اور میں مریض دیکھتا۔

"کیا ہوا؟ میں نے اسے اندر آ کر دوبارہ سفید اوور آل پہنتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ایک مریض بہت اصرار کر رہا ہے، آپ پلیز اسے دیکھ لیں۔"

"نصرت بھئی تمہیں پتہ تو ہے ہمیں سات بجے تک شفیق صاحب کے ہاں ڈنر پر پہنچنا ہے۔ اسے کل کی اپائنٹمنٹ کیوں نہیں دے دیتیں؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مان رہا۔"

"اچھا چلو بلا لو!" میں نے ہتھیار پھینک دیے اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کبھی کبھی کتنے ڈھیٹ مریضوں سے پالا پڑ جاتا ہے۔ اب تک میں کافی تھک چکا تھا، لیکن خیر میں نے دوبارہ سے اپنا موڈ بنایا اور میز پر سے پچھلے مریض کی رپورٹیں وغیرہ ہٹانے لگا۔

نصرت ایک چینیٹو، ستر سال عمر کے پٹھان بابے کو اندر لے آئی جس کے ساتھ ایک جوان خوبصورت، اداس آنکھوں والی لڑکی جو شاید اس کی بیٹی تھی، لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔

"جی بابا جی! فرمایئے!" میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔

"ہم بابا نہیں، ہمارا نام زرگل خان ہے، یہ ہماری بی بی ہے پشمینہ جان، اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس کو اچھی طرح چیک کرو ڈاکٹر صاحب!" بابے نے بڑے رعب سے مجھے مخاطب کیا۔

اچھا تو یہ بیوی ہے بابے کی، میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بے نام سی حسرتیں چٹکیاں لینے لگیں۔ واہ ری قسمت۔ میں نے سوچا۔

"ہاں! بی بی بتائیں آپ کو کیا شکایت ہے؟" میں نے سٹیتھو سکوپ گلے میں ڈال کر پشمینہ جان سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر صیب! یہ بے چاری کیا بتائے گی، ہم بتاتا ہے۔ یہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرتی ہے۔ ساری رات درد سے تڑپتی ہے۔ مچھلی کی طرح لوٹتی ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا اس کو، دن بھر آسمان کی طرف منہ کر کے پتہ نہیں کیا دیکھتی رہتی ہے۔"

بابا بول رہا تھا اور پشمینہ جان لاتعلقی سے کلینک کی دیواروں پر لگے میڈیکل پوسٹروں کو دیکھے جا رہی تھی۔

"تم بتاؤ بی بی! کہاں درد ہوتا ہے تمہیں!" میں نے مریضہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"ڈاکٹر صیب! میں آپ کو اکیلے میں بتائے گی....." اس نے چادر سے اپنا چہرہ مزید ڈھک لیا۔ کوئی پرائیویٹ معاملہ لگتا تھا۔ میں نے خان صاحب کو سمجھا بجھا کر کچھ دیر کے لیے باہر والے کمرے میں جا کر بیٹھنے پر رضامند کر لیا۔

"بس ڈاکٹر صیب! آپ میری بی بی کو ٹھیک کر دیں، جتنا مرضی پیسے لے لیں۔"

زرگل خان باہر جاتے ہوئے بولا۔ "بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

اس کے باہر جاتے ہی پشمینہ جان یک دم سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ چہرے سے چادر ذرا پیچھے کھسکا دی۔ بدلی سے چاند نکل آیا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میری بیوی نصرت کی آنکھوں میں خبردار! خبردار کے الاؤ دہکنے لگے۔

"ڈاکٹر صیب! میں بیمار ویمار نہیں، بالکل ٹھیک ہوں!"

"تو پھر؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں مکر کرتی ہے ڈاکٹر صیب! تاکہ یہ بڈھا میرے پاس نہ آئے۔'' شرارت بھری مسکراہٹ سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ چاروں طرف گلاب کی مہکتی کلیاں چٹکنے لگیں۔

''لیکن..... تمہارا شوہر.....'' نصرت نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ کوئی شوہر وہر نہیں ہے میرا، بڈھے نے مجھے پچیس ہزار میں خریدا ہے، زہر لگتا ہے مجھے۔'' وہ خود اعتمادی سے بولی تو اس کا حسن مزید نکھر آیا۔

''ہوں!'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''قید کر کے رکھا ہوا ہے اس نے مجھے۔ میں کھلے آسمانوں میں پرندے کی طرح اڑنا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر صیب! اونچا، اونچا..... بہت اوپر..... اور یہ بڈھا مجھے زمین پر چلنے والی چیونٹی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔'' وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر پردہ ہٹا کر کھلے آسمان کو تکنے لگی اور میں نے بھی پہلی بار غور سے نیلے آسمان پر اڑتے خوبصورت پرندوں کو دیکھ کر سوچا، یہ مجھے پہلے کیوں نہیں نظر آئے؟

''ڈاکٹر صیب! میں کیا کروں؟'' وہ یک دم ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح معصومیت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میری بیوی چونکی اور دوائیوں کے کاؤنٹر کے پیچھے سے آ کر میرے مزید قریب آ کھڑی ہو گئی۔

''ایسا کرو تم بھاگ جاؤ۔'' بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے نکلا۔ نصرت نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں سے پھوٹنے لگی۔

''اس کے لیے کچھ وٹامنز، کچھ سکون بخش دوائیں تجویز کر دیں۔ بابے کو تسلی ہو جائے گی۔ نصرت نے انگریزی میں مجھے مشورہ دیا اور میں نسخہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ بابے کو اندر بلا کر سمجھا دیا کہ اس کی بیوی ان دوائیوں سے بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ بس وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے، اللہ بہتری کرے گا۔

بابا خوشی خوشی اپنی پشمینہ جان کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھیرے دھیرے چلا کر باہر لے گیا کیونکہ اس سے اب پھر سے چلا نہیں جا رہا تھا۔

بہت سے دن گزر گئے۔ ہم اس واقعے کو تقریباً بھول چکے تھے کہ اچانک ایک شام

پشمینہ جان کلینک پر چلی آئی۔

''ارے تم! پشمینہ جان! تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

ہم دونوں میاں بیوی سراپا سوال بن گئے۔ ''تم ٹھیک تو ہو!''

''میں بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر صیب'' وہ آرام سے سٹول پر بیٹھ گئی۔

''میں تو یہ کہنے آئی ہوں کہ آپ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ بالکل صحیح مشورہ دیتے ہیں۔''

وہ ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت لائٹیں مارنے لگے۔

''کیوں کیا ہوا بھئی؟'' میں نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''میں بھاگ گئی ڈاکٹر صیب!''

''ہیں!'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ نصرت کے کان کھڑے ہو گئے۔

''میں تو بس آپ کو بتانے اور آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔''

''ارے رکو تو!'' میں نے اسے اٹھتے دیکھ کر فوراً کہا۔

''آخر اب تم کہاں رہتی ہو؟ کیا کرتی ہو؟ کچھ بتاؤ تا!''

نصرت کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیں سی لہرائی۔

''ڈاکٹر صیب! کیسی باتیں کرتے ہو؟ اڑتے پرندوں سے بھی بھلا کبھی کوئی ایسے سوال پوچھتا ہے؟ میں پھر سے اڑ گئی اور بس.....''

وہ پردہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی اور میں دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہا۔

''چلیے! گھر چلتے ہیں!'' میری بیوی نے لاڈ سے میرے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، اس پہ چھایا اطمینان علی الاعلان کہہ رہا تھا کہ اسے یقین ہے..... اسے سو فیصد یقین ہے کہ اس کے آس پاس کا کوئی پرندہ اونچی اڑان کی لذت کے لالچ میں راہ سے بھٹکنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

▼▲▼▲▼▲▼

کہانیاں

لوگ پوچھتے ہیں آپ کو کہانیاں کہاں سے ملتی ہیں؟ انہیں کیا بتاؤں کہ مجھے تو کہانیاں ہر جگہ، ہر وقت ، ہر صورت ملتی رہتی ہیں۔ بلا کوشش اور بلا محنت کے۔ کبھی گری پڑی، کبھی ٹکڑوں میں بکھری ہوئی اور کبھی فضا میں تیرتی ہوئی۔ مجھے انہیں ڈھونڈنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ وہ لاتعداد کبوتریوں کی طرح میرے آس پاس اڑتی، پھڑپھڑاتی اور گھسن گھیریاں کھاتی رہتی ہیں۔ میں دانہ ڈالتی ہوں تو وہ چگنے کے لیے ہتھیلی پہ آ بیٹھتی ہیں اور یہیں سے میرا اور ان کا دوستانہ شروع ہو جاتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک بڑھتی ہوئی عمر کے حساب سے اپنی صحت کا خیال کرنے والی کہانی شام کو سڑک پہ واک کرتی چلی جا رہی تھی کہ یکدم پورے علاقے کی بجلی چلی گئی۔

"اوہو اتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ سڑک پہ چلنے والے اوباش مرد خواہ مخواہ میرے گرد ہو جائیں گے، یہ سوچے بنا کہ میں بزرگی کی حدوں کو چھو رہی ہوں۔ اکثر کی نانیاں دادیاں بھی اب تو میرے برابر کی ہوں گی۔" کہانی نے ناگواری سے سوچا اور تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چلنے لگی۔ اچانک اس کی نظر سائیڈ پہ لگے بنچ پر بیٹھی ایک تنہا کہانی پر پڑی۔ کٹے ہوئے بالوں اور نسبتاً ماڈرن کپڑے پہنے وہ کہانی زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی۔ بوڑھی کہانی سے اگلا قدم اٹھایا نہ گیا اور وہ وہیں بنچ پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اس سے پیار سے سوال کیا۔ "کیا بات ہے بیٹا، کیوں رو رہی ہو؟ کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" ہمدردی کے

وہ بول سن کر نوجوان کہانی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسوؤں کی آبشار روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی کہانی خاموش ہو کر کتنی ہی دیر اس کی کمر سہلاتی رہی۔ اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی کہانی بولنے لگی۔

''مجھے میرے میاں نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ پہلے بھی ایسا کئی بار کر چکا ہے۔ میں اسی لیے پریشان ہوں کہ اب کیا کروں۔''

''مگر یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' بڑی نے اس کے ماتھے پہ آئے ہوئے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ''رہتی کہاں ہو؟''

''ڈیفنس سے آئی ہوں۔ وہیں میرا گھر ہے اور اب امی ابو کے گھر شادمان جانا ہے۔ بس تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟ تم ڈیفنس سے یہاں تک؟''

''جی پیدل آئی ہوں۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا اور سر جھکا لیا۔ بڑی سوچنے لگی، کتنی پاگل ہے۔ اتنا فاصلہ پیدل چل کے طے کیا ہے اس نے۔ شاید کبھی کبھی انسان پہ ایسا وقت آ جاتا ہے کہ دوری اور فاصلوں کی صعوبتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور ہر مشکل چیز بھی آسان لگنے لگتی ہے، شاید۔

''آنٹی بتائیں آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے جو اللہ میاں مجھے یہ سزا دے رہے ہیں؟'' چھوٹی بولتی چلی گئی۔ ''تین سال ہونے کو آئے مجھے، ایک دن بھی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی۔ اس کے پہلے سے بیوی بچے موجود تھے مگر اس نے میرے گھر والوں سے یہ بات چھپائی اور اب پہلی بیوی کے کہنے پہ مجھے رکھنا نہیں چاہتا، بار بار گھر سے نکال دیتا ہے۔''

''اور تمہارے والدین؟'' بڑی نے پوچھا۔

''ان کا کیا ہے وہ تو خود بھائی بھابی کے در پہ پڑے ہیں۔ میں ان کے گھر پہ جاتی ہوں تو دو تین دن بعد رکشے میں سوار کروا کر روانہ کر دیتے ہیں۔'' وہ پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''اچھا سنو، میری طرف دیکھو۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے میاں نے بھی پندرہ سال پہلے مجھے گھر سے نکال دیا تھا، ایک نئی عورت کے چکر میں۔'' بڑی نے چھوٹی کو اپنی کہانی

سنائی تو وہ حیرت زدہ ہو کر اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ بڑی عمر کی اجنبی کہانی بھی کیا اس کی طرح امتحانوں سے گزر چکی تھی؟

"تو پھر آپ نے کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا سیکھا، ملازمت کی بچے پالے۔ میں جانتی ہوں یہ سب کہنا آسان اور کرنا مشکل ہے مگر ایک بات تمہیں بتاؤں، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بس انسان کو مضبوط ہونا چاہیے۔" چھوٹی نے بوڑھی ہوتی، اسی راہ سے گزری ہوئی کہانی کی طرف دیکھا اور پھر سسکنے لگی۔ "Why me? آخر میرے ہی ساتھ یہ سب کیوں؟"

"ارے بیٹا یہ نہیں ہوتا۔ زندگی میں جو ہونا ہوتا ہے بس ہو جاتا ہے۔ اچھا چلو آؤ میں تمہیں اپنی ایک دوست کے گھر سے پانی پلواؤں تم یقیناً پیاسی ہوگی اتنا چل کر آئی ہو۔ یہ بالکل ساتھ ہی اس کا گھر ہے۔" بڑی کو اپنی ایک فرنیچر ڈیزائنر دوست کہانی کا خیال آ گیا جس کا گھر وہاں سے قریب ہی تھا۔ نوجوان کہانی روبوٹ کی مانند بڑی کی انگلی تھامے اٹھی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک گھر کے آگے کھڑی تھیں۔

دوست کہانی نے "آؤ آؤ ویلکم" کہہ کر دونوں کو اندر بلا لیا اور روتی ہوئی آنکھوں والی کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بڑی نے مختصراً اس کی رام کہانی سنائی اور دوست سے پوچھنے لگی۔ "ہم لوگ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کچھ تو کرنا ہوگا۔" پینتیس، چالیس سالہ فرنیچر ڈیزائنر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور دکھ کا کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ "رشیدہ شربت لا کر دو باجیوں کو۔"

اس کے آواز دینے پر ایک ملازمہ اندر آئی جس نے ٹھنڈے ٹھنڈے صندل کے شربت بھرے دو گلاس سامنے رکھ دیے اور حیرت و استعجاب سے انہیں دیکھنے لگی۔ مہمان پیاسی تھیں غٹاغٹ پی گئیں اور گلاس خالی ہو گئے۔

فرنیچر ڈیزائنر کہانی نے بڑی کہانی کو اپنے نئے ڈیزائن کیے ہوئے فرنیچر پیس دکھانے شروع کر دیے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔ بڑی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اس خاموش بت کا کیا کرنا ہے؟ اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان دونوں ہی کی ذمہ داری بن گئی ہے۔ "دیکھو، گھبراؤ نہیں اور اپنے آپ کو سنبھالو۔ تم سیدھی اپنے والدین کے پاس جاؤ اور انہیں کہو

کر تمہیں سہارا دیں کیونکہ بالآخر تم ان ہی کی ذمہ داری ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔"
دوست نے بڑے میٹر آف فیکٹ انداز میں بات کی اور بڑی سے ادھر ادھر کی ہانکنے لگی۔ خاموش بت شربت پیتا رہا۔ منتا رہا۔
"باجی لیکن میرے والدین مجھے نہیں رکھیں گے۔ پھر اسی کے پاس بھیج دیں گے۔"
یکدم بت جی اٹھا۔
"دیکھو یہ کوئی انوکھی بات نہیں، گھر گھر کی کہانی ہے۔" دوست نے خشک لہجے میں کہا۔
کیوں رشیدہ؟" اس نے اپنی ملازمہ کہانی کو مخاطب کیا۔
"ہاں جی بی بی جی۔"
"رشیدہ ہتا تو یہاں کیوں کام کرتی ہے؟ گھر کیوں نہیں بیٹھتی آرام سے؟" دوست نے اپنی نوکرانی سے سوال کیا۔
"باجی۔" "آپ کو تو پتہ ہے وہ کھسمانوں کھانا نشہ کر کے مجھے پیٹتا ہے اور خرچہ بھی نہیں دیتا۔ بس جی ہمارے تو نصیب ہی خراب ہیں۔" رشیدہ نے اپنے جیون ساتھی کو مغلظات سے نوازنا شروع کر دیا۔ "میرا تو جی چاہتا ہے اپنے آپ کو آگ لگا لوں مگر پھر بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔
"بس جی۔ محنت کر کے ان کا پیٹ پالتی ہوں .....کیا کروں کام نہ کروں تو کھائیں کیسے؟" رشیدہ نے اپنی رام کہانی سنانا شروع کر دی۔
فرنیچر والی کی ننھی چھ سالہ بیٹی بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کا پلو کھینچنے لگی۔
"مما رشیدہ سے کہیں مجھے آئس کریم دے۔" اس نے ضد کرنا شروع کر دی۔
"جا رشیدہ فریزر میں سے اسے آئس کریم نکال دے، جاؤ بیٹا۔"
ننھی کہانی اچھلتی کودتی رشیدہ کے ساتھ کچن کو چل دی۔
"اسے دارالامان میں نہ بھجوا دیں؟" بڑی کہانی ابھی تک تو جوان کہانی کی مدد کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔
"نہیں میں نے سنا ہے وہاں سے لڑکیاں غائب کر دی جاتی ہیں۔" مصیبت زدہ کہانی خوفزدہ ہو کر بولی۔

''بھئی نہیں یہ سب بکواس ہے۔آخر عورتوں کی مدد کا ادارہ ہے ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟
''بڑی کو بہت مشکل سے ہی کبھی کسی پہ شک ہوتا تھا۔وہ ہر ایک اور ہر بات پر بڑی جلدی اعتماد کر لیتی تھی۔

''آپی جی یہ میڈ طبقے میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی ہیں مگر.....''مصیبت کی ماری جوان کہانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔اب اس نے رونا بند کر دیا تھا۔

''منی!ادھر آؤ۔''فرنیچر والی کہانی نے اپنی ننھی بٹیا کو آواز دی۔وہ آئس کریم کو زبان سے چاٹ چاٹ کر گرنے سے بچاتی ہوئی ماں کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔''جی مما۔''

''بیٹا ان آنٹی کو بتاؤ تمہارے پاپا مجھے کیسے مارتے ہیں؟''فرنیچر ڈیزائنر نے بٹیا سے سوال کیا۔بڑی اور چھوٹی کہانی چونکیں اور خوبصورت انٹیریرز والے گھر کی مالدار مالکہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''بابا آپ کو ڈنڈے سے مارتے ہیں۔''ننھی کہانی نے آئس کریم چاٹتے ہوئے جواب دیا۔''اور اس روز کچن میں کیسے مارا تھا؟ ماں نے پھر سوال کیا اور بچی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''اس روز انہوں نے بال نوچے تھے آپ کے،دھکا دیا تھا اور پھر گرایا بھی تھا۔''ننھی کہانی آرام سے بولتی اور آئس کریم چاٹتی گئی۔

''ہائے مگر کیوں؟تم تو خیر سے اچھی طرح گھر میں آباد ہو۔بڑی نے حیرت سے سوال کیا۔کماتی بھی ہو؟مسئلہ کیا ہے؟''

''شہزادہ ہے میرا میاں،شہزادہ۔پالتی ہوں نا اس کو۔دراصل اسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کا بہت شوق ہے۔بس اسی لئے ہماری لڑائی ہو جاتی ہے۔''نیویارک سکول آف فیشن کی پڑھی ہوئی انٹیریئر ڈیزائنر نے بڑے تحمل سے بتایا اور پھر خود قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

''اب آپ جائیں۔رکشہ لیں،اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔''اس نے دکھیاری کہانی کو مسکرا کر کہا جس کے آنسو خشک ہو کر گالوں پہ جم چکے تھے۔

''میں بھی چلوں۔کافی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں۔بچی سوچ رہی ہوگی ماں کہاں رہ گئی۔اور اب تو بجلی بھی آ گئی ہے۔''سب سے سینئر کہانی نے اٹھنے کا قصد کیا۔

"آپ بھی بس.....ایسے ہی کسی کے آنسوؤں سے گھبرا جایا کرتی ہیں.....آپ ہم سب یہ،وہ.....کہانیاں ہیں اور کہانیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔" فرنیچر ڈیزائنر کہانی نے اپنے سے کئی برس بڑی کہانی کو پیار سے لپٹا کر سرزنش کی اور مسکرانے لگی۔

"مگر مما میں آپ کو ابھی سے بتا دیتی ہوں جب میرا میاں مجھے مارے گا نا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گی۔ مارنے نہیں دوں گی۔ مارنے سے تو بہت درد ہوتا ہے نا۔" ننھی منی کہانی نے اک نیا موڑ لینے کے ارادے کا اظہار کر کے سب کو چونکا دیا۔ کمرے میں موجود ہر کہانی کی آنکھ میں یکدم امید کے سینکڑوں دیے جھلملانے لگے۔

ناقابلِ معافی

''ارے رہنے بھی دیں صغیر بھائی۔ میں اٹھالوں گی۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟''
ناعمہ نے اپنے میزبان کو اپنا بھاری سوٹ کیس گاڑی میں سے گھسیٹتے ہوئے دیکھ کر آواز لگائی۔

''بھئی آپ بے فکر ہو جائیں۔ ابھی تو ہم جوان ہیں اور آپ ہماری مہمان ہیں۔ نکال لیں گے آپ کا سامان۔ آپ بس اپنا بیگ اٹھائیں اور چلیں اپنی سہیلی کے ساتھ۔'' صغیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دونوں خواتین کو گھر کے اندر جانے کا کہہ کر سامان اٹھانے لگا۔

ناعمہ نے اردگرد کے ماحول پر نظر دوڑائی۔ سب کچھ کتنا سرسبز، ٹھنڈا، صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ یہ پرانا انگلستانی شہر اپنے خوبصورت گردوپیش کی وجہ سے جنت کا ٹکڑا محسوس ہوتا تھا۔

''کہاں کھو گئیں بھئی سیاح صاحب۔ چلو گھر کے اندر چلو نا..... ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔ فیروزہ نے ناعمہ کو ہلکا سا ٹھوکا دیا تو وہ چونک کر مسکرائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی سہیلی کی جانب چلنے لگی۔

ان کا پرانے انگلش سٹائل کا بڑا سا پروقار، شاندار اور بارعب گھر بہت متاثر کن تھا۔ لکڑی کے بڑے بڑے قدیم طرز کے دروازے، ان پہ لگے آہنی کنڈے، تالے، چمکدار فرش اور وال پیپر سے مزین دیواریں دیکھ کر ناعمہ تو کھو سی گئی۔

گھر میں گھستے ہی کان پھاڑ دینے والی خاموشی کی آواز نے ان کا سواگت کیا تو ناعمہ

نے ایک لمحے کو سوچا۔ کیا سناٹا اتنا پرشور بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں انسان کو اپنے دل کی دھڑکن تک سنائی دے جائے۔ گھر میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ اس نے سن رکھا تھا کہ صغیر بھائی کے بچے بھی اسی گھر میں رہتے ہیں۔

وہ اپنی دوست فیروزہ کے بے حد اصرار پر اس کے نئے شوہر صغیر سے ملنے اور اس کا نیا گھر بار دیکھنے ان کے شہر مانچسٹر آئی تھی۔ صغیر صاحب اور فیروزہ دونوں اپنی اپنی زندگی کے پہلے شریک سفر ساتھیوں کو کھو چکے تھے، مگر اب باقی ماندہ زندگی گزارنے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا اور خوب گزر رہی تھی ان دو دیوانوں کی۔ سبھی رشتہ دار، دوست احباب خوش تھے کہ فیروزہ اور صغیر ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور اب انہیں تنہائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔

''بچے کہاں ہیں فیروزہ..... ارے بھئی انہیں بھی بلاؤ نا'' اکٹھے مل کر کھانا کھا لیں۔'' ناعمہ نے ٹیبل پر پرتکلف لنچ سجا دیکھ کر سادگی سے سوال کیا۔'' کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں کھائیں گے؟''

''نہیں۔'' فیروزہ نے مختصراً جواب دیا اور توے پہ تازہ روٹی ڈالنے لگی۔

وہ تینوں خوشگوار ماحول میں گپ شپ کرنے لگے۔ کبھی انگلستان کے سرد موسم کے حوالے سے رویوں کے بھی سرد ہو جانے کا ذکر ہوا اور کبھی پاکستان کے سیاسی حالات پہ تبصرے ہوئے۔

''آپ کو انگلستان آئے ہوئے کتنے برس ہوئے صغیر بھائی؟'' ناعمہ نے پوچھا۔

''جب ایوب خان نے ہری پور، میرپور اور قریبی علاقوں سے انگلستان کی فیکٹریوں میں کام کرنے لیے لیبر بھیجی تھی، ہم بھی نکل آئے تھے۔ میری شادی پاکستان میں ہوئی تھی مگر ہمارے بچے انگلینڈ میں ہی پیدا ہوئے۔ کتنے خوش تھے ہم میاں بیوی کہ ہمارے بچوں کو انگلش شہریت اور تعلیم و تربیت نصیب ہو رہی ہے۔''

فیروزہ انگلستان پہلی بار آئی تھی اس لیے وہ صغیر کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''تو بہ اتنے سال ہو گئے آپ کو یہاں۔'' ناعمہ نے یقین نہ آنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں مگر بہت دکھ کا تا.....'' صغیر کی آواز کپکپانے لگی اور ناعمہ نے موضوع بدلنے

میں ہی عافیت جانی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی کہ یہ اب ایک دوسرے کے دکھوں کا مداوا بنے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اتنی اچھی طرح ایڈجسٹ ہوئے نظر آرہے تھے۔

ان کے بڑے سے بھول بھلیاں والے گھر کے لاؤنج سے اوپر جاتی چوبی سیڑھیاں دیکھ کر ناعمہ کو پراسرار انگلش فلمیں یاد آنے لگیں۔ ایسے ہی تو گھر دکھاتے ہیں ان میں۔

سیڑھیوں سے اوپر کی منزل کو جاؤ تو شب خوابی کے کمرے یوں سجے سجائے ملتے جیسے کسی رسالے کے فوٹو شوٹ میں سے نکالے گئے ہوں۔ ہر چیز اتنی مناسب، اتنے قرینے سے تھی کہ ناعمہ فیروزہ کی انتظامی صلاحیتوں اور ہاؤس کیپنگ پہ واہ واہ کر اٹھی۔

آنے والے دنوں میں ناعمہ نے صغیر صاحب کے دونوں بچوں کو بھی راہداریوں میں سے گزرتے، سیڑھیوں پر سے اترتے، چڑھتے دیکھ ہی لیا۔ یہ پندرہ سولہ سال کے جڑواں بچے تھے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا جنہیں صغیر صاحب پیار سے چنو اور منو کہہ کر پکارتے تھے۔

''کتنے پیارے نام ہیں ان کے چنو اور منو..... بالکل دیسی۔ کس نے رکھے تھے یہ نام؟'' ناعمہ نے خوش ہو کر صغیر سے سوال کیا۔

''ان کی امی نے۔ اللہ بخشے زرینہ ان دو چھوٹے بچوں سے حد سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ وہ اکثر رات کو سونے سے پہلے انہیں چنو اور منو کی کہانی سناتی تو وہ بہت خوش ہوتے اور اس کہانی سے کبھی نہ اکتاتے.....اب تو کہانی ہی ختم ہو گئی.....'' صغیر بھائی اداس ہو گئے.....

''ارے چلیں آئیں آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔'' فیروزہ نے صورتحال کو بگڑتا دیکھ کر خیال پیش کیا تو صغیر بھائی کے چہرے پہ چھائے اداسی کے بادل چھٹ گئے اور دھوپ نکل آئی.....

چنو اور منو صبح سویرے اٹھ کر سکول جانے کے لیے چپکے سے نکل جاتے تو صغیر بھائی اوپر جا کر ان کے کمرے صاف کرتے، کپڑے واشنگ مشین میں دھوتے، ان کے باتھ روم چمکاتے..... فیروزہ کے فرائض میں یہ سب کچھ شامل نہ تھا اس لیے باقی گھر کا کام کاج وہی سنبھالتی۔ شام ڈھلے چنو اور منو گھر آتے تو فاسٹ فوڈ کا کوئی بیگ ان کے ہاتھوں میں ہوتا جسے وہ سیدھے بیسمنٹ میں بنے ٹی وی روم میں نیچے لے جاتے۔ وہیں کھاتے اور ٹی وی دیکھتے رہتے۔

رات گئے وہ سیڑھیاں چڑھتے اور خاموشی سے اپنے بیڈروم میں جا کر سو جاتے۔ ایک دو بار نامیہ نے انہیں اپنے سامنے پا کر خوشدلی سے ہیلو، ہائے، ہاؤ آر یو کہا تو وہ تمیز کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر ہلا کر آگے بڑھ گئے اور وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے ان بچوں سے خوامخواہ کی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ حیران ہوتی کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان بچوں کی ایک اتنی علیحدہ سی زندگی کیوں ہے؟

ایک روز پھر جب فیروزہ نے کوئی انوکھی سی ڈش بنائی تو نامیہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''بچوں کو بھی بلا لیں صغیر بھائی۔ وہ بھی اپنی نئی ممی کے ہاتھ کا کھانا کھا لیں۔''

''وہ لوگ یہ کھانا نہیں کھاتے۔'' صغیر نے مختصراً جواب دیا اور خود کانٹے سے سلاد کھانے میں مصروف رہے۔

''حیرت کی بات ہے انہیں گھر کا پکا ہوا اتنا مزے دار کھانا پسند نہیں؟'' نامیہ چپکی نہ رہ سکی۔ فیروزہ اور صغیر خاموش رہے۔ نامیہ کھڑکی سے باہر گرتے ہوئے سنہری پتوں کی سرسراہٹ اور دیوانی ہواؤں کی مدھم دستک سن کر سوچنے لگی۔ ''اس اتنے بڑے خوبصورت، قدیم انگلش کنٹری سائیڈ ہوم میں کیا زندہ انسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ مردے بھی اقامت پذیر ہیں؟ بچوں کا معما اسے الجھائے چلا جا رہا تھا اور وہ الجھتی چلی جا رہی تھی۔

ایک روز صغیر اور فیروزہ کی کسی دوست پاکستانی فیملی نے انہیں کھانے پر بلایا تو وہ نامیہ کو بھی ساتھ لیے ان کے ہاں جا پہنچے۔ یہ مانچسٹر میں سالہا سال سے رہنے والے قادر بخش ٹیکسی ڈرائیور کا گھر تھا جو کیمبل پور پاکستان کے کسی نواحی قصبے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ قادر بخش اور ان کی بیوی زرینہ نے روایتی پاکستانی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حد سے زیادہ پرتکلف کھانا تیار کیا تھا جس میں مرغ پلاؤ، شامی کباب، کریلے گوشت سے لے کر سوجی کا حلوہ تک شامل تھا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور پکانے والی کی خوب تعریف کی۔

کھانے پر قادر بخش کا ایک بھانجا بھی موجود تھا جو ماحولیات پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ زیادہ پڑھا لکھا یا ذہین نہیں لگتا تھا مگر اس کی گفتگو بہت بامعنی اور بامقصد تھی۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' نامیہ نے دیوار پہ لگی تصویروں کو دیکھ کر زرینہ سے پوچھا۔

''چار بیٹیاں ایک بیٹا ہے۔'' جواب ملا۔

''پڑھتی ہیں؟'' ناعمہ نے سوال کیا۔

''نہیں پڑھ چکیں.....اب لندن میں رہتی ہیں، نوکریاں کرتی ہیں۔ اپنی اپنی زندگی ہے ان کی۔'' زرینہ کے لہجے سے بے بسی جھلکنے لگی۔

مرد حضرات تھوڑی ہی دیر میں ڈرائنگ روم میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگے اور قادر بخش کی بیوی اپنی ماں اور ساس کو، جو انکے ساتھ ہی رہتی تھیں کھانا دینے لگی۔ تقریباً اسی اسی برس کی دو ضعیف دیہاتی عورتیں، آنکھوں پہ عینکیں لگائیں گرم سوٹ شالیں اوڑھے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی خاموشی سے ہیٹر کی گرمی سے لطف اندوز ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

''ہائے یہ بے چاریاں یہاں.....اپنے کیمبل پور سے دور.....رشتہ داروں کے بغیر، مانچسٹر کے اس ٹھنڈے، پرانی وضع کے گھر میں.....نہ جانے کتنی اداس ہوتی ہوں گی۔'' ناعمہ کے دل میں رحم کا طوفان موجزن ہو گیا۔

''آپ کو اپنا گاؤں، اپنا محلہ، اپنے لوگ تو یاد آتے ہوں گے۔ کتنے سالوں سے آپ یہاں ہیں۔'' ناعمہ نے پیار سے دونوں خاموش بتوں سے سوال کیا۔

دونوں ضعیف عورتوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ شاید اکیلی رہ رہ کر وہ بولنے کی ضرورت اور خواہش سے بھی آزاد ہو چکی تھیں۔

''آپ کو یہاں رہنا اچھا لگتا ہے؟'' ناعمہ نے انہیں کریدا۔

دونوں بوڑھیوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا! وہ کیوں؟'' ناعمہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''کیونکہ یہاں نلکوں میں ہر وقت گرم پانی آتا ہے۔ ایک نے جواب دیا۔

''یہاں ہمارا علاج مفت ہوتا ہے۔ پھر بچے ہمارے پاس ہیں، وہاں رہیں تو آنکھوں سے دور ہوتے ہیں۔'' دوسری نے جواب دیا۔

ناعمہ خاموشی سے انہیں تکتی چلی گئیں۔ اس کا جی چاہا انہیں بتائے کہ اس وقت کے میرپور، ہری پور، کیمبل پور اور آنج کے انہی شہروں میں اب بہت فرق ہے۔ اب پاکستان میں بھی نلکوں میں گرم پانی آتا ہے۔ البتہ علاج کی سہولیات اور بچوں کی موجودگی کے بارے میں اس کے

پاس کوئی خاطر خواہ جواب نہیں تھا اس لیے وہ خاموش رہی۔

اسی وقت ٹی وی پہ خبر چلی، ایک پاکستانی لڑکی کو عین شادی کے دن اس کے ایک کزن نے قتل کر دیا ہے۔ انگلش ٹی وی والے اس لڑکی کے قاتل کا انٹرویو نشر کر رہے تھے جس میں وہ کہہ رہا تھا لڑکی نے ہماری مرضی کے خلاف شادی کی ہے اس لیے یہ ہماری غیرت کا سوال تھا..... اسے سزا دینا ہی تھی..... ٹی وی پہ بہت سے شلوار قمیض والے پاکستانی مرد اور انگریز پولیس کے اہلکار آپس میں گتھم گتھا ہوتے نظر آ رہے تھے۔

''توبہ یہ کیا ہو رہا ہے؟'' فیروزہ اور ناعمہ ہکا بکا ہو کر ٹی وی دیکھنے لگیں۔ اتنی جہالت اور پسماندگی..... ناعمہ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''آنٹی جی آپ لوگوں کو شاید پتہ نہیں ہے انگلینڈ میں پاکستانیوں کے ذہن اور رہن سہن میں اب بھی قبائلی نظام رچا بسا ہوا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں چھوٹے شہروں سے اٹھ کر آنے والے رہنے والے یہاں اپنے اپنے میر پور، ہری پور اور کیمبل پور بنا کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا ذہن موجودہ انگلستانی نظام اور قانون کو قبول نہیں کرتا، اسی لیے یہاں بھی عورتوں پہ اسی طرح تسلط قائم رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے جیسے بیک ہوم ہوتا ہے۔''

''ہائے بڑے مسائل ہیں یہاں ماں باپ بھی کیا کریں، لڑکیاں پڑھ لکھ جاتی ہیں تو اپنے کزنوں سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ ہم کہاں سے ان کے لیے ان کے مطابق رشتے لائیں۔ ہماری بیٹیاں بھی اسی لئے ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔'' زرینہ نے اپنے دل کا حال کہہ ڈالا اور ناعمہ سوچنے لگی۔ کیمبل پور کے کسی نواحی قصبے کی یہ فیملی انگلستان میں بیٹھ کر کریلے گوشت، پلاؤ، پودینے کی چٹنی تو بنا اور کھا سکتی ہے مگر اپنی انگلینڈ کی جم پل لڑکیوں کی تقدیر پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ سہولت اور فراوانی کی زندگی اپنا خراج لے کر رہتی ہے۔

گھر لوٹنے پر ناعمہ نے ٹی وی روم کی درز سے چھن کر آتی ہوئی روشنی میں دیکھا صغیر بھائی کے دونوں بچے خاموش بت بنے ٹی وی کے آگے برگر اور فرنچ فرائز کے ڈبے رکھے میکانکی انداز میں ہولے ہولے کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے کاغذ کے پیک لفافے اسی کمرے میں پڑے کوڑے کے ڈبے میں پھینکے اور خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نہ کسی سے ہیلو نہ ہائے، نہ سلام نہ بائے..... بچے تھے یا روبوٹ؟ ناعمہ نے

متذبذب ہو کر سوچا۔

''فیروزہ.....ایک بات پوچھوں؟'' اگلی صبح ناشتہ کی میز پر سوئس چیز کا ٹکڑا ٹوسٹ پہ رکھتے ہوئے ناعمہ نے اپنی سہیلی سے سوال کیا۔

''ہاں.....بھئی بولو.....کیا پوچھنا ہے؟'' فیروزہ مسکرائی ''تم خوش تو ہو نا؟ دیکھو مجھ سے نہ چھپانا.....؟'' ناعمہ نے سوال کیا۔

''ارے یہ کیا سوال کر دیا تم نے.....ارے پگلی نظر نہیں آتا تمہیں ہم دونوں کتنا چاہتے ہیں ایک دوسرے کو.....اتنے سالوں بعد تو زندگی نے ہمیں خوش ہونے کا موقع دیا ہے.....خوش کیوں نہ ہوں.....صفیر بہت اچھے انسان ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ وہ مجھے مل گئے۔''

آج تم نے قادر بخش کی بیوی سے سن ہی لیا تھا یہاں کے رہنے والوں کو کیا مسائل درپیش ہوتے ہیں! بس صفیر بھی تقریباً انہی حالات کا شکار تھے۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں..... تھیں.....فیروزہ نے انکشاف کیا۔

''تھیں! کیا مطلب؟'' کیا ہوا! ناعمہ حیران ہوتی چلی گئی۔

''ہونا کیا تھا.....بس وہی مسئلہ۔ لڑکیاں جوان ہو گئیں تو ماں باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ لڑکیاں پڑھ لکھ کر قابل ہو گئی تھیں وہ کسی ایسے شخص سے شادی نہ کر سکتی تھیں جو صرف پاکستانی ہو اور کچھ بھی نہ ہو۔ انہیں اپنی سطح اور معیار کے لڑکے ڈھونڈنے میں مشکل آ رہی تھی۔ صفیر اس وقت ایک سخت گیر باپ، پنڈی وال کے روایتی آدمی تھے ہر صورت اپنی روایات اور تمدن برقرار رکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہاں رہنے والے ان کے دوست، رشتہ دار باتیں بنانے لگے کہ لڑکیوں کی شادی نہیں کر رہا۔ وہی تنگ نظر برادری سسٹم جس نے ان کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ دراصل تیس، چالیس سال پہلے انگلینڈ اٹھ کر آ جانے والے لوگ ذہنی طور پہ اسی ٹائم زون میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں جس میں انہوں نے وطن سے ہجرت کی تھی۔ وہ نہ ادھر کے رہتے ہیں نا ادھر کے۔

بڑی لڑکی ثریا جوان ہو کر قابل ہو گئی تھی۔ صفیر اس کی کسی کزن پاکستانی لڑکے سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ کسی انگریز لڑکے سے شادی کے عہد و پیماں کر چکی تھی۔

''اچھا''.....ناعمہ یہ سن کر پریشان سی نظر آنے لگی۔

عین اسی وقت کھٹکا ہوا اور دونوں سہیلیوں نے دیکھا، صفیر ہاتھ میں کئی طرح کا فروٹ،

چاکلیٹ اور گفٹ باکس اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

''ارے کیا پورا اسٹور ہی اٹھا لائے ہیں۔اتنی چیزیں، خیریت تو ہے؟''

فیروزہ نے سامان ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''آج سپیشل ڈے ہے فیروزہ جی آج چنو اور منو کی سالگرہ ہے.....''صغیر کی خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

''وہ تو گھر نہیں ہیں۔لائیے میں یہاں رکھ دوں''فیروزہ نے چیزیں لے کر سنبھالنا شروع کر دیں۔صغیر نے آتشدان روشن کر دیا اور لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سے ماحول بڑا آرام دہ، گرم اور دوستانہ محسوس ہونے لگا۔

''صغیر بھائی اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ سے آپ کی کہانی پوچھ سکتی ہوں؟ فیروزہ نے مجھے تھوڑا سا بتایا ہے۔''ناعمہ نے ان کے ہاتھ میں تھمائی ہوئی کافی سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جما کر پوچھا۔

''بس ناعمہ، کیا بتاؤں شاید مجھ سے کچھ غلطی ہوئی، شاید میری بیوی سے یا بچوں سے، پتہ نہیں۔سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔ہم لوگ دو ملکوں، دو معاشروں کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''میں نے اسے بتایا تھا، آپ ثریا کی شادی کرنا چاہتے تھے اپنی مرضی سے''اور بس کچھ نہیں بتایا۔''فیروزہ نے اپنے شوہر کو گرم شال اڑھا کر پیار سے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

صغیر نے ایک گہری سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

''میں نے ثریا کو مجبور کیا کہ وہ شادی کے لیے ہاں کر دے حالانکہ اس کی ماں نے مجھے بہت روکنے کی کوشش کی مگر میں تو اپنی بیٹی کی بھلائی ہی چاہتا تھا۔اسے کسی انگریز کے ساتھ زندگی بتاتے کیسے دیکھتا؟.....ثریا نے بالآخر میرا کہا مان لیا اور دلہن بن کر بیٹھ گئی مگر.....''صغیر کی آواز کپکپانے لگی۔اس نے بہت سی خواب آور گولیاں کھائی تھیں اس لیے وہاں دلہن کی جگہ ایک سرخ کپڑوں میں ملبوس لاشہ پڑا تھا۔''

''اوہ مائی گاڈ۔صغیر بھائی..... یہ تو بہت افسوسناک بات ہے۔آئی ایم سوری.....''

ناعمہ اظہار تاسف میں سر ہلانے لگی۔

صغیر نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔

''میری بیوی زرینہ کو بیٹی کی موت کے صدمے نے تقریباً مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اس نے گھر کی اور بچوں کی، دیکھ بھال کرنا چھوڑ دی اور بستر پر پڑ گئی۔ بس ہر وقت مجھے ظالم، خود غرض اور قاتل ہونے کے طعنے دیتی رہتی۔ اس نے ہماری دوسری جوان بیٹی صبیحہ کو گھر چھوڑ کر چلے جانے کو کہہ دیا اور صبیحہ لندن کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ وہ وہیں جاب کرتی اور ماں کو، چنو منو کو کبھی کبھار ملنے آ جاتی مگر مجھ سے کوئی ٹھیک طریقے سے بات تک نہ کرتا۔ زرینہ نے بالآخر کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے وہ ڈپریشن کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔

''بے چارے صغیر بھائی۔'' ناعمہ کو ان پر ترس آنے لگا۔

''زرینہ مجھ سے لڑتی جھگڑتی، کبھی روتی اور کبھی ہنستی تھی۔ پھر ایک روز اس کا مکمل نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور اس نے اسی عالم میں ثریا کی طرح خواب آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔'' صغیر ہچکیاں لے لے کر رونے لگے..... فیروزہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''یہاں تو کوئی ہوتا بھی نہیں ہے، یہ جو سیڑھیاں ہیں نا..... جو تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں، انہی سیڑھیوں سے میں اور میرے یہ چھوٹے سے بیٹی بیٹا منو اور چنو، ماں اور بہن کے مردہ جسموں کو اٹھا کر نیچے لائے تھے..... دو بار بچوں نے لاشے گھسیٹے.....''

ناعمہ نے ان شاہانہ، قدیم انداز میں بنی ہوئی خوبصورت چوبی سیڑھیوں کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے تو وہ کانپ کے رہ گئی۔ ''کیسا دکھ بھرا اور خوفناک منظر ہو گا وہ'' ..... اس نے تصور کیا.....

''توبہ'' ..... اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اُسے کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے لہٰذا وہ خاموش رہی۔

''بس تبھی سے یہ دونوں بچے چپ ہو کے رہ گئے ہیں۔ مجھے مجرم گردانتے ہیں کیونکہ میں نے ہی اپنی ضد کی وجہ سے ان کے گھر کی خوشیاں برباد کی تھیں۔''

''آپ نے وہی کیا جو ایک ذمہ دار فرض شناس باپ سوچتا ہے..... آپ نے اپنی سوچ کے مطابق ہی کیا..... آپ اپنے آپ کو الزام نہ دیں۔'' فیروزہ نے شوہر کو تسلی دینا چاہی۔

''ابھی ذرا چھوٹے ہیں۔ بڑے ہوں گے تو یہ بھی پھر پھڑا کر اڑ جائیں گے اور گھونسلہ خالی ہو جائے گا اور پھر شاید کبھی کبھار ہی باپ کی شکل دیکھیں۔'' صغیر بھائی دھیمے لہجے میں

بولتے چلے گئے۔

''ایک آئیڈیا ہے صغیر بھائی، کیوں نہ آج ہم سب چنو، منو کی سالگرہ منائیں، کیک کاٹیں، میوزک لگا کر ڈانس کریں، ہلا گلا ہو تو شاید ان کا موڈ بھی بہتر ہو جائے.....'' نامعہ نے تجویز پیش کی مگر اگلے ہی لمحے صغیر اور فیروزہ کی شکلیں دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اتنا کچھ کی توقع کرنا شاید کچھ زیادہ ہو گا اس لیے چپکی ہو کر بیٹھ رہی۔

''آج کے دن تو وہ لوگ اپنی ماں اور بہن کی قبر پہ جاتے ہیں۔'' فیروزہ نے ہولے سے کہا۔

''دیکھو چنو کے لیے یہ جیکٹ لایا ہوں، اچھی ہے نا.....اسے یقیناً پسند آئے گی.....یہ اس کا فیورٹ کلر ہے۔'' صغیر نے تحفہ کا پیکٹ کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور منو کے لیے، کیا لائے ہیں؟'' فیروزہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''منو کے لیے؟ یہ گولڈ کا جیولری سیٹ۔ اچھا لگے گا نا اسے۔''

''صغیر بھائی۔ بہت اچھا ہے سب کچھ۔ لائیں میں اسے اچھی طرح پیک کر دوں۔''

نامعہ نے ان کے ہاتھ سے چیزیں لے لیں اور ڈبوں کو خوبصورت ربن اور ڈیکوریشنز لگا کر پیک کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں صغیر اوپر جا کر وہ گفٹ باکس سرپرائز کے طور پر ان کے کمروں میں چھوڑ آئے اور خود ان کے ردعمل کا انتظار کرنے لگے۔

خلاف توقع بچے اس دن گھر ہی نہیں آئے۔ صغیر بھائی نے فون کر کے پتہ کیا تو علم ہوا کہ وہ بڑی بہن صبیحہ کے گھر لندن چلے گئے ہیں۔ فیروزہ نے پھر بھی کیک لا کر کاٹا، موم بتیاں جلائیں اور بچوں کی غیر موجودگی میں ہی تالیاں بجا کر نامعہ کے ساتھ ''ہیپی برتھ ڈے چنو منو'' کے نغمے گائے جس سے صغیر بہت خوش ہوئے اور بار بار آنکھوں کے کونوں سے نمی صاف کرتے نظر آتے۔

''فیروزہ تمہارے آنے سے میری سونی زندگی میں بہار آ گئی ہے۔ شکریہ۔ اور نامعہ اب سے تم نے انگلینڈ بار بار آنا ہے۔ سنا؟ میں خود تمہیں ٹکٹ بھیجا کروں گا..... فکر نہ کرنا۔'' صغیر بھائی نے جذبات سے مغلوب ہو کر نامعہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

چنو اور منو جس طرح خاموشی سے گھر سے گئے تھے، اسی طرح چپ چاپ ایک دن بعد

گھر چلے آئے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ صغیر توقع کر رہے تھے وہ نظر آئیں تو ان سے پوچھیں کہ گفٹ پسند آئے؟ مگر بچے اگلے پورے دن انہیں دکھائی نہ دیئے اور صغیر کو ان کو وش کرنے اور بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

اگلے روز موسم بہار کی آمد پر شہر کے سینی ٹیشن والوں کا خاص سپرنگ کلینگ دورہ لگنا تھا اس لیے بھی لوگ اپنے اپنے گھروں، لان اور سٹورز کی صفائی کرنے میں جتے ہوئے نظر آنے لگے۔ نامیہ اور فیروزہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو صغیر اکیلے ہی لان کا بڑا سا جھاڑ و تھامے خشک پتے، ٹہنیاں اکٹھے کرتے نظر آئے۔

"ارے چلو ہم بھی صغیر کی مدد کرتی ہیں۔" فیروزہ نے ہلکی سی جیکٹ پہنتے ہوئے نامیہ کو دعوت دی جسے اس نے مسکرا کر قبول کر لیا اور وہ دونوں باہر کو چل دیں۔

بڑے بڑے پلاسٹک بیگوں میں گند بلا، پتے وغیرہ بھر کے صغیر نے اپنے بیک یارڈ میں لگے بڑے سے ڈمپ میں پھینکنے شروع کر دیئے تو فیروزہ اور نامیہ بھی اپنا اپنا اکٹھا کیا ہوا کوڑا لیے آ گئیں اور اسے پھرتی سے ڈمپ میں انڈیلنا شروع کر دیا۔ یکا یک نامیہ کو ڈمپ میں کچھ نظر آیا تو وہ ٹھٹکی.....

"کیا ہوا؟" صغیر نے پوچھا اور پاس آ کر ڈمپ میں جھانکنا شروع کر دیا۔ انہیں زیادہ دیر کھنگالنا نہیں پڑا کیونکہ جلد ہی انہیں وہ پیک شدہ گفٹ باکس نظر آ گئے جو وہ چنو اور منو نے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے انہیں کھولا تک نہیں تھا کیونکہ ان پر ٹیپ اسی طرح چپکی ہوئی تھی۔ صغیر کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ بے اختیار زمین پر دھپ سے گر گئے۔

"کیا ہوا صغیر!" فیروزہ لپک کر آئی اور ڈبے دیکھ کر سب سمجھ گئی۔

"مجھے کبھی معافی نہیں ملے گا۔ مجھے کبھی معافی نہیں ملے گی۔" وہ بچوں کی طرح بلبلانے لگے۔ "یا اللہ میرا قصور کیا ہے؟" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر چیخنا، چلانا، بال نوچنا شروع کر دیا اور اپنے کپڑے پھاڑتے ہوئے سڑک پہ دیوانہ وار دوڑنے لگے۔

▼▲▼▲▼▲▼

شہرِ حسرت

میرے لئے وہ بڑے مصروف دن تھے۔ شہر کی اہم سماجی شخصیت ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے ادارے کے ہمراہ جشن آزادی کے حوالے سے منعقد کی جانے والی کئی تقریبات کے انعقاد کا انتظام کرنا تھا، شہر کی تزئین و آرائش کرنے والی کمیٹی کی میٹنگز میں شریک ہونا تھا۔ اہل وطن کو ناٹک شوز کے ذریعے اس خاص دن کی اہمیت کے حوالے سے احساس دلانا تھا کہ ہمارا اپنا وطن ہمارے لئے کتنی خوش نصیبی، راحت اور تسکین کا باعث ہے۔

میرا پیارا شہر دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ کہیں نہر میں خوبصورت تفریحی کشتیاں اور فلوٹ تیر رہے تھے تو کہیں سڑکوں پر سبز اور سفید جھنڈیاں اور بینر لہرا رہے تھے۔ خوشیوں کا گہوارہ میرا شہر، عظیم تھا، حسین تھا، میرا آنے والا کل میرا مستقبل تھا۔ یہ وہ شہر بے مثال تھا جہاں لوگوں کی امیدیں، آرزوئیں، کاوشیں اور خواہشیں جنم لے کر تکمیل کی منزلوں تک جاتی تھیں۔ میرا شہر خوابوں سے مہکتا اور زندگی سے دھڑکتا تھا۔ میں بڑی مصروف اور خوش تھی مگر ایسی مصروفیت میں میری ایک ذاتی نوع کی پریشانی بھی گھلی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے دھیان بار بار اس طرف جا رہا تھا۔

دراصل میں اپنی گزر بسر کے لئے اپنا ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر دیا کرتی تھی جس کی آمدن سے کچھ سہولت ہو جاتی تھی۔ اب کی بار تقریباً دو ماہ ہونے کو آئے تھے کہ کرایہ دار نہیں مل رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ کوئی کرایہ دار بھیج دے تاکہ کاروبار حیات چلتا رہے اور وقت نہ ہو مگر نہ جانے کیا بات تھی معاملہ کچھ تعطل کا شکار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ روز اپنے پراپرٹی ڈیلر

سے فون پر پوچھتی اور پھر امید افزا جواب نہ پا کر خاموش ہو جاتی تھی۔ دن پہ دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ایک روز پراپرٹی ڈیلر کا فون آ ہی گیا۔ اس نے بتایا کہ فیصل آباد کے کسی دیہات کے کے تین لڑکے گھر کرایہ پہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ لاہور کے کسی کالج میں طالب علم تھے اور کالج سے قریب ہی گھر انہیں مل رہا تھا اس لئے وہ مجھ سے مل کر بات کرنا چاہتے تھے۔

کرایہ دار لڑکوں نے مقررہ وقت پر آ کر کرایہ نامہ وغیرہ طے کیا۔ سیکیورٹی ادا کی اور چند ہی دنوں میں سامان لانے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔ دیہاتی سے دکھنے والے لڑکوں نے فرمائش کی کہ ان کے آنے سے پہلے گھر کو اچھی طرح صاف کروا دیا جائے اور خاص طور پر کیڑے مار سپرے چھڑکا یا جائے کیونکہ وہ کیڑے مکوڑے، کاکروچ اور چھپکلیوں وغیرہ کو بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے فیومی گیشن کمپنی والوں کو فون کیا اور پندرہ سو روپے خرچ کر کے ان سے کیڑے مار سپرے کرنے کو کہہ دیا۔ سوچا چلو صفائی پسند ہیں تو اچھا ہی ہے کم از کم گھر کو تو صاف رکھیں گے۔

پورشن دو تین ماہ سے خالی پڑا تھا اور اس کو کبھی کبھار کھولنے اور چیک کرنے کے دوران میں نے بھی اکا دکا کاکروچ دیکھ کر ناگواری ضرور محسوس کی تھی۔ اب نئے کرایہ داروں کی وجہ سے اچھی طرح صاف ہونے جا رہا تھا، یہ سوچ کر مجھے بھی تسلی سی ہو گئی۔

کمپنی والوں نے گھر کے اندر باہر، گلی کے آغاز سے اختتام تک جتنے بھی گٹر تھے ان میں کیڑے مار ادویات چھڑک دیں اور گھر کو چوبیس گھنٹے تک بند رکھنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔ سپرے ہوتے ہی ہزاروں کی تعداد میں کاکروچ اور دیگر کیڑے گٹروں سے ابل ابل کر باہر آنے لگے اور سارا گھر اور گلی لال لال کیڑوں سے بھر گئی۔ کیڑے یوں سرپٹ بھاگ رہے تھے جیسے کسی میراتھن ریس میں شریک ہونے جا رہے ہوں۔ گلی کے بچوں کو دلچسپ شغل ہاتھ آ گیا اور وہ خود کیڑوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر انہیں مزید تیز بھگانے لگے۔

نئے کرایہ داروں میں سے ایک لڑکا افضل ہاتھ میں سامان بھرا ایک کارٹن اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی اتنے سارے کاکروچ گلی میں بھاگتے دیکھے بدحواس ہو گیا اور اپنے

قدموں واپس بھاگنے لگا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر گلی کے بچے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے اور جوتیاں لے کر کاکروچوں کو مزید پیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ گلی کی عورتوں نے میری طرف شاکی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "سپرے کی بوناک میں گھس رہی ہے۔" دوپٹوں کے پلو چہرے پہ لپیٹ لئے۔

"آپ کو سپرے نہیں کروانا چاہتے تھا۔ اس طرح تو کاکروچ ساری گلی میں پھیل گئے ہیں۔"

"اپنے گھر کے کیڑے اندر ہی رکھیں۔ یہ تو ہمارے ہی گھروں میں گھستے چلے آ رہے ہیں۔"

عورتوں نے مجھ سے شکوہ کیا تو میں شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی سپرے کروانے سے تو یہ کیڑے گٹروں کی تاریک محفوظ دنیا سے باہر کی روشن پر خطر دنیا کی طرف نکل آئے تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔

"سوری نئے کرائے داروں نے ہی مجھے کہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا یہ ہو گا۔"

میں نے کمزور سی معذرت پیش کی اور دعا کرنے لگی۔

"یا اللہ یہ سارے کاکروچ جلد سے جلد واپس ان گٹروں میں چلے جائیں تاکہ محلے والوں کو تکلیف نہ ہو۔"

چند ہی دنوں میں نئے کرایہ دار شفٹ ہو گئے تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی طرف سے تو میں نے ان کے لئے جو وہ چاہتے تھے کر ہی دیا تھا۔ دس پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ مجھے اس پراپرٹی ڈیلر کا فون آ گیا جس نے ان لڑکوں کو کرایہ دار رکھوایا تھا۔

"ہاں جی بتائیں کیا بات ہے۔" میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"وہ جی لڑکے کافی پریشان ہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"باجی وہ کہتے ہیں کاکروچ بہت ہیں اور گھر میں سے بو بھی آتی ہے۔"

"کاکروچ؟ کاکروچوں کے لئے تو میں نے خاص طور پر سپرے کروایا تھا۔ انہیں پورا گھر صاف کروا کے دیا تھا۔ اب بو کیسے آ سکتی ہے؟ آخر وہاں پہلے بھی کرایہ دار رہتے رہے ہیں۔"

یہ کوئی پہلے کرائے دار تو نہیں ہیں، میں نے خفگی سے کہا۔

''بس باجی وہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں۔''

''بھئی آخر معاہدہ ہوا ہے۔ کرایہ نامہ، نوٹس، یہ سب ہوتا ہے ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں کمال ہے۔'' مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ یہ کس قسم کے کرایہ دار ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ محلے والوں نے بتایا کہ وہ کرایہ دار لڑکے کبھی گھر سے باہر نظر نہیں آتے تھے اور ہر وقت گھر میں ہی گھسے رہتے تھے۔

دو تین روز بعد میں نے اپنی بہن کو ساتھ لیا اور سوچا ذرا کرایہ داروں سے مل آؤں، پوچھوں تو سہی کہ کیا تکلیف ہوگئی ہے۔ انہیں! مجھے شہر سے باہر جانا تھا اور اب پھر سے کرایہ داروں کی الجھن پیدا ہونے والی تھی۔ بڑی مصیبت تھی، کئی بار سوچا اس نری بچ بچ سے تو بہتر ہے گھر کو بیچ ہی دوں مگر پھر بوجوہ اس ارادے کو ملتوی کر دیا۔

کرایہ دار لڑکوں نے متواتر کئی بار گھنٹی بجانے، دروازہ کھٹکھٹانے، آوازیں دینے کے بعد کھڑکی پہ لگی بلائنڈ کو تھوڑا سا ہٹایا اور کچھ توقف کے بعد دروازہ کھول دیا۔ اندر گھستے ہی ہمیں بو کے بھبکے نے پریشان کر دیا اور ہم ناک سکوڑتی ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''دیکھیں آنٹی کتنی بو ہے یہاں، ہم لوگ تو ایئر فریشنر سپرے کر کر کے تھک گئے ہیں اور کاکروچ بھی ختم نہیں ہوئے۔ رات کو زمین پہ سونا ہوتا ہے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''تو بھئی مار دیا کرو، میری بہن نے ہنس کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نہیں آنٹی وہ آسانی سے مرتے ہی کہاں ہیں؟ ہم لوگ ہر وقت ان پر کیڑے مار سپرے چھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ الٹے ہو جاتے ہیں، اوندھے پڑے رہتے ہیں مگر مرتے نہیں۔ اگر ان کو ذرا سا پلٹ دیں تو اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔'' ایک بولا

''یا اللہ اتنا تو میں نے کاکروچوں کی نقل و حرکت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔'' میں نے ہنس کر بات ٹالنا چاہی۔

''آنٹی یہ بڑی مضبوط نسل ہے۔ کہتے ہیں ایٹم بم کو بھی سروائیو کر سکتے ہیں۔'' دوسرے نے میری معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

''آپ لوگ کوڑا کرکٹ باہر نہیں پھینکتے؟ توبہ کس قدر گند ڈال رکھا ہے۔ کیڑے نہیں آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟ میری بہن بولی۔

ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اے سی اور ٹی وی غالباً چوبیس گھنٹے چلتے رہتے تھے۔ کھانوں کے بچے ہوئے ٹکڑے، اخبار، لفافے، خالی بوتلیں، ڈبے الا بلا دیکھ کر حیرت ہونے لگی۔ معاً سمجھ میں آنے لگا تھا۔ کئی قسم کے سپرے اور کھانوں سے مل کر ایک عجیب وغریب سی سڑانڈ پیدا ہو چکی تھی۔ کچن گندے برتنوں سے اٹا پڑا تھا۔ گھر کی ہر کھڑکی اور دروازہ بند تھا۔

''یہ آپ لوگوں نے گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ سارے گھر میں ہوا کا کہیں سے بھی گزر نہیں۔ بو تو ہونا ہی ہے۔ ایسے حالات میں کیڑوں کی تو موج ہوگئی ہوگی۔ آپ نے گھر اتنا بند کیوں رکھا ہوا ہے؟''

ہم نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بضد رہے کہ بو گھر میں ہے اور وہ اس کے ذمہ دار نہیں اور گھر کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔

''ہم جی گاؤں کی کھلی فضا میں رہنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں بند کمروں میں گھٹن ہوتی ہے اور دل گھبراتا ہے۔'' وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔ عجیب مخمصے میں پھنس چکی تھی میں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کرایہ داروں کا کیا کروں۔ روانگی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور گھر شاید پھر خالی ہونے والا تھا۔ کرایہ دار اتنے نازک طبع تھے مگر اپنے گھر کی صفائی سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کی بو کی شکایت اور کاکروچوں کا وہم ایک مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ آئے دن کبھی ان کا اور کبھی پراپرٹی ڈیلر کا فون آ جاتا کہ جی لڑکے بہت تنگ ہیں وہ آپ کا گھر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھی کہ اچھے بھلے گھر میں وہ کیڑے ڈال رہے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہاں اچھا خاصا ایک معقول ڈاکٹر چند ماہ گزار کر گیا تھا۔

ایک روز ہمسایوں کے ہاں سے ایک فون آیا اور مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ خاتون نے نروس آواز میں کہا۔ ''آنٹی جلدی آئیں، آپ کے کرایہ والے گھر میں پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ پولیس آئی ہوئی ہے۔''

میں الٹی سیدھی چپل پاؤں میں ڈال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یا اللہ خیر ہو۔ میں نے دل ہی دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ کرائے والا گھر گلی کے آخر میں تھا مگر وہاں تک پہنچنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ساری گلی میں پولیس ہی پولیس تھی۔ ہر طرف سائرن والی گاڑیاں، اسلحہ بردار پولیس والے اور سفید کپڑوں میں ملبوس لمبے چوڑے آدمی گشت کرتے نظر

آ رہے تھے۔ پولیس والوں نے سب ہمسایوں کو گھروں کے اندر گھس جانے کا اشارہ کر دیا اور خود بندوقیں لے کر گھر کے دروازے توڑنے شروع کر دیئے۔ میں سکتے کے عالم میں ایک ہمسائے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ چاہتی تھی کہ پولیس والوں سے کچھ کہوں مگر خاموش رہی۔

دیہاتی لڑکوں نے شاید اندر سے بیڈروم کا دروازہ بھی بند کر لیا تھا کیونکہ بعد میں وہ ٹوٹا ہوا ملا تھا مگر پولیس نے اپنا کام کر لیا تھا۔ وہ لڑکوں تک پہنچ چکے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کچھ سمجھ میں نہ آنے پر بندوق تانے ایک پولیس اہلکار سے سرگوشی میں پوچھا۔

"بی بی۔ یہ پولیس ریڈ ہو رہی ہے۔ یہ بہت بڑے ڈاکو تھے اور ہمیں ان کی ایک عرصے سے تلاش تھی۔ کئی قتل اور اغوا کیے ہوئے تھے انہوں نے۔ شکر کریں آپ کا محلہ بچ گیا۔

"ہائیں؟ ہائے اللہ۔" میرا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا۔ کتنے سیدھے سادھے اور بھولے بھالے دکھتے تھے وہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان مجرموں نے میرے ہی گھر میں کرایہ دار بننا تھا۔ مجھے قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہنسی آئی اور رونا بھی۔

پولیس والے چند ہی منٹوں میں ان کی مشکیں کس کے انہیں باہر لے آئے جہاں ساری گلی کے لوگ اپنی کھڑکیوں سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ عجیب ہیبت سی چھا گئی تھی چاروں طرف۔ لڑکوں کے منہ پر ٹیپ لگا کر اور پھر گھسیٹ کر پولیس کی گاڑی میں پھینکا جا رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پولیس والوں نے گھر میں سے سامان اٹھا اٹھا کر باہر گلی میں کھڑی ایک دوسری گاڑی میں لادنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنی کچھ چیزیں مثلاً چولہا، اے سی وغیرہ جاتے دیکھ کر احتجاج کرنا چاہا تو پولیس والے نے یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ "بی بی یہ وصولی ہوتی ہے ہمیں ان کا سامان مال خانے میں جمع کروانا ہے۔" سامان میں بہت سے چھینے ہوئے موبائل فون اسلحہ اور نہ جانے کیا کیا برآمد ہو رہا تھا۔ سارے محلے والے سکتے کے عالم میں خوفزدہ ہو کر اندر دبک گئے اور تھوڑی دیر میں پولیس کی گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

جب میں نے بعد میں چیک کیا تو گھر کی حالت دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ پولیس نے ان لڑکوں کو گرفتار کرنے کے لئے سارا گھر ہی توڑ پھوڑ دیا تھا اور اب نقصان کا خرچ اور ذمہ

داری ساری کی ساری مجھ پر آن پڑی تھی۔

اتنے سیدھے، چینڈ واور اپنے تئیں صفائی پسند لڑکے اتنی متعفن اور گھناؤنی زندگی گزار رہے تھے، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

چند ہفتوں بعد پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ایک فون آیا کہ آپ آئیں اور بطور مالک مکان پیش ہو کر ان کے بارے میں رپورٹ دیں اور انہیں شناخت کریں۔ میں تو اب ان لڑکوں کے کسی معاملے میں آنا نہیں چاہتی تھی مگر مجھے یقین دلوایا گیا کہ میرا ان کا آمنا سامنا نہ ہوگا۔ میں پردے میں رہوں گی اور وہ مجھے دیکھ نہ پائیں گے۔ چند مرد رشتہ داروں کے ہمراہ میں صبح کے وقت کوٹ لکھپت جیل پہنچی۔ خوبصورت چمکتی دھوپ میں بیڑیاں پہنے قیدی باغبانی میں مصروف نظر آئے تو بہت عجیب لگا۔ ہری ہری گھاس اور خوبصورت پھولوں کی کیاریوں میں کام کرنے والے کتنی بدصورت، محبوس و مجبور زندگی گزار رہے تھے۔ اگر انہوں نے غلط کام نہ کئے ہوتے وہ بھی نارمل لوگوں کی طرح کہیں تازہ، خوشنما پھولوں کے گلدستے سونگھتے، کسی اڑتی فاختہ اور کوکتی کوئل سے آباد باغ میں اپنی کسی ہم نفس کے ساتھ خوشیوں بھرے لمحوں سے جھولیاں بھر رہے ہوتے۔ سب کچھ اچھا اور ٹھیک ہوتا۔

گارڈ نے مجھے ایک کمرے کے باہر پہنچ کر رکنے کا اشارہ کیا اور خود کونے میں لگی ایک جالی دار کھڑکی میں بنے ایک ننھے سے سوراخ پر سے آہنی پلیٹ کو ذرا سا ہٹا کر مجھے اندر جھانکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اندر دوڑائی تو میرے تن بدن میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی اور جسم کانپنے لگا۔ ننھے سے سوراخ میں سے پہلی چیز جو مجھے محسوس ہوئی ایک بدبو کا بھبکا تھا جو اس حبس اور گرمی کی ماری ہوئی کال کوٹھڑی میں سے باہر آ رہا تھا۔ گندے میلے ننگے فرش پر تینوں لڑکے رسیوں سے بندھے اوندھے پڑے تھے۔ الٹے، بے بس اور ادھ موئے۔

''آپ انہیں سیدھا کیوں نہیں کر دیتے؟'' میرے دل میں ہلکا سا رحم کا جذبہ جاگا تو میں نے گارڈ سے سوال کیا۔

''میڈم انہیں سیدھا کر دیا تو یہ اپنی ٹانگیں چلانے لگیں گے اور پھر سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ دو بار پہلے بھی بھاگنے کی کوشش کر چکے ہیں یہ جی..... سالے کیڑے ..... بڑے خطرناک مجرم ہیں جی یہ.....کئی وارداتوں میں مطلوب تھے۔''

''ایک بار پھر سے دیکھ کر کنفرم کر دیں جی..... یہی تھے نا جنہوں نے آپ کا گھر کرایہ پہ لیا تھا؟'' دوسرے گارڈ نے پوچھا اور میں نے بادل نخواستہ ایک بار پھر اندر جھانکا، افضل کے بالکل قریب سے ایک چوہا گزرا اور اس نے روٹی کا ایک بچا ہوا ٹکڑا اچک لیا۔ سرسراتے ہوئے رینگتے ہوئے کئی لال بیگ چھوٹے چھوٹے تاریک سوراخوں میں سے آنے جانے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ تینوں مجرم آنکھیں بند کیے ہولے ہولے سسک رہے تھے۔ دکھ کی ایک ٹیس مجھے اپنے کلیجے میں اٹھتی محسوس ہوئی اور میں نے وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ شناخت کی کارروائی پوری ہو چکی تھی اور مجھ میں اب اور کچھ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ یوم آزادی کو گزرے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ شہر اپنے معمول پہ آ چکا تھا۔

میں ایک اونچے، نیلے پہ کھڑی شہر کو دیکھتی تھی۔ ہوا میں نہ تازگی تھی نہ پاکیزگی اور نہ خوشبو۔ ایک اداس سے تعفن نے ماحول پہ اپنی کالی چھایا ڈال رکھی تھی۔ سڑکوں پہ، گھروں میں، دفتروں، کھیت کھلیانوں میں استحصال، جرم، جہالت، غربت، کثرت آبادی کے لاتعداد کاکروچ مصروف عمل تھے۔ وہ شہر کو کھا رہے تھے، نوچ رہے تھے، کرید رہے تھے، کھنگال رہے تھے۔ اندر ہی اندر کھوکھلا اور کمزور بنا رہے تھے۔ میرے سیلن زدہ شہر میں خوف اور بے یقینی کی گھٹن اتنی تھی کہ سانس رکتا تھا۔ قدم قدم پر دھماکوں کے نغمے گونجتے اور خودکشیوں کے کانٹے دار پھول کھلتے تھے۔ سرخ ہجوم آگے ہی آگے کو رینگ رہا تھا اور منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جشن آزادی کا ایک بچا کچا سفید اور سبز پھریرا ابھی بھی کسی کھمبے سے چپکا ہوا لہرا رہا تھا حالانکہ یوم آزادی کو گزرے ہوئے بہت دن بیت چکے تھے۔

ٹوٹی ہوئی چھت

پھر ایک روز نہ جانے کیا ہوا، نذیر اچانک گھر آ گیا۔ اس وقت اس کی بہن شمیم حویلی کے بڑے سے صحن کو کسی نوجوان ملازمہ سے دھلوا رہی تھی اور پرانی ملازمہ ماسی اللہ رکھی پاس کھڑی اسے اچھی طرح صفائی کرنے کی ہدایتیں دے رہی تھی۔ شمیم کو پل بھر کے لئے تو یقین ہی نہیں آیا کہ اس کا پچیس سال سے گیا ہوا تقریباً گمشدہ بھائی یوں اچانک لوٹ آئے گا۔ دونوں بہن بھائی گلے ملے تو آنکھیں بے اختیار بہہ نکلیں اور سارا ماحول سوگوار ہو گیا۔ ''اتنے دنوں بعد آیا ہے، وفئے منہ تیرا تجھے اس تتری بہن، بیوی بچے، اور گاؤں کی کبھی نہ یاد آئی؟'' شمیم نے چھوٹے بھائی سے شکوے کرنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کا سر بھی پیار سے سہلاتی جا رہی تھی۔

''بس آپی، تجھے تو پتہ ہی ہے..... میں یہاں کیسے رہتا، میری مجبوری تھی۔''

''خواہ مخواہ کا وہم پالا ہے تو نے ساری عمر، بس اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔'' آپی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''وہم نہیں آپی۔ سوال ہے میرا..... جس نے تمام عمر جونک کی طرح میرا خون چوسا ہے۔ بچھو کی طرح مجھے ڈنک مارے ہیں۔ اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے مجھے اس نے، کانٹے کی طرح میرے سینے میں کھبا ہوا ہے وہ سوال۔ اس کے جواب کی تلاش ہے مجھے آپی۔ اگر مجھے وہ جواب نہ ملا تو میں سکون سے مر بھی نہ سکوں گا۔''

''ہائے ہائے مریں تیرے دشمن۔ کیوں منہ سے ایسی بات نکالتا ہے۔'' آپی نے اس

کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کروا دیا۔

''کتنی راتیں جاگا ہوں میں، کتنے دن کڑھ کڑھ کر گزارے ہیں، خوشیوں سے دور بھاگا ہوں اور اگر میرا سوال غلط ہے تو پھر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرنے کا بھی تو گناہ کیا ہے میں نے۔ سب کا ہی مجرم ہوں میں۔'' نذیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آپی اسے پیار سے تھپکتی رہی۔ نہ جانے کتنے برسوں کا لاوا آج اس کے اندر سے یوں پھوٹ کر باہر نکل رہا تھا۔

''جمیل کی ماں.....کہاں ہے وہ؟'' نذیر نے نظریں جھکائے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔ میرا مطلب ہے.....اس کمرے میں۔'' آپی نے دائیں ہاتھ پہ پڑنے والے حویلی کے سب سے خوبصورت، کشادہ اور پرآسائش کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ نذیر نے سوالیہ نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں وہی..... اباجی کا کمرہ.....'' بہن نے اس کی آنکھوں میں ابھرتے سوال کو دیکھ کر جواب دیا۔

''جب سے بڑے چودھری صاحب فوت ہوئے ہیں نا تو زہرہ بی بی تب سے ان ہی کے کمرے میں رہتی ہیں۔'' ماسی بول پڑی۔

''اچھا ہی ہے نا۔ خالی ہی پڑا رہتا تھا اس نے آباد ہو گیا۔'' شمیم نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں''..... نذیر نے ہنکارا ابھرا..... اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی اور قدم اباجی کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ آپی شمیم اور ماسی اللہ رکھی بھی ساتھ ہو لیں۔ ایک عرصے کے بعد وہ اس کمرے میں قدم رکھنے جا رہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

نذیر نے کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اباجی کی بہت بڑی قد آدم تصویر جو انہوں نے کسی انگریز فوٹو گرافر سے 1940ء میں کھنچوائی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے والی دیوار کے ایک لمبے سے حصے پہ ابھی تک اسی طرح لگی ہوئی تھی جیسے اباجی نے اسے لگوایا تھا۔ ایک عرصے بعد اس نے اس تصویر پر ایک گہری نظر ڈالی۔ کتنے وجیہہ تھے اس کے اباجی۔ کیسی بارعب اور دبدبے والی شخصیت تھی ان کی۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی ذہین آنکھیں، گھونگریالے بال، ستواں ناک، بھرے بھرے قدرے موٹے ہونٹ۔ وہ خود تو بالکل بھی ان پر نہیں گیا تھا۔ اس کی شکل اپنی ماں

جیسی تھی۔ گورا رنگ، مہین نقش، ہلکی سی بلی آنکھیں، جن کی وجہ سے اس کی وڈی بے بے اسے اکثر "میرا بلا" کہہ کر پیار کیا کرتی تھیں۔

نذیر کو ایک دم اپنی ماں اور ساتھ ہی چھوٹی بے بے بھی یاد آ گئی۔ کتنی فرشتہ صفت تھیں وہ دونوں سوکنیں جو ایک دوسرے سے بہنوں سے بڑھ کر محبت کرتی تھیں۔ اب دونوں منوں مٹی کے نیچے سو رہی ہوں گی۔ اب تو ان دونوں کو بھی چین نصیب ہو ہی گیا ہوگا۔ زندگی میں تو اباجی نے ان دونوں کو ڈھنگ سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا۔ جاہل، بدھی اور بیوقوف کہہ کر ان کا مذاق بھی اڑا لیا کرتے تھے۔ نذیر کے کلیجے میں اک ٹیس سی اٹھی اور آنسو اس کی پلکوں سے نیچے اتر آئے۔

"زہرہ بھابی، زہرہ..... دیکھ تو سہی کون آیا ہے؟ ہماری حویلی کے مالک..... چھوٹے چودھری صاحب..... میرا ویر نذیر واپس آ گیا ہے....." شمیم نے زہرہ کا چہرہ نذیر کی طرف گھما کر اسے اطلاع دی۔ اسے دل ہی دل میں خیال آیا شاید برسوں بعد لوٹنے والے پردیسی کو دیکھ کر اس کملی نمانی کو ہوش ہی آ جائے..... یہ گھر دوبارہ سے بس جائے..... شاید زہرہ نذیر کو دیکھ کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئے مگر وہاں تو ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ زہرہ نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر نذیر کی طرف نہیں دیکھا۔ شمیم کی بات کو مکمل طور پر نظرانداز کیے منہ دیوار کی طرف کیے بیٹھی رہی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟ بہری ہو گئی ہے؟ سنتی کیوں نہیں؟" نذیر غصے سے بولا۔

"نہیں پتر نذیر خیری صلا..... چھوٹی چودھرانی جی بہری کیوں ہونے لگیں، کان تو بالکل ٹھیک ہیں ان کے..... کبوتروں چڑیوں کی آوازیں سن کر تو ضرور انہیں دیکھتی ہیں۔" ماسی اللہ رکھی نے پیار سے نذیر کا کندھا تھپتھپایا۔ عین اسی وقت پھڑ پھڑاہٹ کی ہلکی سی آواز آئی تو زہرہ نے فوراً سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نذیر کی آنکھوں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت اور افسوس ہوا کہ اباجی کے شاندار، باوقار کمرے کی چھت کے گنبد میں اب دو چار فٹ کا ایک سوراخ ہو چکا تھا جس میں سے نیلا نیلا آسمان اندر جھانک رہا تھا اور چڑیاں اور کبوتر آزادانہ اندر آ جا رہے تھے۔

"چھت میں سوراخ ہو گیا ہے؟" نذیر نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تو آ گیا ہے نا تو بس حویلی کی دیکھ بھال کر اور سنبھال اپنی جائیدادیں..... میں اور میرے بال بچے کہاں تک

تیرے حصے کا بھی کام سنبھالیں اور تیرے بہنوئی جی کو تو ایسے کاموں میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ سارا دن بیٹھے بس اخبار پڑھتے یا ریڈیو سنتے رہتے ہیں۔" آپی شمیم نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟" نذیر نے زہرہ کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"لکھا تو تھا تجھے..... خط میں..... کہ بیمار ہو گئی ہے۔" آپی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"مجھے نہیں ملا کوئی خط وط۔" نذیر بیزاری سے بولا۔

"تجھے کیوں ملنے لگا۔ تو نے کبھی اپنا پکا پتہ دیا ہو تو پھر ملے نا۔ اتنے سال ولایت میں رہا کبھی کہاں کبھی کہاں..... کبھی کبھار تیرا بھولا بھٹکا خط آ جاتا تھا تو ہم تو ضرور جواب دے دیا کرتے تھے۔ اب تو خود ہی غائب ہو جائے تو ہم کیا کر سکتے تھے؟"

"کیا بیماری ہے اسے؟" نذیر نے پھر زہرہ کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔

"بیچاری کا دماغ....." آپی نے بات بیچ میں چھوڑ دی۔

"کسی کو پہچانتی ہی نہیں زہرہ بی بی۔ لاکھ بتاتی ہوں کہ بی بی میں اللہ رکھی ہوں..... پھر بھول جاتی ہیں۔ بس بنت بن کر ہواؤں میں دیکھتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھار اپنے آپ سے بڑبڑانے لگتی ہیں اور کبھی مہینوں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔" رکھی نے بولنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹروں نے بتایا ہے انہیں نسیان کی بیماری ہے اسی لیے یہ ہر بات بھول چکی ہیں۔" آپی نے پیار سے زہرہ کے ماتھے پہ آئی ہوئی لٹ سنوار دی۔

"ہر بات بھول چکی ہے، واہ یہ اچھی رہی۔" نذیر بڑبڑا کر اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

نذیر گھر واپس تو آ گیا تھا مگر چین اسے پھر بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ زہرہ کی ذہنی حالت دیکھ کر اس کا دل کڑھتا اور کنپٹیاں غصے سے جلنے لگتیں۔ "ذلیل عورت اب ہر چیز اور ہر بات سے ہی غافل ہو گئی ہے۔ جب میرا اس سے سوال کرنے کا وقت آیا تو اس نے ہوش ہی کھو دیے ہیں۔ اب اس مٹی کے تودے سے میں کیا اور کیسے پوچھوں؟ کس کس بات کا حساب لوں؟ کون کون سے کھاتے کھلواؤں۔ مجھے بس کچھ زیادہ نہیں تو ایک سوال کا جواب تو دے دیتی۔ جمیل کے بارے

میں حقیقت بتا دیتی تو میں خاموش ہو جاتا لیکن جاننا تو میرا حق تھا اور ہے..... کیا میں کبھی سچ نہ جان سکوں گا؟ یا اللہ یہ کیسی سزا ہے؟" نذیر زہرہ کے سامنے بیٹھ کر دل ہی دل میں اس سے سوال کرتا اور ایک خاموش بے نیاز، بے پروا، بے حس انسان کے سامنے خود کو بے بس پا کر تلملاتا رہتا۔

زہرہ کا مرض اب اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اسے نہ آئے گئے کی خبر تھی نہ رات دن کا شعور، نہ سال مہینے کا علم۔ اس سے بات کرو تو آگاہی اور شناسائی کی کوئی شبیہہ اس کی آنکھ میں نہ لہراتی۔ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر چکی تھی، حال کی کچھ خبر نہ تھی نہ ہی مستقبل کی کوئی پرواہ۔ وقت بہت بدل چکا تھا، زندگی کی بساط پر بھی مہرے اپنی اپنی جگہ سے ہٹ چکے تھے۔

وہ بھی کیا دن تھے حویلی رونقوں اور روشنیوں سے ہر دم جگمگاتی تھی۔ نذیر نے حسرت سے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"کیا بتاؤں چودھری صاحب۔" ایک روز ماسی اللہ رکھی حویلی کے دکھ پھولنے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

آپ تو اب آئے ہو اتنے بہت سالوں بعد۔ میں اور شمیم بی بی کئی بار بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ شمیم بی بی بے چاری اپنا گھر بار چھوڑ کر بار بار آ بھی نہیں سکتی۔ مجھے تو کتنے ہی مہینے اور سال گزر جاتے ہیں حویلی سے باہر نکلے ہوئے۔ اب تو باہر کی دنیا جیسے بھولتی ہی جا رہی ہے۔ ساری حویلی بان بان کرتی ہے۔ میں اور چودھرانی زہرہ اور کوئی اکا دکا ماسی ہوتا ہے یہاں۔ شکر ہے آپ واپس آ گئے ہو۔ اب خیر سے جمیل پتر بھی آ جائے تو بس رب کا شکر مناؤں اور اپنی آنکھیں میٹ لوں۔ مجھے اس دنیا سے اب اور کچھ نہیں چاہئے۔"

ماسی نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"وہ کہاں ہے؟" نذیر نے آہستگی سے پوچھا۔

"کون؟" ماسی حیرت سے بولی۔

"جمیل۔ نظر نہیں آیا جب سے میں آیا ہوں۔" نذیر دھیمے لہجے میں بولا۔

"چودھری صاحب آپ کو شمیم بی بی نے بتایا نہیں؟ وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں۔" ماسی نے افسردہ ہو کر بتایا۔

"یہاں نہیں ہے، کیا مطلب؟"

''لو آپ کو نہیں بتایا کسی نے، اسے بھی ولایت گئے ہوئے سات سال ہو گئے ہیں۔ وہ تو جب سے گیا ہے مڑ کے آیا ہی نہیں۔'' ماسی نے اسے اطلاع دی۔

''اچھا؟'' نذیر حیران ہو گیا۔

''آپی شمیم، جمیل لندن میں ہے؟ ماسی نے مجھے بتایا ہے۔'' نذیر نے فوراً بہن کو فون گھمایا۔ اس کا تو خیال تھا شاید کہیں ایک دو دن کے لئے گیا ہو گا آ ہی جائے گا بلکہ وہ تو دل ہی دل میں سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ اتنے سالوں بعد جمیل سے آنکھ کیسے ملائے گا، کیا کہے گا اسے مگر وہ تو وہاں وہاں تھا ہی نہیں۔

''ہاں میرے ویر۔ بے چاری بھابی زہرہ کی قسمت میں اپنوں کی جدائیاں ہی لکھی ہوئی ہیں۔ جمیل پڑھنے کے لئے چار پانچ سالوں کا کہہ کر آپ کے لندن چلا گیا تھا مگر پھر وہاں جا کر پھنس گیا۔ خط آتے ہیں، ہر بار لکھتا ہے شہریت ہو جانے کے بعد ہی واپس آ سکوں گا۔''

نذیر کو ایک لمحے کے لئے زہرہ پر ترس سا آ گیا..... بیٹا بھی پاس نہ رہا۔ دور ہو گیا۔ آخر اکیلی رہ جانے پر ہوش تو گم ہونے ہی تھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ اس ساری الٹ پلٹ کی وہ خود ہی تو ذمہ دار تھی۔

تقدیر کے اس ناانصاف کھیل کی بساط میں شطرنج کے مہرے کی طرح تو وہ ہی پٹتا رہا ہے۔ مظلوم تو وہ تھا۔ زہرہ کسی ہمدردی کی قابل کہاں تھی، اس کے دل نے فیصلہ سنا کر اسے مطمئن کر دیا۔ کاش زہرہ ہمارے خاندان میں بیاہ کر ہی نہ آئی ہوتی تو آج ہم سب کی تقدیر کتنی مختلف ہوتی۔ حالات ایسے تو نہ ہوتے۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔

اسے اب بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جس روز زہرہ اس کے بھائی شبیر کی دلہن بن کر پہلی بار اس حویلی میں آئی تھی۔ شبیر بھائی کو پرانی ٹی بی تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا مگر چھوٹی اور بڑی بے بے دونوں کا خیال تھا کہ اسے اس دنیا سے رخصت ہو جانے سے پہلے خوش ہونے کا موقع ضرور دینا چاہئے۔ دونوں میں سوکنیں ہونے کے باوجود بہت اکا اور محبت تھی اس لئے جب دونوں نے مل کر چودھری صاحب سے کہا، منت سماجت کر کے اپنی بات منوالی تو وہ بھی بیٹے کی محبت کے خیال سے اپنی دونوں بیویوں کی طرح ہی سوچنے لگے۔

زہرہ اپنی ماں نیتاں کے ساتھ ان کے ہاں گوبر کے اپلے دینے حویلی آتی رہتی تھی۔

غریب تھی تو کیا ہوا، شکل وصورت کی تو اچھی تھی۔ زہرو کی ماں نے اپنی بیوگی اور غربت دیکھی اور پھر فسی خوشی اپنی جوان چنچل، ہر دم گلاب کی طرح کھلی رہنے والی بیٹی حویلی والوں کو دے دی۔ دولہا جیسا بھی تھا، تھا تو گاؤں کا چودھری اور یہ بات کچھ کم نہ تھی اور پھر اللہ جسے چاہے صحت دے جسے چاہے آزمائش۔ یہ تو اس ذات پاک کی مرضی ہے' کیا پتہ وہ شادی کے بعد صحت مند ہی ہو جائے۔ اس نے سوچا۔

''میں نے تو بس سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔'' زہرو کی ماں نے رشتہ داروں کو جواب دے کر مطمئن کر دیا اور خود بیٹی کی خوش بختی کے لئے دعائیں کرنے لگی۔

نذیر اور شبیر کے والد چودھری سلطان کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ دو بیویاں، دو بیٹے اور ایک نیک سعادت مند بیٹی شمیم۔ کئی سو مربعے زمین اور پھلوں کے لہلہاتے باغ۔ چار ذاتی کنوئیں اور شاندار رہائشی حویلی' بس ایک ذرا شبیر کو صحت بھی دے دیتا تو اس کی ذات سے کوئی شکایت نہ ہوتی مگر پھر بھی رب کے احسانوں پہ شاکر تھے۔ بیٹے کی صحت کے لئے دعائیں مانگتے، ان کے ہاتھ نہ تھکتے تھے۔

زہرو کی شکل میں بڑی اچھی بہو نصیب ہوئی تھی۔ کیسی پاکیزہ روح تھی اس کی کہ جس نے شوہر کی خدمت کے سوا کبھی اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا وہ نہ کبھی دلہنوں والے خوبصورت ریشمی کپڑے پہنتی، نہ بناؤ سنگھار کرتی اور نہ زیورات تن سے لگاتی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس بس شوہر کے پلنگ کی پٹی سے لگی رہتی اور مصلے پہ بیٹھی اس کی صحت کی دعائیں مانگتی رہتی۔ افسوس کہ وہ اپنے سہاگ کو موت کے بڑھتے ہوئے بے رحم پنجوں سے چھڑا نہ سکی اور بالآخر شبیر اسے چند ماہ کی بے لطف رفاقت کے بعد تنہا چھوڑ ہی گیا۔

دونوں چودھرانیاں اپنی جوان بیوہ بہو کو بے ترتیب بالوں، معمولی کپڑوں میں دیکھتیں تو ان کا دل کٹ کے رہ جاتا۔ اس کا اب حویلی میں کوئی کام باقی نہ رہا تھا۔ سارا دن ادھر سے ادھر ڈانواں ڈول پھرتی رہتی یا گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ حویلی میں رہنے والی بے وقعت، ناقابل توجہ، غیر اہم عورتوں کے ہجوم میں ایک اور عدد کا اضافہ کر دینے کے علاوہ وہ بھی کچھ اور نہ نظر آتی تھی۔ اس کا اداس چہرہ اکثر متفکر اور پریشان نظر آتا۔ آنکھوں میں گھلی بے بسی کی کیفیت کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہتی۔ کئی کئی دن تو اسے کوئی نام لے کر بھی نہ پکارتا' نہ ہی اس سے بات کرتا۔ وہ

چھوٹی چودھرانی تو بن چکی تھی مگر اس کے ہاتھوں میں نہ کوئی راج پاٹ آیا تھا نہ ہی زور اختیار۔

پھر ایک روز نہ جانے کیا ہوا۔ زہرہ کی زندگی نے ایک دم سے جیسے پلٹا کھایا۔ بڑے چودھری صاحب کو اچانک خیال آیا کہ بہو رانی کے ساتھ کچھ انصاف نہیں ہوا۔ حویلی میں داخل ہوئے تو زمین پہ بیٹھی دال بینتی ہوئی نوجوان خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پل بھر کو چونکے اور پھر جیسے سوچنے لگے کہ یہ لڑکی کون ہے؟

زہرہ نے ان کی موجودگی محسوس کرتے ہی حسب معمول فوراً سر پہ دوپٹہ ڈال کر آدھا گھونگھٹ کاڑھ لیا اور سلام کر کے مودبانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔

''زہرہ..... یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے؟ کیا بڑے گھر کی بہوئیں ایسی ہوتی ہیں؟ آخر تم ہماری عزت ہو، اور تم دونوں؟'' چودھری صاحب نے دونوں بیویوں کو غصے سے مخاطب کیا جو لسی میں سے مکھن کے پیڑے نکلوا نکلوا کر پتیلی میں سجا رہی تھیں۔ ''تم دونوں کو عقل ہے یا نہیں؟ بڑی چودھرانیاں بنی بیٹھی ہو۔ دیکھا نہیں اس لڑکی نے کیا حال بنایا ہوا ہے؟ خیال نہیں آیا کہ اس بالڑی کو بھی اچھا کھانے پینے، سجنے سنورنے کی ضرورت ہے۔ بیوہ ہو گئی تو کیا ہوا، کیا یہ انسان نہیں ہے؟'' چودھری صاحب گرجے۔ ''اس کا بھی کوئی حق بنتا ہے آخر۔''

''جی چودھری صاحب۔'' دونوں چودھرانیوں کی ڈر کے مارے جان ہی نکل گئی۔

''او کوئی خدا کا خوف کرو۔ آخر رب تعالیٰ کو کیا جواب دو گی؟ یہ لڑکی اب ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو..... سنا؟'' چودھری صاحب تیز تیز قدم رکھتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور زہرہ ہڑبڑا کر انہیں تکتی رہ گئی۔ چودھری صاحب اتنے نرم دل انسان تھے۔ اسے تو اندازہ ہی نہ تھا۔ سب ان کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے ان سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے۔ گھر میں وہ کسی سے بے تکلف ہی نہ تھے۔ مگر آج تو اس نے ان کا ایک اور ہی روپ دیکھا تھا۔

اس روز چودھری صاحب فصلوں کی کٹائی کا جائزہ لینے کے بعد گھر پہنچے تو تھکن اور گرمی سے ان کا برا حال تھا۔

''زینت۔ ہاجرہ۔'' انہوں نے حسب معمول دونوں بیویوں کو اکٹھے آواز دی۔

''جی سلام علیکم چودھری صاحب۔ کھانا بھجوائیں جی؟'' دونوں فرمانبردار عورتیں تقریباً بیک زبان بولیں۔ ''ہاں جلدی کرو۔ انہوں نے مختصر جواب دیا۔ اسی لیے ہاتھ منہ دھلانے کے

لئے رحمت بابا تسلا اور لوٹا لے کر آ گیا۔ چودھری صاحب نے ہاتھ منہ دھو کر تولیے سے پونچھ دیئے۔ پنکھے والے سے کہو فوراً پنکھا کھینچنا شروع کر دے۔" انہوں نے گامے کو اٹھتے دیکھ کر ہدایت کی اور خود جوتے اتار کر بستر پہ نیم دراز ہو کر کھانے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ او نگھنے ہی والے تھے کہ چوڑیوں کی کھنک نے انہیں اچانک چوکنا کر دیا۔ جق کے پیچھے سے نمودار ہونے والی آدھے چہرے پر گھونگھٹ کاڑھے لڑکی کو دیکھا تو انہیں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ نئے جھلمل کرتے جوڑے میں ملبوس زہرہ انگوٹھیوں سے سجے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھامے دھیرے دھیرے نپے تلے قدم رکھتی اندر آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں دلکش آویزے جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں کاجل کی سیاہ لکیر اور ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی سرخی نے اس کے حسن کو ایسے نمایاں کر دیا تھا کہ اس پر سے نظر ہٹانا ممکن نہ رہا تھا۔

چودھری صاحب کا دل تو جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیا یہ وہی اللہ ماری حرماں نصیب بیوہ تھی جوان کے گھر کے آنگن میں پیڑھی پر بیٹھی گھر کے معمولی کام کاج کرتی نظر آتی تھی یا کوئی آسمانی مخلوق جو اس تپتی دوپہر میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر کھانا لئے چلی آئی تھی؟ دونوں چودھرانیاں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی آ گئیں۔ "کریلے گوشت ہیں، زہرہ نے ہی پکائے ہیں۔ ماشاءاللہ نوں رانی اب کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ ہے نا جی۔" دونوں بیویوں نے اپنے کارنامے یعنی زہرہ کو خوبصورت کپڑے پہنانے، سجانے، سنوارنے پہ شوہر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ چودھری صاحب مسکرائے، چودھرانیوں کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کتنے عرصے بعد تو آج مسکرائے تھے چودھری صاحب۔

"شکر ہے کبھی تم دونوں نے میری بھی کوئی بات مانی، ورنہ تم لوگ تو ہمیشہ اپنی ہی مرضی کرتی ہو۔" چودھری صاحب صاف جھوٹ بول گئے حالانکہ انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ ان کی بیویوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ ان کے خلاف مرضی کوئی بات کریں۔

"میں سوچ رہا ہوں آج تم سب لوگ میرے ساتھ ہی کیوں نہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیتیں؟ اکٹھے بیٹھ کر کھانے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔" چودھری صاحب نے زہرہ کو کھانا وہاں رکھ کر طشت اٹھا کر باہر جاتے دیکھ کر کہا۔ زہرہ کی زیر لب مسکراہٹ آدھے گھونگھٹ میں چھپے چہرے سے بھی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ "ہم سارے یہاں بیٹھ کر کھالیں؟" بڑی چودھرانیوں

کو اپنے نصیبے پہ یقین نہیں آیا۔ "ہاں ہاں بھئی؟ کہہ تو دیا ہے۔" چودھری صاحب نے سر ہلایا۔

دونوں چودھرانیاں پلنگ پہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ زہرہ کو بھی انہوں نے ہاتھ پکڑ کر پاس ہی بٹھالیا اور سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

چودھرانیاں ایک عرصے بعد اپنے چودھری صاحب کے ساتھ بیٹھی تھیں جس کی وجہ سے خوشی سے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ چودھری صاحب بھی خوب چہکے، ہنسے بولے، چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ بڑے زور کی محفل جمی۔

اس کے بعد سے چودھری صاحب کے حکم پر ان کا کھانا خصوصی طور پر زہرہ ہی پکانے اور لانے لگی۔ دونوں چودھرانیاں سمجھنے لگی تھیں کہ اب وہ روز ہی ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں گی مگر جیسے ہی وہ آتیں چودھری صاحب کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں وہاں سے بھیج دیتے۔ زہرہ بنی ٹھنی ان کے سامنے بیٹھی چھوٹے چھوٹے لقمے توڑتی۔ ان سے معصوم معصوم باتیں کرتی تو چودھری صاحب کھانا بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگ جاتے۔ چپ چاپ سی زہرہ اب ان کی موجودگی میں دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھی۔ انہیں کوئی چھوٹا موٹا گھریلو واقعہ سنانے بیٹھ جاتی تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے اور اس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ کر کہتے "کتنی معصوم ہے تو زہرہ!" اس پر زہرہ کی جھکی جھکی نظریں پل بھر کو اوپر اٹھتیں اور پھر شرم سے فوراً جھک جاتیں۔ چودھری صاحب کے دل میں عجیب سی کھدبد ہونے لگتی۔

چھ جماعتیں پاس زہرہ کافی سمجھدار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے چودھری صاحب کو اب ایسے ایسے مشورے دینے شروع کر دیے تھے کہ وہ اس کی علمیت اور برتر سوجھ بوجھ کے قائل ہو کر رہ گئے۔ کبھی وہ ان کے ساتھ مل کر زمینوں کے کھاتے دیکھتی تو کبھی فصلوں اور باغوں کی سالانہ آمدن بڑھانے کے لئے مفید مشورے دیتی۔ کبھی مزارعوں کے کان کھینچتی اور کبھی منشی کی خبر لیتی تو چودھری صاحب حیران ہو جاتے اور ان کے روئیں روئیں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کتنی لائق تھی وہ، انہیں یقین نہ آتا۔ اب وہ اپنی دونوں بیویوں کو بات بات پر جاہل اور ان پڑھ ہونے کے طعنے بھی کچھ زیادہ ہی دینے لگے تھے۔ زہرہ حویلی کی اہم ترین ہستی بنتی چلی جا رہی تھی جس پر دونوں چودھرانیوں کو حیرت سے زیادہ تکلیف ہوتی تھی مگر وہ بے بس تھیں۔ چودھری صاحب کی منظورِ نظر کے خلاف کوئی بات کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی۔

ایف اے پاس کرتے ہی چودھری صاحب کے چھوٹے بیٹے نے شہر کے بڑے کالج میں جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر چودھری صاحب کو یہ ہرگز قبول نہ تھا وہ چاہتے تھے وہ ان کا فرزند ہونے کے ناطے ان کی زمینوں، باغات، کنوؤں کی دیکھ بھال کرے، ان کی ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹائے لہٰذا انہوں نے اسے سختی سے منع کر دیا اور نذیر دل ہی دل میں شہر جا کر پڑھنے اور گاؤں سے دور جانے کی خواہش پوری نہ ہونے پہ کڑھنے لگا مگر باپ کے آگے زبان کھولنے کی اس میں ہمت نہ تھی لہٰذا کچھ کر نہ سکا۔

سبھی دیکھ رہے تھے کہ چودھری صاحب زہرہ کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے، جوتے اور زیورات منگوائے جاتے جنہیں پہن کر وہ چھم چھم کرتی بجلیاں گراتی حویلی کی سیڑھیاں اترتی تو سارے گھر میں ایک رونق سی آ جاتی۔ چودھری صاحب باہر کے کام دھندے نمٹا کر جب حویلی میں گھستے تو سب سے پہلے زہرہ کو ہی پکارتے۔ سامنے نظر نہ آتی تو بے چین ہو جاتے۔ نظر آ جاتی تو انہیں جیسے چین سا نصیب ہو جاتا۔ زہرہ اپنے نصیبے پہ حیران ہوتی رہتی کہ اس کے دن کیسے پھر گئے تھے؟ کہاں وہ بیوگی کے مردہ سے دن اور کہاں یہ دلچسپ شب و روز۔ آہستہ آہستہ اسے اپنے جوان شوہر کی موت کا غم بھی بھولنے لگا تھا جسے اس نے صرف کھانستے اور کراہتے ہی سنا تھا۔ اس کے ساتھ نہ اس کی کبھی پیار بھری دوستی ہوئی نہ ہی دل میں گدگدی کرنے والا میٹھی میٹھی باتوں والا رسیلا رشتہ قائم ہوا۔

گرمیوں کی تپتی دوپہریں کاٹنے کے لئے چودھری صاحب نے حویلی کے زیریں حصے میں ایک کشادہ تہہ خانہ بنا رکھا تھا جو کافی ٹھنڈا رہتا تھا۔ آنے والی گرمیوں میں زہرہ کے مشورے پر چودھری صاحب نے اس میں برف کی سلیں ڈلوا کر اسے مزید ٹھنڈا کرنا شروع کیا تو زندگی بہت آسان ہو گئی۔ زہرہ دن چڑھتے ہی اپنی نگرانی میں یہ سارا کام کروانے لگ جاتی تو دوپہر کو چودھری صاحب کے گھر لوٹنے تک وہ بہت آرام دہ ہو جاتا۔ چودھری صاحب لمبا سا قیلولہ کرنے کے بعد ہشاش بشاش اٹھتے تو ساری حویلی کا ماحول خوشگوار ہو جاتا۔

ایک روز چھوٹے تیے کے نرگسی کوفتوں کا ڈونگا آگے بڑھاتے ہوئے زہرہ کے ہاتھ چودھری صاحب کے ہاتھوں سے اچانک چھو گئے۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا ٹکرائی۔ کتنی تپش تھی ان کے لمس میں۔ چودھری

صاحب نے بھی شاید اس لمحے کی حدت کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ وہ اچانک کچھ کھو سے گئے تھے۔ زہرہ کو یاد آیا شبیر کبھی کبھار ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لیتا تو لگتا جیسے کسی مردہ چھپکلی نے چھو لیا ہو۔ پسینے کی بوندوں سے زہرہ کا ماتھا چمکنے لگا۔

''کتنی گرمی ہو رہی ہے۔'' اس نے ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر جلدی جلدی جھلنا شروع کر دیا۔

''زہرہ تجھے گرمی لگتی ہے تو تو بھی دوپہر کو نیچے تہہ خانے میں ہی آ جایا کر۔ ٹھنڈا ہوتا ہے تو دوپہر آرام اور سکون سے کٹ جاتی ہے۔ چودھری صاحب نے اسے پیشکش کی۔ زہرہ نے آدھے چہرے کے گھونگھٹ سے انہیں گہری سیاہ کجلے بھری آنکھوں سے یوں دیکھا کہ چودھری صاحب کے ہاتھ سے نرگسی کوفتوں کی قاب گرتے گرتے بچی۔ وہ جلدی جلدی لقمے نگلنے لگے اور زہرہ ان کے گلاس میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بھرنے لگی۔

اب زہرہ کی دوپہریں چودھری صاحب کے ساتھ ہی نیچے تہ خانے میں گزرنے لگیں اور دونوں چودھرانیاں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔

''میں کچھ دن کے لئے اماں کے ہاں چلی جاؤں چودھری صاحب؟ وہ تائی آ کر بتا گئی ہے کہ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ایک دن زہرہ نے ان سے فرمانبردار لہجے میں پوچھا۔ اس وقت دونوں چودھرانیاں قریب ہی تھیں۔ بڑی صحن میں بچھی چارپائیوں پہ بکھرے چاولوں کو بلدی لگوا رہی تھی اور دوسری بادام پستے کی بوری کھلوا کر نوکروں، رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے لئے حصے کروا رہی تھی۔ چودھری صاحب زہرہ کی بات سن کر یوں چونکے جیسے کچی نیند سے جاگ گئے ہوں۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولے

''ہاں ہو آؤ آٹھ دس دن کے لئے!''

''نوں رانی تو جتنے دن چاہے ماں کے گھر رہ آ۔ آخر اس بے چاری کا بھی تجھ پر کوئی حق ہے۔ یہاں کون سا تیرا کوئی کام پڑا ہے؟ ہائے ہائے میرا پتر شبیر ہی نہ رہا تو اب تجھ نمانی کا کیا ہے۔ جہاں مرضی رہے۔ اب تو زندگی کے دن ہی کاٹنے ہیں تو نے۔'' وڈی چودھرانی نے بھیگی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ دوسری نے بھی بڑی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب تو چاہے میکے میں ہی بیٹھ رہ۔'' یہاں کون سا تیرا خصم بیٹھا ہے۔ سر کا سائیں نہ رہے تو زنانی کا کیا ہے۔ نہ گھر نہ ٹھکانہ......''

"کیا مطلب ہے تم لوگوں کا؟ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو تم دونوں؟ اس کا گھر اب یہی ہے۔ ہم ہی اسے بیاہ کر لائے تھے تو اب اسے اور کہاں بھیج دیں؟ مت بھولو کہ یہ اب ہماری ہی ذمہ داری ہے۔" زہرہ تم ڈرائیور سے کہنا تمہیں صبح چھوڑ آئے اور ماں کی خبر گیری کرنے کے بعد سیدھی اپنے گھر واپس آؤ۔ سمجھیں؟" چودھری صاحب نے بارعب لہجے میں اپنی رعایا سے خطاب کیا اور زہرہ کو ایک تنبیہی نگاہ سے نوازتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

زہرہ کی ماں کتنی بیمار تھی، زہرہ کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ شاید اس کے سانس بیٹی کے انتظار میں ہی رکے ہوئے تھے۔ چند دن بیٹی کی سوہنی شکل دیکھنے اور اس کی محبت بھری خدمت کا لطف اٹھانے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موند لیں تو روتی کرلاتی زہرہ واپس حویلی چلی آئی۔ چودھرانیوں، نوکرانیوں، شمیم، نذیر سبھی نے اس سے دلی افسوس کا اظہار کیا اور صبر کی تلقین کی۔ بڑے چودھری صاحب اب اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگے۔ بات بے بات اسے اپنے پاس بلا بھیجتے۔ حال چال پوچھتے۔ سب سے اس کا خیال رکھنے کو کہتے۔ اب وہ بالکل ہی ان کی آنکھ کا تارہ بن گئی تھی۔

چند روز سے چودھری صاحب کچھ پریشان نظر آ رہے تھے مگر کسی کو ان سے وجہ پوچھنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر ایک دن بڑی چودھرانی نے ہمت کر کے سوال کر ہی دیا۔ "خیر تو ہے، کچھ دن سے آپ چپ چپ سے ہیں۔ زمینوں پر بھی کم ہی جاتے ہیں۔ خدانخواستہ طبیعت خراب ہو تو حکیم صاحب کو بلوا لیں۔" خلاف توقع چودھری صاحب نے غصے کے بجائے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کچھ دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں وڈی۔" انہوں نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

"جی؟ بتائیں نا کیا بات ہے، خیری صلاسب ٹھیک تو ہے نا؟" وڈی کا سینہ احساس تفاخر سے پھول سا گیا۔ شکر ہے اس کے سر کے سائیں نے آج اسے اس قابل تو سمجھا کہ اس سے دل کی بات کر لیں۔

"میں سوچ رہا ہوں جوان بیوہ کو کب تک گھر میں یونہی بلاوجہ، بے مقصد بٹھائے رکھیں گے۔ دنیا والوں کو باتیں کرنے کا موقع ملے گا، خواہ مخواہ......"

"جی صدقے جاواں..... بالکل ٹھیک بات کی ہے نا.....میں تو خود یہی سوچتی رہتی

ہوں۔" وڈی کے دل کی تو جیسے کلی کھل گئی۔

"مگر اب زہرہ ہمارے گھر کا حصہ بن چکی ہے اسے اس گھر سے علیحدہ تو نہیں کیا جا سکتا تا۔"

وڈی کی آنکھوں میں چمکنے والی امید کی کرن پھیکی پڑنے لگی۔ چھوٹی چودھرانی بھی وڈی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہیں پر آ گئی۔

"میں ایک فیصلے پہ پہنچا ہوں۔"

"کیسا فیصلہ جی؟" دونوں چودھرانیاں ہونقوں کی طرح بولیں۔

"زہرہ کی شادی نذیر سے کر دیتے ہیں۔" چودھری صاحب نے کمرے میں بم گرا دیا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"وڈی کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔" "نذیر پتر سے؟" چھوٹی نے کچھ نہ سمجھ آنے والے انداز میں سوال کیا۔

"ہاں بھئی اپنے نذیر سے آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کیا خرابی ہے اس بات میں؟ گھر کی لڑکی ہے۔ دیکھی بھالی ہے۔ بیوہ بھابیوں سے شادیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اس میں ایسی کون سی عجیب بات ہے۔ خاندان کی عزت کی خاطر بڑے گھروں میں بہت کچھ ہوتا ہے۔" چودھری صاحب نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"مگر۔" وڈی سن سی ہو کر بولی۔

"زہرہ ہمارے گھر کا فرد ہے مجھے اس کی فکر رہتی ہے۔ آخر اس کا کچھ بندوبست بھی کرنا ہے یا نہیں؟" چودھری صاحب کو جلال آ گیا اور وہ زور زور سے گرجنے لگے۔ دونوں سہم گئیں۔ نوکر خوف سے لرزنے لگے۔ نہ جانے کونسی قیامت آنے والی تھی۔ نذیر نے سنا تو اس کا تو جیسے خون ہی رگوں میں جم گیا۔ وہ تو بچپن سے اپنی خالہ زاد آمنہ سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا مگر اباجی کے فیصلے کے آگے اس میں بولنے کی جرأت نہ تھی۔ اباجی حاکم طبیعت ہونے کے ساتھ ساتھ گاؤں کی بیشتر اراضی، کنوؤں، باغات کے مالک بھی تھے جو انگریز انہیں اپنی وفاداری کے عوض عطا کر چکے تھے۔

"یہ ظلم ہے مجھ پر وڈی بے بے، چھوٹی بے بے۔" وہ دونوں ماؤں کی گود میں سر رکھ کر خوب رویا اور تڑپا۔ ابھی تو وہ آگے پڑھنا چاہتا تھا مگر ابا جی نے اس کے خوابوں کے سارے محل چکنا چور کر دیے تھے۔ زہرہ اچھی تھی۔ اس نے بھائی کی دل و جان سے خدمت کی تھی مگر اس نے کبھی اس کے بارے میں اس انداز سے سوچا نہ تھا۔ ویسے بھی وہ ابا جی کی بہت لاڈلی اور سر چڑھی تھی۔ حالات کا کچھ کچھ اندازہ اسے بھی ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی زہرہ کے بارے میں سوچتا اسے عجیب سی بے چینی اور بے کلی ہونے لگتی تھی۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور اب وہی زہرہ اس کی زندگی کی ساتھی بنائی جا رہی تھی۔

"وڈی بے بے، چھوٹی بے بے آپ کو تو پتہ ہی ہے، اب میں امینہ سے کیا کہوں گا..... وہ بے چاری تو....." نذیر نے فریادی نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا بیٹا، تیرے ابا جی نے فیصلہ کر لیا ہے۔ صبر کر۔" چھوٹی نے سر پہ پیار دیا۔ "تجھے پتہ ہے ان کا فیصلہ پکا ہوتا ہے۔"

"میں گھر سے بھاگ جاؤں گا..... پھر آپ لوگوں کو کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بھاگ جائے گا؟ بھاگ کر کہاں جائے گا..... میں تجھے زمین کی گہرائیوں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ خبردار جو تو نے زیادہ بکواس کی اس بارے میں۔"

چودھری سلطان جو نہ جانے کب سے بیٹے کی آہ و بکا سن رہے تھے، حق اٹھا کر اندر آ کر بولے تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو آنکھوں ہی میں خشک ہو گئے۔

"پرسوں بعد از نماز ظہر تیرا نکاح ہے۔ اپنے دوست یاروں کو بتا دو اگر کسی کو بتانا یا بلانا ہے۔" ابا جی نے اطلاع دی۔

"پرسوں۔" دونوں چودھرانیاں اور نذیر بیک زبان بولے۔

"ہاں پرسوں۔ نیک کام میں دیر کیا؟..... او بیوقوف بیوہ سے شادی کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے خوش رہے گا۔ جنت کمائے گا جنت۔"

ابا جی نے بیٹے کو راہ ہدایت پر چلنے کی فضیلت کا احساس دلایا۔

نذیر بھی اپنی بات کا پکا نکلا۔ شادی کے روز ڈھونڈے نہ ملا مگر چودھری سلطان اس کے

بھی باپ تھے..... اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔ وہ کہیں دور نہیں خالہ ہی کے گھر چھپا ہوا تھا۔ ابا جی کے آدمی اسے باقاعدہ باندھ کر اٹھا لائے اور چودھری صاحب کے سامنے لا پٹخا۔

"نذیر اس گھر میں تو ہی ہماری رونق ہے۔ تیری بہن شمیم تو خیر سے کل کو اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ پیچھے رہ جائیں گی تیری دو بڈھی مائیں جو تجھے دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ ہم پر رحم کھا۔ ہمیں چھوڑ کے کبھی نہ جانا۔" دونوں ماؤں نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے استدعا کی۔ نذیر کی گمشدگی سے ان کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔

"گھر سے بھاگ کر تو کہاں جائے گا۔ میری اس ساری جائیداد کا وارث بھی تو تو ہی ہے۔ پتر عقل کر والدین کی فرمانبردار اولاد ہی دنیا میں کچھ پاتی ہے یاد رکھنا۔" ابا جی نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ نذیر خاموش ہو گیا اور پھر اس کے بعد سے زیادہ وقت خاموش ہی رہنے لگا۔

زہرہ بڑی فرمانبردار ثابت ہوئی۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا اور سسرال کی خواہشات کے مطابق دلہن بن کر نذیر کے کمرے میں بیوی بن کر رہنے چلی آئی۔ حویلی میں ایک عرصے بعد خوشی آئی تھی۔ چودھری صاحب نے دل کھول کر غریبوں میں خیرات کی۔ پستے باداموں کی بوریوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ پلاؤ زردے کی دیگیں اتریں تو سب نے کھایا پیا، ڈھول پیٹے۔

شہر سے ناچنے اور گانے والیاں بلوائی گئیں جو کالے توے کی مشین پہ ناچنے کے علاوہ خود بھی بہت سر میں گاتی تھیں شادیانے بجے، مٹھائیاں بٹیں، خوب ہنگامہ ہوا۔

نذیر نے کلیجے پہ سل رکھ کر زہرہ کو قبول تو کر لیا تھا مگر وہ اسے نہ جانے کیوں اپنی اپنی نہ لگتی تھی۔ زہرہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ اس کے کھانے پینے اور دیگر ضروری کام بخوبی سر انجام دیتی مگر ابا جی کے لئے بھی اس کے دل میں انتھک خدمت کا جذبہ حسب سابق برقرار تھا۔ ابا جی نے اب اس کے لیے ایک استانی بھی لگوا دی تھی جو اسے گھر آ کر انگریزی اور حساب پڑھانے لگی تھی۔ "بھئی میرے پڑھے لکھے بیٹے کے ساتھ تو پڑھی لکھی بیوی ہی جچتی ہے نا۔" ابا جی نے مسکرا کر اپنی دونوں بیویوں کو کہا جس پر ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھا اور اٹھ کر باہر صحن میں چلی آئیں۔

''اِن کا بس چلے تو اسے فراک پہنا کر میم بنا کر انگریز افسروں سے ملنے ملانے بھی ساتھ لے جائیں۔'' بڑی نے جل کر کہا۔

''ہاں وڈی بتاؤں ایک دن کیا ہوا؟ میم صاحب پچھلے صحن میں کھڑی چودھری صاحب سے کہہ رہی تھی میں نے سائیکل چلانا سیکھنا ہے تو چودھری صاحب ہنس کر بولے'' نہ زہرہ ایسی حرکت نہ کرنا، گر گئی تو چوٹ آ جائے گی۔'' لو بھلا بتاؤ یہ نہ کہا کہ زہرہ سائیکل چلانا عورتوں کا کام نہیں ہے۔ کیا پتہ بابا یہ کسی دن سائیکل بھی چلا لے..... چودھری صاحب نے سر جو اتنا چڑھا رکھا ہے۔ توبہ توبہ وڈی نے اپنے کانوں پہ ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

زہرہ نے سائیکل تو نہ چلائی مگر شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد ایک خوبصورت گول مٹول سے بچے کو جنم ضرور دے دیا۔ ساری حویلی میں زندگی کی اک نئی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ سب خوش تھے کہ گھر میں اتنی پیاری سی رونق آ گئی ہے۔ چودھری صاحب نے پہلے کی طرح ایک بار پھر حویلی میں زور شور سے محفلیں کیں، جشن منائے۔ دونوں چودھرانیوں کو انہوں نے ایک عرصے بعد اپنی توجہ سے نوازا اور نئے جوڑے، گہنے منگوا کر دیئے۔ سبھی خوش تھے سوائے نذیر کے۔ اس نے تو بچے کو ٹھیک سے آنکھ بھر کر دیکھا تک نہیں تھا۔ بجھے بجھے سے اداس نذیر کو حویلی کے کونوں کھدروں میں بیٹھا دیکھ کر اس کی ماں کا کلیجہ کٹ کے رہ جاتا۔ نہ جانے کن بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا تھا اس کا ذہن؟ نہ جانے کس تذبذب کا شکار رہتا تھا وہ؟ نہ جانے کب اور کیسے سکون نصیب ہوگا میرے بیٹے کو۔ ماں دل ہی دل میں سوچ کر خدا سے اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگ جاتی۔

چودھری صاحب ننھے جمیل کی پیدائش کے بعد گھر میں کافی وقت دینے لگے تھے۔ وہ کاکے کے لئے شہر سے مہنگے مہنگے کھلونے منگواتے، کپڑے سلواتے اور اس کے مستقبل کے منصوبے بناتے تو زہرہ بہت خوش ہوتی۔

نذیر کو ایک دن نہ جانے کیا سوجھی کہ چودھری صاحب سے اجازت لئے بغیر ہی شہر کے کسی کالج میں جا کر داخلہ لے آیا۔ چودھری صاحب نے سنا تو اسے روکا بھی نہیں اور خاموش ہو رہے۔ اب نذیر نے اپنی زندگی کچھ کچھ اپنی مرضی سے گزارنا شروع کر دی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت شہر میں گزارتا اور چھٹی کے دن گاؤں آ جاتا مگر آ کر بھی اپنی کتابوں سے ہی مغز ماری کرتا رہتا۔ گھر

میں سب سے الگ تھلگ رہتا۔ اس نے اپنا شب خوابی کا کمرہ بھی زہرہ سے الگ کر لیا تھا۔ وڈی اور چھوٹی بے بے اسے گم صم، خاموش دیکھتیں تو ان کا دل کٹنے لگتا۔ وہ کچھ کر بھی نہ سکتی تھیں۔ اس کے دکھ کا مداوا ان کے پاس نہ تھا۔

کاکا جمیل ابھی پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ چودھری نذیر اچانک ایک روز گھر سے غائب ہو گیا۔ نہ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ چند مہینوں کی گمشدگی کے بعد ادھر ادھر سے کچھ خبریں ملنے لگیں۔ کوئی کہتا انگریز پلٹن گاؤں آئی تھی تو بہت سے نوجوانوں کے ساتھ نذیر کو بھی بھرتی کر کے اپنے ساتھ لام پہ لے گئی ہے۔ کوئی کہتا اس نے پرانی بیری والی کنوئیں میں کود کر جان دے دی ہے۔

چودھری صاحب کو بیٹے کے یوں لاپتہ ہو جانے کا بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر سب بے سود۔ کاکے جمیل کی پرورش اور دیکھ بھال میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی اور اس کے پیارے سے وجود سے اپنا دل بہلائے رکھنے لگے۔

''دیکھ پتر جمیل، اپنی جائیداد دور دور تک اللہ کا فضل ہے ہمارے اوپر۔'' وہ کاکے کو تانگے میں بٹھا کر زمینوں کی سیر کرواتے ہوئے فخر سے بتاتے تو کاکا حیرانگی سے ان کی طرف دیکھنے لگتا۔ اسے سمجھ میں نہ آتا کہ وڈے ابا جی کیا کہہ رہے ہیں؟ ہری ہری گھاس، درختوں کے جھنڈ، گہرے کنوؤں کو دیکھ کر اتنے خوش ہونے والی کون سی بات ہے۔

''نذیر پتر بہت یاد آتا ہے۔ اس کا غم مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔'' ایک روز وہ نذیر کی ماں کے آگے کمزور پڑ گئے۔

''نہ میرے سوہنے پتر کی زبردستی شادی کرتے نہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر جاتا۔'' وڈی چودھرانی نے بھی حوصلہ کر کے چودھری صاحب کے آگے زبان کھول دی۔ خلاف توقع وہ آگے سے ایک لفظ نہ بولے نہ چیخے۔ ان کی آنکھیں نم ہوتی دیکھ کر چودھرانی آگے بڑھ کر ان کا کندھا تھپتھپانے لگی۔

''بندوں سے ہی ہی گھر میں رونق ہوتی ہے چودھری صاحب۔ شمیم دھی بھی خیر سے اب اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ حویلی کے ہی ایک حصے میں ہی رہتی ہے مگر ہے تو اب اپنے گھر والی۔ کل کو اس کے بھی بچے ہو جائیں گے اور وہ مصروف ہو جائے گی۔ آپ اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں، ہم دونوں کیا کریں؟

چودھری صاحب نے نظریں اٹھا کر چودھرانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ ہمیں اپنی خدمت کا بھی موقع نہیں دیتے، زہرہ کو چاہئے اب آپ کی خیر سے فکر چھوڑ دے اور اپنے کاکے میں دھیان لگائے۔ ہم جو ہیں۔ خیر سے آپ کی دو بیویاں ہیں اسے آپ کے کام کاج کرنے کی تکلیف نہیں کرنی چاہئے۔'' چودھرانی نے دبے لفظوں دل کی بات چودھری صاحب کے گوش گزار کر دی۔

''نذیر پتر کوئی خط پتر بھیج کر اپنی خیریت کی اطلاع ہی دے دیتا۔'' چودھری صاحب نے وڈی چودھرانی کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اللہ میرے پتر کو سکھی رکھے۔ جہاں رہے خوش رہے۔'' ماں نے آہ بھر کے دعا دی۔

چودھری صاحب کا دل و دماغ کسی گہری سوچ اور کسی خیال میں پھنسا نظر آتا تھا۔ وہ کسی الجھن میں گرفتار، کسی دھیان میں گم سارا دن کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ کئی بار تو ان کا سانس بھی رک جاتا۔ گھر والے پریشان تھے کہ انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک روز گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھا اور گر گئے تو ان کا داماد گاؤں کے سب سے قابل حکیم صاحب کو بلا لایا۔

حکیم قادر بخش کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے آ کر چودھری صاحب کا ہر طرح سے مکمل معائنہ کیا اور یہ پریشان کن خبر سنا کر سب کو فکر مند کر دیا کہ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے اور بلڈ پریشر بھی خطرناک حدوں کو چھو رہا ہے۔

''آپ لوگ ان کا بہت زیادہ خیال رکھیں کسی قسم کا صدمہ یا اچانک خوشی ان کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔'' حکیم نے ضروری ہدایات کے ساتھ گھر والوں کو چودھری صاحب کی صحت کے بارے میں سنجیدگی سے تلقین کی۔ ''انہیں ہلکی غذا دیں اور چہل قدمی کروائیں..... انشاء اللہ رب خیر کرے گا۔''

دونوں چودھرانیاں اپنے بیمار شوہر کے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔ زہرہ بھی گھونگھٹ کاڑھے دل و جان سے ان کی خدمت میں جت گئی مگر نہ جانے کیوں چودھری صاحب کچھ دل چھوڑ سا گئے تھے۔ اداس پریشان لیٹے خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ کاکا جمیل اپنی توتلی زبان میں معصومیت سے باتیں کرتا تو چودھری صاحب کا صحت یاب ہو جانے اور جی اٹھنے کو جی چاہنے لگتا مگر پھر خیال آتا ''پتہ نہیں میں جمیل کو بڑا ہوتے دیکھ بھی پاؤں گا یا نہیں؟'' چودھری صاحب کی

آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تو دونوں چودھرانیاں اور زہرہ پریشان ہو جاتی۔

ایک روز ان پر فالج کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ وہ بالکل ہی بستر سے جا لگے۔ رب نواز بھاگ دوڑ کر کے ایک انگریز ڈاکٹر کو بھی شہر سے بلوا لایا جس نے انہیں دیکھ کر کوئی خاص امید افزا باتیں نہیں کیں اور چند انگریزی دوائیں دے کر چلتا بنا۔

چودھری سلطان کا موٹا تازہ تندرست جثہ بستر پہ پڑا پڑا گھلنے لگا۔ ان کی خوبصورت موٹی موٹی آنکھیں جن کی غیر معمولی چمک سے مدمقابل نفسیاتی طور پر مرعوب ہو کر دبک جایا کرتے تھے، بے جا اور بے رونق نظر آنے لگیں۔ منہ ایک طرف کو ٹیڑھا ہو گیا جن کی وجہ سے ان کی پرکشش شکل ذرا ذرا لگنے لگی۔ گھنگھریالے لچھے دار بال سیدھی سیدھی لٹوں کی شکل میں تکیے پر بکھرے رہنے لگے تھے۔ گھر کی سب عورتیں گھر کے رعب و دبدبے والے سربراہ کو اس حالت میں دیکھ کر بے حد افسردہ تھیں۔ زہرہ بھی جب ان کو ایسے دیکھتی تو اس کا کلیجہ کٹ کے رہ جاتا۔ وہ تو اس کے مائی باپ، والی وارث رہے تھے۔ انہوں نے اس کا رتبہ کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا تھا۔ اسے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ اتنے مضبوط، باحیثیت، طنطنے والے شخص کی بے بسی اور بے وقعتی دیکھ کر وہ بھی آزردہ رہنے لگی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ چودھری سلطان دنیا کے سب بکھیڑے چھوڑ کر اپنی بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹے بغیر قبر کی گود میں جا سمائے اور گھر کی عورتیں ماتم کرتی رہ گئیں۔

زہرہ جوان، سمجھدار کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ چودھری صاحب کی زندگی سے ہی اس نے ان کی زمینوں، جائیدادوں کے کام میں ہاتھ بٹایا تھا اس لئے اب اس نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور چھوٹی چودھرانی ہونے کے باوجود بڑی چودھرانیوں جیسی سمجھی جانے لگی۔ کوئی کمی کمین، منشی مزارع اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرتا اور ہر بات کے لئے پہلے زہرہ سے اجازت لی جاتی۔ وہ آہستہ آہستہ چودھری صاحب کی جگہ لیتی جا رہی تھی۔

بڑی دونوں چودھرانیاں ان پڑھ اور زیادہ عمر کی تھیں۔ چودھری صاحب نے ان میں کوئی سوجھ بوجھ پیدا بھی نہ ہونے دی تھی لہٰذا وہ کبھی خودمختار اور بااختیار نہ بن سکی تھیں۔ ان کا رتبہ زہرہ سے اب بھی کم ہی رہا تھا' وہ کبھی زہرہ کے برابر نہ آ سکیں۔ پھر ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا اور چاروں طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔

چودھری صاحب کے گاؤں راجن پور میں پھر بھی نسبتاً خیریت رہی۔ وہ چونکہ پنجاب کے پاکستان والے حصے میں آیا تھا اس لئے زیادہ لوگوں کو وہاں سے ہجرت نہ کرنی پڑی تھی۔ حویلی کے مکین کافی حد تک محفوظ رہے۔ اس کٹھن وقت میں زہرہ نے مردوں کی طرح سارے گھر کی حفاظت کی اور بوڑھی چودھرانیوں اور ننھے جمیل کے حوصلے بڑھاتی رہی۔

ملک بٹ جانے کے تقریباً دو سال بعد نہ جانے کہاں سے ڈاکیہ ایک خط لے کر آیا جو نذیر نے اپنی ماں کو لکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ جنگ میں کئی محاذوں پر انگریزوں کے ساتھ لڑتا رہا تھا اور اب بالآخر انگلستان میں ہی بس گیا تھا۔ اس نے گاؤں کے کسی بیلی سے جو انگلستان میں مزدوری کرتے ملا تھا، سن لیا تھا کہ بڑے چودھری صاحب گزر چکے ہیں اور باقی سب لوگ حویلی میں ہی ہیں۔ آپ دونوں مائیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کا دل دکھایا ہے اور آپ کی کوئی خدمت بھی نہیں کی مگر میں مجبور ہوں میرا اس حویلی میں رہنا ناممکن ہو چکا تھا اس لئے میں آپ سب کو چھوڑ آیا۔" خط کو ہزار بار پڑھنے کے باوجود دونوں ماؤں کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور وہ دونوں نیلے کاغذ کے ٹکڑے کو بار بار چومے جا رہی تھیں۔ کم از کم وہ زندہ تو تھا۔ دونوں چودھرانیوں نے خوشی سے ایک دوسرے کو لپٹا لیا۔ زہرہ نے سنا تو لپک کر خط پکڑ لیا اور سارا پڑھنے کے بعد تنگ کر بولی۔ "مبارک ہو آپ لوگوں کو، مجھے کیا؟ میرے اور جمیل کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔"

"کیا ہوا بے بے کس کا خط ہے؟" نئے نئے جوان ہونے والے جمیل نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پتر تیرے ابا کا خط آیا ہے ولایت سے!" دادی نے چودہ پندرہ سالہ جمیل کو دیکھ کر خوشی سے بتایا۔

"میرا ابا؟ پر آپ لوگ تو کہتے ہیں وہ جنگ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔" جمیل نے ان کی سنائی ہوئی کہانی دہرائی۔ اسے تو ابے کی شکل بھی کوئی خاص یاد نہیں تھی۔

"پتر اب تیرے ابے کا پتہ مل گیا ہے۔ اب تو اسے خود خط لکھ کر بلا لے کہہ دے کہ وہ ہمارے پاس واپس آ جائے۔" چھوٹی دادی نے اسے پیار سے سینے سے لگا کر کہا۔

"ابا۔ پتہ؟" زہرہ نے ناگواری سے ناک سکیڑا۔ اتنے برسوں سے اکیلی مردوں کی

طرح زندگی گزار لینے کے بعد اب اسے کسی بھی مرد کا اس کی زندگی میں وجود یا خیال اور ذکر کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

بڑی اور چھوٹی چودھرانی نے نذیر کو کئی خط لکھے، جمیل سے بھی لکھوائے مگر نذیر نے ایک آدھ خط کے بعد ان سے رابطہ بحال نہ رکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔

سال گزرتے رہے۔ نذیر کا دو تین برس بعد کہیں سے ایک آدھ خط آ جاتا تو وہ لوگ جواب دے دیتے اور پھر حسب سابق اس کی طرف سے خاموشی چھا جاتی۔ اس کے آنے کی راہ تکتے تکتے اس کی وڈی اور چھوٹی دونوں مائیں دنیا سے رخصت ہو گئیں اور پیچھے حویلی میں زہرہ، جمیل اور مائی اللہ رکھی رہ گئیں۔

تقسیم کے بعد بھی کے حالات میں تبدیلی آئی تھی۔ مرحوم چودھری سلطان کی زمینوں، جائیدادوں اور باغات کی بھی نئے سرے سے جانچ پڑتال ہوئی اور تخمینے لگائے گئے جس کے نتیجے میں ان کا بہت سا حصہ سرحد پار آئے ہوئے مہاجروں کو کلیم میں دے دیا گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چودھری صاحب کی جائیدادیں تو نذیر اور جمیل کے حصے میں آتی ہیں؟ یہ سرکار بیچ میں کہاں سے آ گئی؟'' زہرہ نے اپنے وکیل صاحب سے فیصلہ سنا تو سکتے میں آ گئی اور تقدیر کے اس ستم پر کئی دن خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس کا حوصلہ ٹوٹ سا گیا۔ اس نے پہلی بار زندگی سے شکست کھانے کا کڑوا ذائقہ چکھا تھا۔ زمینیں اس کی بہت بڑی طاقت تھیں۔ ان کے چھن جانے سے اس کی تو ہمت ہی جواب دے گئی۔ اب ہر وقت ایک مستقل اداسی اس کے چہرے سے چپکی رہتی جس کی وجہ سے حویلی کے بچے کھچے مکین سہمے اور پریشان نظر آتے تھے۔

''بھابی آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟ آپ کے پاس حویلی ہے، خیر سے سر پہ چھت ہے، ٹھکانہ ہے اور پھر سب کچھ تو نہیں چلا گیا۔ سب سے قیمتی چیز آپ کا بیٹا جمیل چتر تو ہے نا آپ کے پاس۔'' اس کی نند شمیم اور اس کے شوہر نے اس کو پیار سے تسلیاں دیں مگر زہرہ تو جیسے حواس ہی کھو بیٹھی تھی۔ بہکی بہکی باتیں اور بات بات پر جھگڑا کرنے لگی۔ جمیل بھی ماں کی حالت دیکھ کر پریشان رہنے لگا۔

''چل ماں میں تجھے شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھالاؤں تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بس تو خوش رہا کر اور کسی بات کی فکر نہ کیا کر۔'' اس نے ماں کو پیار سے کہا۔

''نہ نہ مجھے اس حویلی سے کہیں باہر لے جانے کی بات یا کوشش نہ کرنا میں یہاں سے کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔ سنا تم نے؟ مجھے یہیں سکون ملتا ہے۔ چھوڑ دو میری جان۔'' اس نے بیٹے کو غصے سے جھاڑ دیا۔

''تو اماں پھر تو پریشان رہنا چھوڑ دے۔ ورنہ دیکھ میں شہر چلا جاؤں گا اور پھر تو مجھے یاد کرتی رہ جائے گی۔'' اس نے ماں کو دھمکی دی۔

''جہاں جانا ہے چلا جا۔ اب تیرے لئے اس گاؤں میں رہ بھی کیا گیا ہے؟ سب کچھ تو چھن گیا ہم سے۔'' خلاف توقع وہ اس کی دھمکی سے خوفزدہ یا فکرمند نہیں ہوئی۔ جمیل نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو احساس تفاخر سے اس کا دل بھر آیا۔ ''کتنی مضبوط عورت ہے میری ماں۔'' اس نے سوچا، کتنے صدمے جھیلے، اکیلے پن کا سامنا کیا اور ڈٹی رہی۔ تمام عمر طوفانوں کے تھپیڑوں سے لڑتی رہی مگر اب شاید تھک گئی ہے۔ زندگی سے بہادرانہ مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی شاید اس میں۔ وہ اپنے اور ماں کی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ماں کے علاوہ اس کا تھا ہی کون۔ اسے اپنی ماں پہ بے طرح پیار آنے لگا۔

''بے بے تو فکر نہ کر، میں بھی ابا جی کی طرح ولایت جاؤں گا۔ ڈاکٹری پڑھ کے آؤں گا، خوب پیسے کماؤں گا۔ ایک دن تجھے پھر سے گاؤں کی بہت بڑی چودھرانی بنادوں گا۔ تو فکر نہ کر میری اچھی بے بے۔'' اس نے ماں کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے۔

''چل ہٹ پتر کیسی جھلوں والی باتیں کر رہا ہے۔ تجھے کیا پڑی ہے گھر بار چھوڑ کے پردیس کی خاک چھاننے کی۔ پہلے جو گیا ہے وہ کون سا واپس آ گیا ہے؟'' پھوپھو شمیم نے جمیل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں ابا جی کو بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ پھوپھو جی۔ آپ دیکھتی رہنا۔''

''ڈھونڈ نکالے گا، اس کا کچھ اتہ پتہ ملے گا تو ہی ڈھونڈ نکالے گا نا۔'' شمیم نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وقت بدل رہا تھا۔ لوگوں کے سامنے نئی راہیں کھل رہی تھیں۔ جمیل نے اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق لندن کے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا اور بے بے کو بتانے کے لئے دل میں حوصلہ جمع کرنے لگا۔

"بے بے میں ولایت جارہا ہوں ڈاکٹری پڑھنے۔"

"کیا؟ کیا کہا؟ تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟" زہرہ غم و غصے سے چلانے لگی۔ "ایک دم اچانک یہ فیصلہ کیوں کرلیا تو نے؟"

"بے بے کتنے دنوں سے تو تجھے بتا رہا ہوں تو سن ہی نہیں رہی۔"

"تو نے مجھے کب بتایا ہے؟ میں نے تو نہیں سنا۔ آج ہی سن رہی ہوں پہلی بار!" زہرہ ڈانٹ کر بولی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جارہی تھیں۔

"بتایا تھا چھوٹی چودھرانی جی۔ آپ کو شاید یاد نہیں رہا۔" ماسی اللہ رکھی نے پیار سے زہرہ کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔

"پتر جمیل۔ آج کل ان کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر بات بڑی جلدی بھولنے لگی ہیں۔"

"ہاں ماسی میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ بے بے کی یادداشت کچھ خراب رہنے لگی ہے تم ان کا زیادہ خیال رکھا کرنا ماسی۔" اس نے ماسی کی طرف دیکھ کر پیار سے درخواست کی۔

"واپس کب آئے گا؟" زہرہ جیسے خواب سے یکدم جاگ گئی۔

"پانچ سال بعد آؤں گا.....ڈاکٹری میں لمبا پڑھنا پڑتا ہے نا۔ چٹکیوں میں گزر جائیں گے یہ پانچ سال۔ تو بس فکر نہ کرنا۔

جمیل اپنی بے بے کو پھوپھو شمیم اور ماسی اللہ رکھی کی نگرانی میں چھوڑ کر ایسا گیا کہ پھر نذیر کی طرح برسوں نہیں لوٹا۔ خطوں میں لکھتا کہ بحری جہاز کا سفر اتنا مشکل اور مہنگا ہے کہ میں پڑھائی چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ پڑھائی ختم کر کے ایک ہی بار لوٹوں گا اور پھر کبھی اپنی بے بے کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ وہ یہ بھی لکھتا کہ وہ اپنے باپ کی کھوج نکالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر اسے ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

زہرہ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ نذیر کہاں ہے اور کیوں جمیل سے ڈھونڈا نہیں جارہا۔ اسے تو صرف اپنے بیٹے کی پروا تھی جس کی یاد میں وہ دیوانی ہوئی جارہی تھی۔

اس کا مرض بتدریج گہرا اور ناقابل علاج ہوتا جارہا تھا۔ اسے دن مہینے سال بھولتے جارہے تھے۔ اسے تو اب یہ خبر بھی نہ رہی تھی کہ جمیل کو گئے ہوئے ساتواں سال شروع ہو چکا ہے اور اب وہ اس کی منتظر بھی نہ رہی تھی۔

"میں نے جمیل پتر کو خط لکھوا دیا ہے کہ خیر سے آپ واپس آ گئے ہیں۔ بس اب وہ بھی جلدی گھر آ جائے اور آ کر اپنی ماں کو سنبھالے۔ اس گھر کو مکمل کرے۔" ایک دن شمیم نے مسکراتے ہوئے اپنے بھائی کو بتایا۔

"اچھا؟ خط آتے رہتے ہیں اس کے؟" نذیر نے مریل سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا؟ وہ کوئی آپ کی طرح تھوڑا ہی ہے جو ہم لوگوں سے رابطہ ہی نہ رکھے۔ خیر سے بڑا محنتی، ذمہ دار بچہ ہے۔ بے چارہ بدنصیب..... افسوس..... باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں جیسی زندگی گزاری وی۔" شمیم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"باپ۔" نذیر نے زیرلب یہ لفظ دہرایا اور دہراتا چلا گیا۔ بے اختیار اس کی نظر آرام کرسی پہ بیٹھی ہوئی زہرہ پہ پڑی جو ہر نفس کی موجودگی سے بے نیاز چھت میں پڑے چھوٹے سوراخ میں سے کبوتروں اور چڑیوں کو اندر آتے جاتے، پھڑ پھڑاتے دیکھ رہی تھی۔

شمیم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور کچھ سوچ کر بولی۔

"ویر جی اب تم آ گئے ہو تو سارے معاملات سنبھالنے کی سوچو، ہم سے اب اور محنت نہیں ہوتی۔ حویلی بھی مرمت کرواؤ۔ یہ بھی تو پرانی ہو رہی ہے ہم سب کی طرح۔"

"پتر شمیم۔ ایک بات کہوں..... آج کل روز صبح ایک کوا بنیرے پہ آ کر بیٹھتا ہے اور کائیں کائیں کرتا ہے۔ روٹی کھا کے بھی نہیں اڑتا۔ لگتا ہے کوئی پروہنا آنے والا ہے۔" ماسی اللہ رکھی لسی بلوتے ہوئے شمیم سے بولی۔

"لے ماسی کیسی باتیں کرتی ہے تو بھی! کوا کیا کوئی تار لایا ہے کہ کوئی آ رہا ہے؟" شمیم ہنس دی۔

"لے پتر..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ..... میں نے تو اوپر والا کمرہ صاف بھی کروانا شروع کر دیا ہے۔" ماسی مسکرا کے لسی گلاس میں انڈیلنے لگی۔

"ماسی، اس کا نہ کوئی خط پتر آیا..... نہ تار..... خواہ مخواہ امیدیں نہ لگا۔" شمیم لسی کا گلاس تھامتے ہوئے بولی۔

"بے چاری ماں کو کچھ خبر نہیں۔ یہ بھی نہیں یاد کہ اس کا کاکا اس سے اتنی دور گیا ہوا ہے۔ بھیڑی بدنصیب۔" شمیم نے ٹھنڈی سانس بھری اور زہرہ کی طرف دیکھنے لگی جو دنیا و مافیہا

سے بے خبر، اپنی ہی سوچوں میں گم نہ جانے کس دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ اسے اب کسی کوے، کسی گدھ یا کسی فاختہ کے اپنی زندگی میں ہونے یا نہ ہونے کا پتہ نہ تھا۔ وہ ہر خیال سے آزاد، ہر شخص سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ وہ ایک مٹی کا تودہ تھی جسے اپنی ہستی یا نیستی سے کوئی غرض نہ تھی۔ نسیاں کے مرض نے اس پہ بہت مہربانی کی تھی جو اسے ہر دکھ سے رہائی دلوا دی تھی۔

سردیوں کی دھوپ حویلی میں بہت شان سے اندر آتی تھی۔ کبھی وہ کیاریوں میں کھلے سرخ گلابوں کے غنچوں سے چھیڑ خانی کرتی تو کبھی کھڑکیوں میں ٹنگی خوبصورت چقوں سے تاک جھانک کرتی۔ سارا آنگن اجلا اجلا اور چمکیلا لگنے لگتا۔

چودھری صاحب کے وسیع کشادہ کمرے میں بھی دھوپ بے تکلفی سے اندر آتی تھی اس روز زہرہ حسب معمول نہا کر اپنی آرام کرسی پہ بیٹھی دھوپ سینکتی چھت والے سوراخ میں سے چڑیوں کا پھڑ پھڑا کر اندر آنا جانا دیکھ رہی تھی کہ نذیر اس کے قریب چلا آیا۔

''زہرہ.....زہرہ.....!'' نذیر نے اسے دو تین بار پکارا مگر زہرہ نے جواب دینا تو درکنار نذیر کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔

''کیا کر رہے ہو ویر جی؟ یہ کہاں بات کا جواب دے گی۔ آپ کو پتہ تو ہے۔'' اسی لمحے شمیم نے بھائی کو دیکھ کر کہا۔

''میں کاپیاں رجسٹر دیکھ رہا تھا۔ مجھے راجن پور والے دو کنوؤں کے بارے میں کچھ نہیں مل رہا۔'' نذیر نے بہن سے کہا۔

''اسے کون سی ہوش ہے بھائی۔ وکیل صاحب ہیں نا اپنے حسین منظور..... انہی سے بات کرو..... ابا جی انہیں ہر چیز سمجھا گئے تھے اور زہرہ بھی جب تک ہوشمند تھی انہی سے صلاح مشورہ کیا کرتی تھی۔''

شمیم کا جواب سن کر نذیر خاموش ہو گیا اور زہرہ کی طرف دیکھنے لگا جو اب کھڑی ہو کر کھڑکی میں سے باہر کھلی ہوئے تازہ، خوش نما ہریالی کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم کسی تانگے کے رکنے کی آواز آئی اور ایسا لگا جیسے کوئی اس میں سے اتر کر سامان اتروا رہا ہو۔

''یہ صبح صبح بھلا کون آ گیا ہے؟'' شمیم نذیر کی طرف دیکھ کر بولی اور کمرے کی سیڑھیاں اتر کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف چل دی۔ ٹکٹکی لگائے کھڑی زہرہ نے یکدم ایک دلدوز چیخ

کے ساتھ کھڑکی میں سے لٹک کر باہر جھانک کر دیکھا اور پھر دیوانہ وار شیم کی طرف بھاگی اور اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ہیں؟ یہ اسے کیا ہوا ہے؟" نذیر حیرت سے بولا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ زہرہ دروازے کی طرف کیوں بھاگی جا رہی ہے۔ یہ مردہ کیسے جی اٹھا ہے؟"

"السلام علیکم۔" نذیر کو کسی کی مردانہ آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام میرے بچے۔ میں صدقے جاواں..... ہمارا پتر جمیل خیر سے گھر آ گیا ہے۔" نذیر کے کانوں میں شیم اور ماسی اللہ رکھی کی خوشی بھری آوازیں آنے لگیں۔

"جمیل۔" نذیر کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اس کا سامنا میں کیسے کروں گا۔ میں نے تو اسے بھی ڈھنگ سے دیکھا تک نہیں۔"

"کتنا جوان، سوہنا ہو گیا ہے، کتنا بدل گیا ہے....." پھوپھو بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

نذیر نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔ زہرہ سکتے کے عالم میں کھڑی جمیل کو دیکھتی چلی جا رہی تھی جس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ وہ نذیر کی آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھا۔

زہرہ دو قدم آگے بڑھی مگر جمیل کو گلے لگانے کے بجائے بجائے اس کے آگے عجیب طرح سے لجا کر کھڑی ہو گئی اور فوراً آدھے چہرے پر گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ نذیر تڑپ کے دروازے سے نکلا اور نو وارد کو بھرپور انداز سے دیکھنے لگا۔ پل بھر کے لئے تو لہو اس کی رگوں میں جم سا گیا۔ اسے لگا وقت یکایک بہت سال پیچھے چلا گیا ہے۔ جوان جہان ابا جی سوٹڈ بوٹڈ، انگریزی حلیے میں کھڑے مسکرا مسکرا کر سب کو گلے لگا رہے تھے۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں، وہی سلونا رنگ، گھونگھریالے بال، ٹھوڑی پہ تل اور رعب دار شخصیت۔ نذیر سرپٹ بھاگ کر ابا جی کے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا سانس بے طرح پھول رہا تھا۔ ابا جی کی قد آدم تصویر اس کے سامنے کھڑی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ پہ اس نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چھت کے سوراخ میں سے ایک بڑی سی چمگادڑ اندر داخل ہو کر کمرے میں گول گول چکر لگانے لگی تھی۔ اس کی گھمن گھیریاں دیکھ کر نذیر کو چکر سا آ گیا۔

▼▲▼▲▼▲▼

ہماری نیلم

میری پیاری بیٹی نیلم نے بچپن سے لے کر آج تک اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹایا۔ بڑی ہونے کی وجہ سے چھوٹے بہن بھائی کو بہت سنبھالا، ان کو پڑھانا، جگا کر سکول بھیجنا اس کا کام تھا حالانکہ وہ خود بچی تھی مگر اس کے اندر ذمہ داری کا بہت جذبہ تھا۔ دل کی نرم موم کی طرح مگر اپنی بات کی پکی۔ بہت ذہین بچپن میں نظمیں لکھیں اب بڑی ہو کر افسانوں کی کتابیں لکھیں بہت اچھے افسانے لکھتی ہیں۔ خدا اس کو خوشیاں دے۔ اپنے ابا کی تحریروں کو اکٹھا کر کے ہر وقت ان کو چھاپنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے باپ کی عاشق ہے۔ ان کی طرح سچا اور صاف دل ہے۔ خدا اس کو سلامت رکھے۔

امی مسز احمد بشیر

میری باجی

اپنی باجی کے بارے میں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس پائے کی ادیبہ ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی ادب میں دلچسپی رکھنے والے لوگ بستے ہیں وہ سب میری باجی کی ذہانت اور چونکا دینے والی تحریروں کے دیوانے ہیں۔ یہ تو تھیں ان کی قابلیت کے بارے میں کچھ باتیں لیکن اب کچھ باتیں ان کی ذات کے حوالے سے بھی کرلی جائیں تو اچھا ہوگا۔ نیلم بشیر ذاتی طور پر ایک نہایت سادہ، سچے اور بھولے دل کی مالک ہے۔ وہ اپنی بہنوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہے۔ وہ ہر وقت ہم بہنوں کو Protect کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ اسے یہی فکر لگی رہتی ہے کہ بس میری بہنیں ٹھیک رہیں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو ان کی زندگی میں کبھی کوئی پریشانی نہ آئے۔ آخر میں میں یہی کہوں گی کہ باجی اگر آپ نہ ہوتی تو "ہم بہنیں کیا کرتیں"

We are Proud of you and love you.

میری باجی بہن کم ماں ہے جیسے صوفہ کم بیڈ۔

سنبل شاہد

نیلم احمد بشیر... ایک افسانہ نگار
ایک اصول پسند عورت

اپنی بہن کے بارے میں تو ہر کوئی اچھا ہی سوچتا ہے مگر میری یہ بہن واقعی کچھ خاص ہے۔ ایسی بہن جس میں ماں اور بہن دونوں ہی موجود ہیں۔ بچپن کے ہر مشکل مرحلے میں نیلم باجی نے مجھے ماں کی طرح گائیڈ کیا۔ بحیثیت افسانہ نگار بے حد حساس اور خوبصورت بنت کے ساتھ کہانی کو بیان کرنا، اپنی اور معاشرے کی کہانی کو یوں لکھنا کہ وہ آپ کی اپنی کہانی بن جائے اور آپ اسے خود سے قریب تر محسوس کریں۔ یہ نیلم کا ہی خاصہ ہے لفظ وہ جو آپ کے اپنے ہوں، جملہ وہ جو آپ کے دل کی آواز ہو یعنی آپ پڑھتے جائیں تو آپ کی اپنی روح سے ملاقات ہو جاتی ہے، کہانیاں تو سب کی وہی ہوتی ہیں مگر ان کو دیکھنے کا زاویہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔

پھر اس زاویے کو آپ خود سے کتنا قریب محسوس کرتے ہیں۔ میری باجی کی تحریریں پڑھ کر دیکھئے۔

بشریٰ انصاری

ماں باجی

میرا نام اسماء ہے، نیلم احمد بشیر کی سب سے چھوٹی بہن.....ان کی شاید سب سے پیاری بہن (کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں)

باجی پیار کا سمندر ہے اور اسی طرح گہری بھی.....ذہین اور فطین اتنی کہ ان سے بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ ہم کچھ غلط نہ کہہ دیں۔ بچپن سے ہی ان کے لئے ایک خاص قسم کے جذبات ہیں میرے، ماں جیسی یا شاید ماں سے بڑھ کر۔ بہت زیادہ بچپن تو مجھے یاد نہیں مگر جب ہوش سنبھالا تو باجی کو ہی سامنے دیکھا۔ کھلاتے، پلاتے، نہلاتے اور پڑھاتے ہوئے..... ہماری فکر کرتے ہوئے..... مجھے برے سکول سے اچھے سکول میں ڈالا.....ٹیسٹ ڈلوانے گئی، حساب میں فیل ہونے پر مجھے گلے سے لگا کے پیار کیا، میں نہانے میں چور تھی اور ویسے بھی اس زمانے میں ہم جس گھر کے اوپر والے پورشن میں رہتے تھے وہاں پانی کم آتا تھا اور باجی کو لالچ تھا کہ میں دو دن بعد تو کم از کم نہالوں۔ مگر میں بھاگ جاتی تھی پھر باجی پیٹھ پر زور سے چپت لگاتی اور مجھے زبردستی نہلا دیتی۔ آج بھی آنکھیں بند کروں تو اپنے جسم پر باجی کے پیارے پیارے ہاتھ اور ہلکے ہلکے ناخن چبھتے محسوس ہوتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے دھنیا، ادرک سخت ناپسند تھے مگر باجی کے ہاتھ میں نہ جانے کیا سواد تھا کہ باجی ادرک، لہسن، کالی مرچ، دھنیا شوربے میں بھگو کر روٹی کا نوالہ جب منہ میں ڈالتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی جنت کی Dish ہو اور آج تک زندگی میں ویسا مزا نہ آیا.....

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

میری باجی سے ابا کی خوشبو آتی ہے۔ ابا کی تصویر جیسی وہ..... ویسی ہی پچی کڑوی پیار اور مخلصی سے بھری ہوئی۔

سنجیدہ اتنی کہ کوفت ہونے لگتی ہے۔ لکھاری اتنی زبردست کہ کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہر کہانی حقیقت کے قریب، جھوٹ تو کہانی میں بھی نہیں بولتی.....

ابھی قریباً دو سال قبل میں نے ایک ٹی وی چینل پر کام شروع کیا۔ مجھے میرے پہلے ہی پروگرام پر بہت داد ملی مگر میرے دل میں ڈر تھا کہ پتہ نہیں باجی کیا کہیں.....اور باجی کا SMS مجھے آیا کہ "I am Proud of U" یہ SMS میری زندگی کا سب سے بڑا تحفہ تھا۔ میری پہلی کامیابی پر باجی کو خدا ہمیشہ ہمارے لئے اسی طرح ہنستا مسکراتا اور بہادر رکھے۔ اپنے دل میں ہزاروں Problems لئے وہ مسکراتی ہے۔ جانتی ہے کہ وہ ہنستی رہے گی تو سب ہنسیں گے روئے گی تو.....کوئی نہیں روئے گا ساتھ.....میری باجی کو خدا کبھی بھی کوئی تکلیف نہ دے.....اور اگر خدا نہ کرے کبھی زندگی میں میری ضرورت ہو تو باجی مجھے سب سے پہلے بتانا، میں سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں گی۔

My baji is Great.

نیلم احمد بشیر اب اپنے کام میں خوب منجھ گئی ہیں۔ رواں لکھتی ہیں۔ زبان و بیان ان سے دغا نہیں کر پاتے۔ اور انہوں نے اس گر کو بھی خوب سمجھا ہے کہ کہانی کو بہر حال کہانی ہونا چاہئے۔ مسئلے کہانی میں جو بھی در پیش ہیں مگر ریڑھ کی ہڈی تو کہانی ہے۔ نیلم کی کہانیوں میں ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ انسانی معاملات کے نشیب و فراز کو وہ خوب سمجھتی ہیں اور فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی مختلف کہانیوں میں آج کے انسانی معاملات و مسائل کو خوبی سے پیش کیا ہے۔ بلکہ آج کے بعض حساس مسائل پر بھی قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے اور بہت فنکارانہ چابکدستی سے انہیں بیان کیا ہے۔ یہی تو وہ مقامات ہیں جہاں لکھنے والے کا امتحان ہوتا ہے۔ اکثر لکھنے والے کا بھرم جلدی کھل جاتا ہے۔ نیلم اس امتحان سے کامیاب گذری ہیں۔ نازک مقامات کو خوب نباہتی ہیں۔

اپنے ملک سے نکل کر انہوں نے دیارِ غیر میں بھی تو وقت گزارا ہے۔ سو مغربی معاشروں کا جو حوالہ ہے اور جو سماجی مسائل وہاں در پیش ہیں ان سے بھی شناسا ہیں۔ پھر ہمارے روایتی معاشرے میں پلے بڑھے، مرد، عورتیں وہاں پہنچتے ہیں تو ان پر کیا گذرتی ہے۔ اس بیچ ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے نقشے بھی ان کی کہانی میں نظر آتے ہیں۔

یہ سب باتیں مل کر ان کی کہانی کو ایک نئی رونق بخشتی ہیں۔

انتظار حسین

Rs. 350.00

www.sang-e-meel.com